اسفارِ اقبال

عنایت علی

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

حکومتِ پاکستان، قومی ورثہ وثقافت ڈویژن

چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

Tel: [+92-42] 36314510, 99203573

Fax: [+92-42] 36314496

Email: info@iap.gov.pk

Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-560-8

طبع اوّل	:	۲۰۱۶ء (قرطاس، فیصل آباد)
طبع دوم	:	۲۰۱۷ء (قرطاس، فیصل آباد)
طبع سوم	:	۲۰۲۱ء (اقبال اکادمی پاکستان)
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	-/۹۹۰ روپے
مطبع	:	فریدیہ آرٹ پریس انٹرنیشنل، لاہور

محل فروخت: ۱۱۶- میکلوڈ روڈ، لاہور، فون نمبر ۳۷۳۵۷۲۱۴

انتساب

اپنے والدین کے نام

جن کی دعائیں ہمیشہ شاملِ حال رہیں

اپنی بیگم کے نام

جنھوں نے مجھے ہمیشہ گھریلو معاملات میں آسُودہ رکھا

اور اپنے دوست عبدالستار نعیم کے نام

جن کے فیضِ صحبت سے جادۂ علم پہ گامزن ہُوا۔

فہرست مضامین

باب نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	۱۳
	دیباچہ	۱۷
	تقریظ	۱۹
	حرفِ تحسین	۲۳
	پیش لفظ طبع سوم	۲۹
	تقریظ طبع سوم	۳۳
باب:۱	**چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے**	۳۹
	لاہور سے دہلی کے لیے روانگی	۴۱
	بمبئی میں قیام	۴۳
	انگلستان روانگی اور بحری سفر کی رُوداد	۴۵
	کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ اور تعلیمی مراحل	۵۰
	ٹرنٹی میں اقبال کی شبیہہ	۵۹
	کیمبرج میں علمی مذاکرہ	۶۱
	قیامِ یورپ کے دو اہم واقعات	۶۲
	بُدھ مذہب کی وضاحت	۶۵
	میونخ یونیورسٹی میں داخلہ	۶۶
	ہائیڈل برگ میں قیام اور پکنک پارٹی	۶۷
	تقریروں کا سلسلہ	۷۰

باب نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
	عیسائی مبلّغ	۷۲
	انگلستان سے واپسی	۷۳
	دہلی آمد	۷۴
	لاہور میں استقبال	۷۵
	سیالکوٹ آمد	۷۶
	علی گڑھ کی پیشکش	۷۷
	لاہور واپسی	۷۷
باب:۲	**محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (امرتسر) میں شرکت**	۷۹
	فوجی، زمینداری اور مردم شماری کا مسئلہ	۸۵
باب:۳	**حیدر آباد دکن کا سفر**	۹۱
	اورنگ زیب عالمگیر کی قبر پہ حاضری	۹۵
	لاہور واپسی	۹۸
باب:۴	**محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (دہلی) میں شرکت**	۱۰۱
باب:۵	**کانپور اور دہلی کا سفر**	۱۰۵
	ڈاکٹر اقبال دہلی میں	۱۰۶
باب:۶	**کشمیر جنت نظیر کا سفر**	۱۰۷
باب:۷	**امرتسر کا سفر**	۱۱۵
باب:۸	**سفرِ جنوبی ہند**	۱۱۷
	پس منظر	۱۱۷
	علامہ سیّد سلیمان ندوی سے مراسلت	۱۱۹
	خطبات کے موضوعات	۱۲۴
	لاہور سے روانگی	۱۲۵
	مدراس آمد	۱۲۶
	خطباتِ مدراس	۱۲۷

باب نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
	انجمنِ خواتینِ اسلام مدراس سے خطاب	۱۳۰
	مدراس سے بنگلور آمد	۱۳۴
	بنگلور اور میسُور میں مصروفیات	۱۳۵
	ٹیپو سلطان کے مزار پہ حاضری	۱۳۶
	سرنگا پٹم کی سیاحت	۱۳۹
	میسور میں مصروفیات	۱۴۰
	میسور میں محمود بنگلوری سے ملاقات	۱۴۱
	بنگلور سے حیدر آباد کے لیے روانگی	۱۴۲
	حیدر آباد میں مصروفیات	۱۴۳
	نظام حیدر آباد سے ملاقات	۱۴۴
باب:۹	**مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے دعوتِ خطاب**	۱۴۷
	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے سپاس نامہ کا جواب	۱۵۱
	خطبات کی تدوین اور اہمیت	۱۵۳
باب:۱۰	**خطبۂ الٰہ آباد**	۱۵۷
	الٰہ آباد آمد	۱۵۸
	خطبۂ الٰہ آباد	۱۶۰
	خطبۂ الٰہ آباد کے اختتامی کلمات	۱۶۲
	خطبۂ الٰہ آباد پہ عمومی رائے اور لاہور واپسی	۱۶۴
	ہند میں مسلم ہند	۱۶۶
	ہندو اور انگریز کا واویلا	۱۶۷
	مُسلم پریس کی تحسین	۱۶۹
باب:۱۱	**دوسری گول میز کانفرنس اور سفرِ یورپ**	۱۷۳
	بیگم کے نام وصیّتی خط	۱۷۳
	لاہور سے روانگی	۱۷۵

صفحہ نمبر	عنوانات	باب نمبر
۱۷۶	دہلی آمد	
۱۷۷	بمبئی آمد اور مصروفیات	
۱۸۰	بمبئی سے روانگی اور بحری سفر کی رُوداد	
۱۸۴	لندن آمد اور مصروفیات	
۱۸۹	گول میز کانفرنس کی رُوداد	
۱۹۱	کشمیر کی صورتِ حال پر بات چیت	
۱۹۷	لندن میں دیگر اہلِ علم سے ملاقاتیں	
۲۰۲	لندن میں الوداعی خطاب	
۲۰۴	لندن سے روم کے لیے روانگی	
۲۰۴	روم میں مصروفیات	
۲۰۶	شاہ امان اللہ سے ملاقات	
۲۰۷	رائل اکادمی اٹلی میں لیکچر	
۲۰۸	مسولینی سے ملاقات	
۲۱۲	نیپلز آمد	
۲۱۳	مصر آمد اور مصروفیات	
۲۱۴	سید ابوالعزائم اور دیگر اہلِ علم سے ملاقاتیں	
۲۱۶	قاہرہ کی سیاحت اور جامعہ ازہر میں حاضری	
۲۱۸	سفرِ فلسطین	
۲۲۹	وطن واپسی	
۲۳۰	سفرِ فلسطین اور گول میز کانفرنس پہ اخباری بیان	
۲۳۲	روضۂ رسولؐ پہ حاضری کی آرزُو	
۲۳۳	**سفرِ شملہ بغرض امدادِ مسلمانانِ الور**	**باب:۱۲**
۲۳۷	**مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت**	**باب:۱۳**

باب نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
باب:۱۴	**تیسری گول میز کانفرنس اور سفرِ یورپ**	۲۴۱
	بمبئی آمد	۲۴۱
	یورپ روانگی	۲۴۲
	پیرس میں قیام	۲۴۳
	نپولین کے مزار پر	۲۴۴
	میسی نون سے ملاقات	۲۴۴
	لندن میں قیام	۲۴۵
	جان برائٹ کی تجویز	۲۴۶
	نیشنل لیگ کی تقریب	۲۴۷
	واپسی کا پروگرام	۲۴۹
	پیرس آمد اور برگسان سے ملاقات	۲۴۹
	ہسپانیہ آمد اور اہلِ علم سے خطاب	۲۵۱
	قرطبہ میں مسلم طرزِ تعمیر	۲۵۳
	مسجدِ قرطبہ کی زیارت	۲۵۶
	سپین میں مسلم تمدّن	۲۵۸
	مراجعتِ وطن	۲۵۸
	سفرِ سپین پر انٹرویو	۲۵۸
	لاہور آمد	۲۶۱
	جمعیت الاسلام کا سپاسنامہ	۲۶۱
باب:۱۵	**جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کا سفر**	۲۶۳
باب:۱۶	**افغان باقی، کُہسار باقی**	۲۶۹
	امیر امان اللہ کی فتوحات اور مُلک بدری	۲۷۰
	افغانستان میں نادر شاہ کی فرمانروائی	۲۷۱
	حکومتِ افغانستان کی تعلیمی اصلاحات کے لیے دعوت	۲۷۳

باب نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
	مُلّا شور بازار سے ملاقات	۲۷۸
	برِصغیر کے مسلمانوں کا استقبالیہ	۲۷۹
	نادرشاہ سے ملاقات	۲۸۰
	رائل اکادمی کا عشائیہ	۲۸۱
	ظہیرالدین بابر کے مقبرہ پہ حاضری	۲۸۴
	نادرشاہ سے الوداعی ملاقات	۲۸۶
	غزنیں کے لیے روانگی	۲۸۶
	حکیم سنائی کے مزار کی زیارت	۲۸۸
	سلطان محمود غزنوی کے مزار کی زیارت	۲۹۰
	حضرت علی ہجویری کے والدین کے مزار پہ حاضری	۲۹۱
	قندھار آمد	۲۹۲
	خرقہ شریف کی زیارت	۲۹۳
	احمد شاہ ابدالی کے مزار پہ حاضری	۲۹۳
	اقبال، افغان عوام کے دلوں میں	۲۹۴
	وطن واپسی	۲۹۴
	سفرِ افغانستان پہ اخباری بیان	۲۹۶
باب:۱۷	**حضرت مجدّد الف ثانی کے مزار پر حاضری**	۲۹۷
باب:۱۸	**دارالاقبال- بھوپال**	۳۰۳
	بھوپال کی اہمیت	۳۰۳
	مسلم رہنماؤں کی کانفرنس	۳۰۶
	بغرضِ علاج بھوپال آمد	۳۰۸
	ریاض منزل میں قیام	۳۱۰
	نواب بھوپال سے ملاقات	۳۱۲
	بھوپال میں مسلم آبادی کی تجویز	۳۱۳

صفحہ نمبر	عنوانات	باب نمبر
۳۱۴	نواب بھوپال کی مراسلت	
۳۱۵	تاحیات پنشن کا اجراء	
۳۱۷	شیش محل میں قیام	
۳۲۰	نواب بھوپال اور اقبال کا ایک دوسرے کو خراجِ تحسین	
۳۲۲	بھوپال میں معالجینِ اقبال	
۳۲۶	بھوپال میں یادگارِ اقبال	
۳۲۹	**مولانا حالی کے صد سالہ جشنِ ولادت میں شرکت**	**باب:۱۹**
۳۳۳	**سفرِ آخرت**	**باب:۲۰**
۳۳۴	علالت کی ابتداء	
۳۳۷	زندگی کے آخری لمحات	
۳۴۰	علامہ کی تجہیز و تکفین	
۳۴۲	مزارِ اقبال	
۳۴۴	ملکی و غیر ملکی مشاہیر کا خراجِ عقیدت	
۳۴۹	**کتابیات**	

☆☆☆

پیش لفظ

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ملّتِ اسلامیہ کے اُفق پر ابھرنے والے ستاروں میں علامہ اقبال ایک درخشندہ اور تابندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال نہ صرف برّصغیر بلکہ ملّتِ اسلامیہ اور اپنے ہم عصر تمام فلسفیوں، مفکّرین اور مدبّرین میں چندے آفتاب، مانندِ ماہتاب نظر آتے ہیں۔ اقبال کے افکار معاشی، عسکری، زرعی، صنعتی، سیاسی، مذہبی، قومی و بین الاقوامی، سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ، مزدور، سوشلزم/ کیمونزم، سیکولرزم اور دہریت غرض تمام معاملات کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی نثر اور شاعری میں بلا امتیازِ رنگ ونسل، مرد وزن، بچوں، بوڑھوں، جوانوں سب سے مخاطب ہیں۔ اُن کے افکار، اُن کی ذاتی زندگی، شاعرانہ کلام پہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ اُن کی زندگی اور کلام کے بہت سے خفیہ گوشے آشکار ہورہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ محبّانِ اقبال مختلف زاویوں سے اپنے اپنے انداز میں اُن کے پیغام، افکار اور حالات و واقعات کو دنیا کے سامنے لا رہے ہیں۔

علامہ کے ہم نشینوں اور ہم جلیسوں کا کہنا ہے کہ آپ سفر سے گریزاں رہتے تھے۔ بنیادی طور پر آپ بہت تن آسان، سہل پسند اور گھر میں مقیّد رہنے والے انسان تھے۔ اِس کے علاوہ اگر وہ محفل میں ہوتے تو باہمہ بھی ہوتے اور بے ہمہ بھی۔ یعنی سب کے ساتھ بھی اور سب سے الگ بھی۔ ہوسکتا ہے لوگ کسی بات سے محظوظ ہورہے ہوں لیکن اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوں۔ اچھا لباس پہن کر گھر سے سیر وتفریح کے لیے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ بغرضِ ملاقات یا وقت گزاری کے لیے جانا اُن کا معمول نہیں تھا۔ بہت دفعہ ایسا ہوا کہ احباب کے ساتھ باہر جانے کا پروگرام بنا، وقت طے پایا، جن سے وعدہ تھا وہ بھی آ گئے۔ کپڑے بدلنے میں

سُستی ہوتی رہی، پھر کہہ دیا اب دوپہر ہوگئی ہے اس قدر گرمی میں کون کپڑے بدلے اور باہر جائے، اب کل چلیں گے اور پھر بعض دفعہ یہ پروگرام ہی منسوخ ہو جاتا۔ وکالت کے سلسلہ میں کچہری اور بسلسلۂ ملازمت کالج میں جانے کے لیے پینٹ کوٹ، نکٹائی زیبِ تن کی ہوتی، گھر آتے ہی فوراً علی بخش کو اپنا لباس (تہبند، دُھسا، چادر، بنیان وغیرہ) لانے کا کہتے اور انگریزی لباس اُتار پھینکتے۔ اُن کے دوست غلام بھیک نیرنگ لکھتے ہیں کہ ''مَیں ایک دفعہ انبالہ سے محرّم کی تعطیلات میں اقبال سے ملنے لاہور آیا دن کے وقت اُن کے گھر پہنچا (اقبال اُس وقت اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے یورپ سے آئے تھے) تو نوکروں نے بتایا کہ وُہ باہر گھومنے پھرنے گئے ہیں۔ کہتے ہیں مَیں نے کہا خدا کا شکر ہے، اقبال نے بھی گھر سے نکلنا سیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وُہ آئے تو مَیں نے دیکھا کہ نہایت نستعلیق سُوٹ پہنے ہُوئے ہیں۔ مَیں نے دُوسرا شکر ادا کیا کہ اقبال نے لباس پہننا سیکھا (اس سے پیشتر وہ لباس کے معاملہ میں صرف سادہ ہی نہیں لاپرواہ بھی تھے) خیر گلے مِلے، مزاج پُرسی ہوئی، اس کے بعد وُہ سوٹ اتر گیا، وہی ہمیشہ کا تہبند بندھ گیا، وہی بنیان بدن پر رہ گیا، وہی کمبل شانوں پر سوار ہو گیا، ہم نفس (حُقّہ) حاضر ہو گیا۔ مَیں اور اقبال پہلے کی طرح فرش پر بیٹھ گئے، دنیا بھر کی باتیں چھڑ گئیں اور ہوتی رہیں میرے قیام کے تین دن اسی ہیّت کذائی سے گزر گئے، کہاں اقبال، کہاں گھر سے نکلنا اور کیسا سوٹ، یورپ ہو آئے، دماغ کو گوناگوں فضائلِ علمی سے آراستہ کر لائے، سینے کو طرح طرح کی امنگوں اور آرزوؤں سے بھر لائے، مگر رندی اور قلندری میں فرق نہ آیا، تین روز کی شبانہ روز صحبت کے بعد مَیں رخصت ہو کر انبالے چلا گیا''۔

یوں معلوم ہوتا ہے اقبال کی اس سہل پسندی کی شہرت پورے برصغیر میں پھیل گئی تھی کیونکہ سیّد امجد علی کہتے ہیں (یہ تیسری گول میز کانفرنس میں اقبال کے ساتھ سیکرٹری کی حیثیت سے برطانیہ گئے تھے) کہ بحری جہاز پہ برطانیہ جانے والوں میں ہمارے ہمسفر ایک نامور ہندو طبیب سرسی۔ دی۔ رامن بھی تھے۔ دورانِ گفتگو وُہ اپنے یورپ کے متعدد سفروں، وہاں کے بلند پایہ ادیبوں اور سائنسدانوں کا حال بیان کرتے رہے۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور (جنہیں اس وقت نوبل انعام مل چکا تھا) کا ذکر آیا تو کہنے لگے وہ رہتا مشرق میں ہے اور اُس کی شہرت مغرب تک پہنچ چکی ہے۔ ویسے بھی ٹیگور کا مغرب میں بہت آنا جانا رہتا ہے۔ آپ کے اقبال

بھی اگر اس طرح سفر کرتے رہیں تو انہیں بھی یہ انعام مل سکتا ہے۔ سیّد امجد علی کہتے ہیں مَیں نے ڈاکٹر صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ تو وُہ مسکرائے اور کہا۔

"Tagore practices action and preaches rest, whereas Iqbal preaches action and practices rest"

چنانچہ ایسے معمولاتِ زندگی رکھنے والی ہستی اگر گھر سے طویل سفر کے لیے نکلتی تھی تو یقیناً کوئی بہت اہم معاملات درپیش ہوتے تھے۔ ان میں حصولِ علم کے علاوہ زیادہ تر مسلمانانِ ہند کے سیاسی مسائل کے حل سے متعلق اجلاس، ملتِ اسلامیہ کے اتحاد اور احیائے ملی کی کانفرنسیں، غرناطہ میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا مشاہدہ، مشہور فلسفیوں برگساں/ میسی نون سے ملاقات، الٰہ آباد میں مسلم لیگ کا جلسہ، مدراس/ علی گڑھ میں خصوصی خطبات ہوں یا بغرضِ علاج بھوپال جانا ہو، زیرِ نظر کتاب میں اِن اسفار کا احاطہ کیا گیا ہے زمانی ترتیب سے ان موضوعات کو یکجا کیا گیا ہے اور علامہ اقبال کو جس ضرورت سے سفر کرنا پڑا، اُن کے ہمسفر، دوست، احباب، اہلِ علم سے ملاقاتیں، لیکچرز، مختلف تنظیموں اور اداروں کی دعوت وغیرہ کا بھی اس میں تذکرہ موجود ہے۔

اِس کے علاوہ ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک اُردو، فارسی، فلسفہ، انگریزی، تاریخ، عربی اور قانون وغیرہ کے زبانی امتحان کے لیے ممتحن یا ممتحن اعلیٰ کی حیثیت سے لاہور سے باہر علی گڑھ، الٰہ آباد، ناگ پور، بیت العلوم حیدر آباد یا شملہ (بغرض پیروئ مقدمات) کبھی کبھار جانا ہوتا تھا۔ یہ سفر بہت مختصر اور زیادہ تر ذاتی ضرورت سے ہوتے تھے سو اِن کی تفصیل دستیاب نہیں ہوسکی۔ اِس لیے اِنہیں شامل نہیں کیا گیا۔ سیالکوٹ (والدین) لدھیانہ (سسرال)، کیمل پور اور کوئٹہ (بڑے بھائی) کے سفر بغرضِ ملاقات (نجی اور خاندانی ضرورت کے تحت ہونے کی وجہ سے) شامل نہیں کیے گئے۔ اسی طرح ۲۳/نومبر ۱۹۲۹ء کو اقبال علی گڑھ گئے جہاں انھوں نے اپنے اعزاز میں ہونے والی انٹرمیڈیٹ کالج یونین کی طرف سے اعزازی ممبر شپ ملنے کی تقریب میں شرکت کی۔ اس کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی، اس لیے اسے بھی شامل نہیں کیا گیا۔

یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ اقبال کا پہلا غیر ملکی سفر (۱۹۰۵ء۔۱۹۰۸ء) برائے انگلستان اور جرمنی حصولِ تعلیم کے لیے تھا تو اُن کا آخری غیر ملکی سفر (۱۹۳۳ء) برائے افغانستان بھی تعلیم کی ترقی اور ترویج کے لیے تھا۔

سب سے آخر میں سفرِ آخرت کو شامل کیا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو کرنا ہے اور کوئی شخص خوشی سے نہیں کرتا مگر اقبال اس کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور خصوصاً آخری دو سالوں میں وُہ کہا کرتے تھے۔ مَیں موت سے نہیں ڈرتا کہ:

نشانِ مردِ مومن باتُو گویم
چُو مرگ آید تبسّم برلبِ اُوست

اتنی بڑی شخصیّت کی زندگی کا ایک ایک لمحہ، اٹھنا‘ بیٹھنا، سونا ، جاگنا لوگوں سے میل ملاقات وغیرہ یقیناً ہمارے لیے بہت سی حکمتیں اور اسباق رکھتا ہے مگر ان سب کا ذکر کرنا بہت مشکل بھی ہے اور میرے جیسے کم فہم کے لیے ناممکن بھی۔ اس سلسلے میں یقیناً مزید بہتری کی گنجائش رہے گی۔ آپ کی طرف سے مشورے اور تبصرے اس کتاب کے آئندہ ایڈیشن کی اصلاح میں بہت مدد و معاون ہوں گے۔ مَیں اس کتاب کی تحریک کے لیے اپنے احباب مظہر عالم ،محمد خان نیازی اور عتیق الرحمٰن کا ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی پر مَیں نے بھی پیغامِ اقبال کو عام کرنے میں ایک معمولی سا کردار ادا کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ضمن میں مَیں جناب عبدالستار نعیم اور پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا خصوصی ممنون ہُوں جنھوں نے مُسَوّدہ کو نہ صرف پڑھا بلکہ اپنی بیش قیمت آراء سے نوازا جس سے اس کتاب میں مزید بہتری آئی۔ مَیں اپنے اسسٹنٹ ملک ثناءاللہ کُندی اور غلام مصطفٰے انجم کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے انتہائی محنت سے مسوّدہ کو ترتیب دینے میں میری مدد فرمائی۔

عنایت علی

۱۲ / ربیع الاول ۱۴۳۷ھ

۲۴ / دسمبر ۲۰۱۵ء

☆☆☆

دیباچہ

انسانی زندگی میں سفر، ہمیشہ ایک قیمتی تجربہ رہا ہے۔ سفر، مسافر کے ذہنی افق کو وسیع کرتا اور اس کی معلومات میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ وہ انسان کو تحرک عطا کر کے اسے مستعد اور فعال بناتا ہے۔ مزید برآں وہ مسافر کو دورانِ سفر پیش آمدہ مشکلات کا سامنا کرنے اور مسائل حل کرنے کی راہیں بھی سُجھاتا ہے۔ سفر کے انھی اور دیگر گوناگوں فوائد کی وجہ سے ''سیروافی الارض'' کا حکم دیا گیا۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاحوں کی فہرست میں مسلم سیاحوں (ابن جبیر، ابن بطوطہ، شیخ سعدی شیرازی وغیرہ) کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔

علامہ اقبال، بظاہر مسلم سیاحت کی اس روایت میں شامل نہیں۔ کیونکہ اُن کا زیادہ تر وقت گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے تفکّر و تدّبر میں گزرتا تھا، مگر سوانحِ اقبال کے اوراق سے پتا چلتا ہے کہ جب بھی سفر کی ضرورت پیش آتی، وہ بلا تامّل سفر کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ ان کی اکسٹھ سالہ زندگی کے شب و روز کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے نہ صرف اندرونِ ملک بارہا سفر کیے بلکہ حتی المقدور بیرونِ ملک بھی بہت سے ممالک کی سیاحت کی جن میں انگلستان، فرانس، ہسپانیہ، اٹلی، مصر، فلسطین اور افغانستان شامل ہیں۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ علامہ اقبال کے زمانے میں سفر کی ویسی سہولتیں میسّر نہ تھیں جیسی آسانیاں اور راحتیں ہمیں آج کل حاصل ہیں۔

برادرم محترم عنایت علی، علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر کے معتقد اور اقبالیات کے ایک پُر شوق طالب علم ہیں، ''طالب علم'' ان معنوں میں کہ حصولِ علم کی سچی لگن رکھنے والا، عمر بھر طالب العلم ہی رہتا ہے، ورنہ عنایت صاحب نے ایک تجربہ کار انجینئر کی حیثیت سے برسوں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے منصوبوں میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر خدمات انجام دیں اور اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے پیغام اور فکر کی نشر و اشاعت اور فروغِ اقبالیات

کو بھی، مقاصدِ زندگی میں شامل کررکھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بحیثیت صدر مجلسِ اقبال چشمہ نہ صرف اپنے رفقااور دوست احباب میں بلکہ اپنی بستی کی نئی نسل (طلبہ و طالبات) کے اندر بھی اقبالیات سے دلچسپی اور ذوق پیدا کردیا ہے۔ اب اُنھوں نے ''اسفارِ اقبال'' کے نام سے زیر نظر کتاب بھی مرتب کرڈالی ہے۔ یہ کتاب درحقیقت اقبال سے عنایت علی کی عقیدت اور دل چسپی کی ایک بہت عمدہ دستاویز بلکہ دستاویزی ثبوت ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا، پیشے کے اعتبار سے جناب عنایت علی انجینئر ہیں۔ آرٹس کے طالب علموں اور اساتذہ کا اقبالیات کی طرف اِعتنا، کچھ ایسا باعثِ تعجب نہیں مگر سائنس دانوں اور انجینئروں کا اقبال کی شاعری، اُن کی زندگی اور شخصیت کے مطالعے کی طرف مائل وملتفت ہونا، ایک خوش گوار اور خوش آئند عمل ہے۔

اقبالیاتی ادب کم ازکم دس دائروں میں منقسم ہے: تصانیفِ اقبال، تراجمِ اقبال، حوالہ جاتی کتب، سوانحی کتب، نقد وتحقیق وغیرہ۔ سوانحی کتب کے ذیل میں محمد حمزہ فاروقی صاحب نے کئی برس پہلے ''سفرنامۂ اقبال'' مرتب کیا تھا۔ جوعلامہ کے ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء کے سفرِ انگلستان اور مصر وفلسطین کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اقبال نے سولہ سترہ برس کی عمر سے سیالکوٹ سے لاہور اور واپسی کے سفر کرنا شروع کیے۔ جناب عنایت علی نے علامہ کے دیگر اسفار کے بارے میں تفصیل مہیا کی ہے۔ انھوں نے علامہ کے احوالِ اسفار کو ترتیبِ زمانی میں مرتب کیا ہے۔ اور اس موضوع پر ایک اچھی کتاب تیار کرنے کا یہی طریقہ بہتر تھا۔ انھیں اقبالیات کی سینکڑوں سوانحی کتابوں اور مضامین میں سفرِ اقبال سے متعلق جو معلومات ملیں، انھیں حوالوں کے ساتھ یکجا کردیا ہے۔ اس طرح اسفارِ اقبال کا ایک بہترین مرقع تیار ہوگیا ہے۔ بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس سے قبل اس موضوع پر ایسی تفصیلی اور جامع کتاب نہیں لکھی گئی۔

اسفارِ اقبال کی اس تفصیل سے اِس تأثر کی بھی تردید ہوتی ہے کہ علامہ اقبال ہر وقت گھر میں پڑے رہتے تھے اور انھیں حرکت اور سفر سے نفور تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ قارئینِ اقبالیات، جناب عنایت علی کی اس کاوش کو دل چسپ اور معلومات افزا پائیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (تمغۂ امتیاز)

۱۵/رجب ۱۴۳۷ھ

۲۳/اپریل ۲۰۱۶ء

تقریظ

جناب عنایت علی سے میری شناسائی کا دورانیہ مختصر ضرور ہے مگر احساس یوں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو فکری اور نظری اعتبار سے شروع ہی سے جانتے ہیں۔ علامہ اقبال سے بے پناہ عقیدت اور محبت ہماری قدرِ مشترک تو ٹھہری لیکن موصوف کا جو علم علامہ اقبال کے احوال و واقعاتِ حیات سے ہے، اس کی کم ہی مثال مجھے خاندانِ اقبال سے باہر ملی ہے۔ آپ جزئیات اور حالات و واقعات کی تہہ تک چلے جاتے ہیں۔ علامہ کی شخصیت ان کی نظر میں پورے تحرک اور جامعیت کے ساتھ موجود ہے۔

آپ کی زیرِ نظر کتاب ''اسفارِ اقبال'' کو گہرائی اور تعمق کے ساتھ بار بار پڑھنے کا موقع ملا تو یوں لگا کہ علامہ اقبال کے ہمراہ ہم بھی سفر کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ جنوبی ہند، افغانستان، مشرقِ وسطیٰ، شمالی افریقہ، مغربی یورپ، بحیرۂ روم، بحیرۂ احمر، بحیرۂ عرب اور پھر رود بارِ انگلستان کو عبور کرتے ہوئے جزائر برطانیہ تک ہمیں اقبال کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں وہ حصولِ علم کے لیے رواں دواں ہیں، کہیں بادشاہوں اور حکمرانوں کی دعوت پر مشاورت اور راہنمائی کے لیے سفر کرتے ہیں۔ کہیں برصغیر کے مفلوک الحال مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر سلطنتِ برطانیۂ عظمیٰ کے ایوانوں میں بحث میں شریک ہیں تو کہیں وہ بیت المقدس میں مستقبلِ فلسطین و عرب کی موتمر میں محوِ تکلّم اور غرقِ فکر و تدبیر دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانانِ الور کی دادرسی کے لیے وہ وائسرائے ہند سے ہمکلام ہیں تو کبھی جنوبی ہند میں اپنے تاریخی خطبات کے ذریعے اسلام کی ابدیت کا پیغام نسلِ نو کو دینے میں برسرِ عمل ہیں۔ وہ سیاسی محافل میں بھی نظر آتے ہیں اور الٰہ آباد کے تاریخی خطبہ میں برصغیر کی ملّتِ اسلامیہ کے مستقبل

کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ وہ ہمیں بابر کی گورِ بے سقف کے سامنے بھی دکھائی دیتے ہیں، سلطان ٹیپو اور حکیم سنائی کے مزارات پر تخلیے اور بند دروازے کے ساتھ حاضری دیتے ہوئے ارواحِ جلیلہ سے ہمکلام دکھائی دیتے ہیں یا اورنگ زیب کی قبر اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر محو دعا و فاتحہ دکھائی دیتے ہیں۔ جب آپ مصر میں پہنچتے ہیں تو رمضان بٹ (گوجرنوالہ والے) کی مہمان نوازی سے لے کر جامعۂ ازہر کے اساتذہ کے جھرمٹ اور امام شافعی کے مزار مبارک پر حاضری دیتے ہوئے اہرام کی عظمت کے سامنے افلاک کو نگوں سار دیکھتے ہیں۔

اس کتاب میں آپ کو سپین، انگلستان، مصر، افغانستان اور طول وعرضِ برِصغیر میں اقبال کے خطبات کا پتہ چلتا ہے۔ خصوصاً جب آپ مدراس پہنچتے ہیں تو آپ کے استقبال کے لیے آنے والے لوگ جب ایک اسٹیشن پہلے ہی آپ کو تلاش کرتے ہیں اور آپ ریل کے درجہ دوم میں سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کے خطبات میں حاضرین اور سامعین کا والہانہ پن اور آپ سے اہلِ علم کی عقیدت کی کئی جھلکیاں ہمیں اس کتاب میں نظر آتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے باوجود ہے کہ علامہ خود کو سست طبیعت اور غیر متحرک شخصیت قرار دیتے ہیں جو دوسروں کو تحرک اور سرگرمی کا درس دیتے ہیں اور اپنا موازنہ ٹیگور سے کرتے ہیں جو خود تو ہر وقت ہمہ تن متحرک رہتا ہے اور دوسروں کو جمود کا درس دیتا ہے۔ مگر علامہ اقبال خود سامنے حقہ رکھے گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہیں اور دوسروں کو تحرک کا درس دیتے ہیں۔

مختلف مسافرتوں میں علی بخش کا ساتھ اور حقہ آپ کا خاصہ ہے مگر یورپ کے سفر میں کبھی غلام رسول مہر کی معیت اور کبھی جناب امجد علی کا ساتھ اور سپین کے سفر میں ایک انگریز سیکرٹری کی ہمسفری کے واقعات بھی اس کتاب میں ملتے ہیں۔ پھر ہمیں حیدرآباد دکن کے وزیرِ اعظم راجہ کشن پرشاد، پیرس میں امراؤ سنگھ مجیٹھیہ اور لندن میں محترمہ سروجنی نائیڈو کی مصاحبت کا جہاں ذکر ملتا ہے وہاں بمبئی کے ہوٹل کا مالک وہ بزرگ صورت پارسی بھی دکھائی دیتا ہے جس کے ظاہری تقدس اور وجیہہ شخصیت پر قبل از اسلام کے ایران کے دستور (مذہبی پیشوا) کا گمان ہوتا ہے۔ جو دسترس علامہ اقبال کی زرتشتی علوم اور اہلِ فارس کے علوم پر تھی، اس کے باعث علامہ اقبال اس شخصیت کے روپ میں مجوسیّت کے ایک مذہبی پیشوا کو تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان تمام واقعات کا احاطہ مصنف نے خوبصورت پیرائے میں کیا ہے اور یہ سفر نامہ سے زیادہ لمحہ بہ لمحہ علامہ کی زندگی کے حقائق کا آئینہ دکھائی دیتا ہے۔ انسان کی پہچان اس کے ساتھ سفر کر کے ہوتی ہے اور جب ہم علامہ کے ہمسفر حضرات کی زبان سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلو دیکھتے ہیں تو سبحان اللہ کہتے کہتے زبان سے رحمۃ اللہ علیہ کے کلمات بار بار ادا ہوتے ہیں۔ وہ عظیم شخصیت جو برگسان، میسی نون، آرنلڈ، ضیاء الدین طباطبائی، مفتیٔ اعظم فلسطین، علامہ محمد اسد، نکلسن اور آربری جیسے عظیم علماء اور اسکالرز کی ممدوح ہو اور جس کی عظمت کا تذکرہ بادشاہوں کے درباروں میں ہو۔ بقولِ اقبال

کہاں سے تُو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

(بالِ جبریل)

وہ واقعی ایک ہمہ جہت قائد، مدبّر، حکیم، پیشوا، اور مجدّد کا روپ ہے۔ ایسی شخصیات تاریخ میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں اور بقولِ اقبال

عمر ہا درکعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

(زبورِ عجم)

ترجمہ: (زندگی صدیوں کعبہ اور بتخانہ میں فریاد کرتی ہے تب بزمِ عشق سے کوئی دانائے رَاز نمودار ہوتا ہے۔)

جناب عنایت علی نے یہ کتاب لکھ کر ہمیں اس نابغۂ روزگار شخصیت کی ذات کے کئی پوشیدہ گوشے آشکار کر دیے ہیں۔ یہ علامہ کا فکری اور روحانی سفر بھی ہے اور سیاسی سرگزشت بھی۔ ہر سفر کی بنیاد ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد ہے اور علامہ مقاصد کو کبھی آپس میں گڈ مڈ نہیں ہونے دیتے۔ گول میز کانفرنس سے واپسی پر جب آپ ابھی مشرقِ وسطیٰ میں موجود تھے تو آپ کے برادرِ ارشد جناب شیخ عطا محمد کا مراسلہ ملا کہ آپ موقع پاتے ہی حرمین شریفین کی زیارت سے بھی شرف یاب ہو جائیں تو آپ لکھتے ہیں کہ یہ سفر مَیں انگریز حکومت کے خرچے پر کر رہا ہوں اور سفرِ حجاز کے لیے مناسب ہوگا کہ مَیں اپنی محنت کی کمائی سے زادِ راہ کا بندوبست کروں۔

ان واقعات کا مطالعہ ہم نے مختلف کتب، جرائد اور خطوط میں ضرور کیا تھا اور بیشتر احوالِ سفر مختلف منتشر اوراق میں ملتے ہیں مگر مصنّف نے ان سب کو کتابی صورت میں یکجا فرما کر کے جو اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ ایک عظیم علمی خدمت ہے اور علامہ اقبال کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے والے حضرات کے لیے ایک گرانقدر تحفہ بھی۔ ہم آپ کی کاوشوں پر آپ کے ممنون و اِحسان مند ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر وحید الزمان طارق

☆☆☆

حرفِ تحسین

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

آیۂ کائنات کے پیکرِ جمیل حضور نبی کریمؐ کے نقوشِ پا واضح کرنے اور دلوں میں آپؐ کی محبت جاگزیں کرنے کے لیے ہر دور میں اللہ کے جلیل القدر بندے سعی و جہد کرتے رہے۔ وہ راتوں کو روشن اور دنوں کو روشن تر کرنے کے لیے پیہم گامزن رہے اور یوُں چراغ سے چراغ جلتا رہا۔ اِسی زنجیر کی ایک سنہری کڑی حکیم الاّمت حضرت علامہ اقبال ہیں جنھوں نے انیسویں صدی کے رُبعِ آخر میں برصغیر کے تاریخی شہر سیالکوٹ میں جنم لیا اور بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیاں اُن کے عطر بیز الفاظ، کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی ان کی زبان کی چاشنی، علم وحکمت اور فکر وفلسفہ سے مزّین ان کے اردو و فارسی کلام، ایشیا و یورپ کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں سے کشید کیے ہوئے اُن کے جوہرِ فن اور قوّت، آزادی، خودی، فقر، عشق اور جہدِ پیہم کے لیے ان کی توانا آواز سے گونجتی رہیں۔ آپ گم کردہ راہ مسلمان نوجوان کو مسلسل جادۂ منزل کی طرف بلاتے رہے۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترِے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

آپ نے اپنا سارا سرمایۂ علم امّت کے اندر قرآن کی عظمت، رسولِ کریمؐ کی محبت اور تہذیبِ اسلامی کی بالاتری کا تصوّر حلول کرنے کے لیے صَرف کر دیا۔ اِس کے لیے آپ ہندوستان، افغانستان، مصر و فلسطین اور برِّ اعظم یورپ کے طول و عرض میں سرگرمِ سفر رہے۔ مرے کالج سیالکوٹ، گورنمنٹ کالج لاہور، لنکنز اِن لندن، برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی، جرمنی کی

میونخ اور ہائیڈل برگ یونیورسٹیوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اقبال جیسے عظیم المرتبت اور صاحبِ بصیرت شخص نے وہاں تعلیم حاصل کی اور اِن اداروں کے علمی وقار میں اضافہ کیا۔ آپ نے دنیا کے انتہائی مؤقّر اداروں اور جامعات میں فاضلانہ خطبے دیے، اردو اور فارسی کے ہزار ہا شیریں اور لازوال اشعار صفحۂ قرطاس پہ بزمِ انجم کی طرح سجائے اور اعلیٰ ترین انگریزی زبان میں الٰہیاتِ اسلامی کی دورِ جدید میں تزئینِ نو پہ قابلِ قدر علمی سرمایہ فراہم کیا۔ اقبال کے علمی کارناموں اور آپ کے فکری شعور کی توضیح کے لیے پاک و ہند ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے اہلِ علم حضرات نے گزشتہ سو سال میں بہت سی قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور آنے والی کئی صدیوں میں یہ کاوشیں جاری رہیں گی۔ زیرِ نظر تصنیف عصرِ حاضر کے نامور محقّق اور معروف اقبال شناس جناب عنایت علی کی طرف سے اِن کاوشوں میں ایک انتہائی خوبصورت اضافہ ہے۔

اقبال کے رنگ و بُو کی تلاش میں فاضل مصنّف نے دنیا کے کونے کونے کی خبر لی ہے اور بڑی جانفشانی سے اقبال کا پیچھا کیا ہے۔ لاہور سے دہلی، ممبئی، مدراس، حیدرآباد، الٰہ آباد، علی گڑھ، کشمیر، سرہند، بھوپال، کابل، غزنی، قندھار، ہائیڈل برگ، میونخ، لندن، کیمبرج، پیرس، قُرطبہ، غرناطہ، روم، فلسطین، قاہرہ، پورٹ سعید اور جانے کہاں کہاں آپ کے شب و روز کی تصویر کشی کی ہے۔ گویا مصنّف نے اپنی زندگی کے ۳۸ سال اقبال کی معیّت میں گزارے ہیں اور ایک منجھے ہوئے صحافی کی طرح اقبال کی علمی، فکری اور ادبی رُودادِ سفر کے علاوہ اُن کی خانگی زندگی کی داستان بھی مرتب کر دی ہے۔ آپ کے حوالے معتبر اور الفاظ شستگی کا نمونہ ہیں۔

میں بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ عہدِ حاضر کے اقبال شناسوں اور اقبال سے محبت کرنے والوں میں جناب عنایت علی کا مقام نہائت بلند اور قابلِ رشک ہے۔ آپ کا سینہ اقبال کی فکر سے منوّر اور آپ کا قلم اقبال کے الفاظ سے تابناک ہے۔ آپ نے اقبال کی سفری داستان مرتّب کرنے سے قبل اس ضمن میں اپنے معاصرین اور متقدّمین کے علمی کام کا دیدہ ریزی سے مطالعہ کیا، پوری جزئیات کے ساتھ اُن کا تنقیدی جائزہ لیا اور اُن مقامات کی نشاندہی کی جہاں دوسرے مصنّفین سے کوئی سہو سرزد ہوا یا کوئی بات تشنہ رہ گئی یا حیاتِ اقبال کا کوئی گوشہ منظرِ عام پہ نہ آ سکا۔ پھر اپنے مطالعے کے تناظر میں یہ باغ و بہار کتاب مرتّب کی تا کہ اہلِ نظر کی وہ تشنگی دور ہو سکے اور حیاتِ اقبال کے وہ گوشے بھی پوری آب و تاب سے محبّانِ اقبال کے

سامنے آ سکیں جو ابھی تک اُن سے پوشیدہ تھے۔ آپ کے متقدّ مین میں سے بہت سوں کو اقبال کے قریبی رفقاء جیسے غلام رسول مہر یا چودھری محمد حسین وغیرہم سے ملاقات کا شرف حاصل رہا جس سے انہیں اقبال پہ اپنی نگارشات کو نکھارنے میں بہت مدد ملی جب کہ فاضل مصنّف کو عصری تاخیر کے سبب یہ سہولت میسّر نہ آ سکی۔ اس کے باوجود آپ کی سفر نگاری ایک وقیع علمی مقام رکھتی ہے اور جس دقّتِ نظر کے ساتھ آپ نے اقبال کے شب و روز کا محاکمہ کیا ہے وہ ایک مدّتِ مدید تک علمی اور ادبی حلقوں سے داد و تحسین وصول کرتی رہے گی۔

اقبال کی فکری جہتیں بے شمار ہیں۔ آپ شاعر ہیں، ادیب ہیں، مفکّر ہیں، معلّم ہیں، قانون دان ہیں، سیاست دان ہیں، تاریخ شناس ہیں اور ماہرِ علومِ فلسفہ ہیں لیکن بنیادی طور پر آپ فکرِ قرآن کے علم بردار، عاشقِ رسولؐ اور مصلحِ امّت ہیں۔ آپ کا سارا علم و فن اور فلسفہ و بصیرت انھی جہات کے لیے وقف نظر آتا ہے۔ اور آپ کے ہاں اپنی اس حیثیت کا احساس اتنا قوی ہے کہ ایک جگہ آپ نبیِ کریمؐ کی ذاتِ گرامی سے باقاعدہ شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ:

من اے میرِ امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

(حضورؐ مَیں آپ سے انصاف طلب ہوگا، دوست میرا شمار غزل گو شاعروں میں کرتے ہیں۔)

آپ کے جلیل القدر کلام میں منظر کشی، واقعات نگاری، قصیدہ، نظم، غزل، رباعی غرض سارے اصنافِ سخن اور سارے مظاہرِ فن صرف دو نکات پہ مرتکز ہیں کہ قرآنِ پاک سارے علوم کا منبع و مخزن ہے اور نبیِ کریمؐ کی ذاتِ گرامی ساری انسانی محبتوں اور عقیدتوں کا محور ہے۔ فرماتے ہیں:

گر تُو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جُز بہ قرآں زیستن
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام
شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

(اگر تو مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتا ہے تو قرآن پر عمل پیرا ہوئے بغیر ناممکن ہے)

قرآنِ حکیم وہ زندہ کتاب ہے جس کی حکمت قدیم اور لازوال ہے۔ مَیں نے دریائے قرآن سے موتی چنے ہیں اور اللہ کے رنگ کی رمز کی شرح بیان کی ہے۔

اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار اے تجھ سے دیدۂ انجم فروغ گیر
جلوہ ات تعبیر خوابِ زندگی اے ظہورِ تُو شبابِ زندگی
مرا ایں ابتدا ، ایں انتہا بس بکوئے تُو گدازِ یک نوا بس

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ ست
آبروئے ما زِ نام مصطفیٰؐ ست

(ہر مسلمان کے دل میں حضورؐ کا مقام ہے اور ہماری آبرو اُن کے ہی نامِ نامی سے وابستہ ہے۔)

اقبال کے مطابق جو دل محبتِ رسولؐ سے محروم ہے وہ محض ویرانہ ہے۔ مسلمانو ں کی ساری عزت اور عظمت آپ ﷺ کی محبت اور آپؐ کے اتّباع میں ہے ورنہ مقدّر محض خواری و زبوں حالی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

(رات مَیں اللہ کے حضور زاروقطار روتے ہوئے التجا کر رہا تھا کہ مسلمانوں کی حالت خراب کیوں ہے اور وہ دنیا میں ذلیل کیوں ہیں۔ مجھے آواز آئی کہ یہ قوم دل رکھتی ہے مگر محبوب (حضورؐ) نہیں رکھتی۔)

مجھے آواز آئی کہ یہ قوم دِل رکھتی ہے مگر محبوب (حضورؐ) نہیں رکھتی۔

اقبال کا پیغام ہے کہ حضورؐ کی محبت کی تپش سے خالی سینے روشنی سے محروم اور دنیا میں بے وقعت ہیں۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

آپ نے ہمیں بر ملا یہ سکھایا ہے کہ بشری اِدراک کی معراج اور فہم و بصیرت کی آخری

انسانی حد حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ آپ ﷺ کی وجہ سے انسان کو توقیر عطا ہوئی اور آپ ﷺ ہی کی وجہ سے یہ مُشتِ خاک مہر و ماہ کی ہمسر ٹھہری۔

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب

اقبال کی یہ فہم و فراست، عقل و بصیرت اور ولولۂ شوق نئی نسل کے اندر منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کی متحرّک اور مضطرب زندگی کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے، آپ کی دکھائی ہوئی روشن راہوں پہ سفر کیا جائے اور آپ کے سوز و گداز کو اپنے وجود میں سمونے کی کوشش کی جائے۔ حیاتِ اقبال پہ لکھی گئی ساری کتابیں جو آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرتی ہیں، دراصل اِسی عالمگیر جدوجہد کا حصہ ہیں اور اُن سب کا مقصد اقبال کے شرارِ آرزو کو عام کرنا ہے۔

محترم عنایت علی کی تازہ کتاب بظاہر اسفارِ اقبال کا تذکرۂ رنگیں ہے مگر فاضل مصنّف نے جس مہارت سے شب و روز کے عمومی ذکر کو ایک انتہائی دلآویز داستانِ رنگ و بو کی شکل دے دی ہے، یہ اُنھی کا حصہ ہے۔ اِسے پڑھتے ہوئے اقبال بالفعل ایشیا و یورپ کی وادیوں اور دیارِ عشق کی گھاٹیوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، انہیں اپنی تاریخ ساز فکری جدوجہد، علم و فن کی آبیاری اور سیاسی معرکوں میں گرمِ سفر دیکھا جا سکتا ہے۔

قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مُرشد سے خود محوِ گفتگو ہو اور اُن کی بزم ہائے دروں میں بہ نفسِ نفیس شریک ہو۔ کتاب کا اندازِ تحریر انتہائی سہل ہے، اس کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی اور علمی رکھ رکھاؤ میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔

فاضل مصنّف جناب عنایت علی اقبال شناسوں کی بزمِ جمیل میں ایک تازہ اضافہ ہیں۔ اقبال کے ساتھ ان کی محبّت انتہائی ہمہ گیر اور سوز و گداز سے بھرپور ہے۔ اُن کے اندر کے عشقِ اقبال نے اُن کی کتاب کو بہت دل نشیں اور بارآور بنا دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ نسلِ نَو اِن کی اِس کاوش سے استفادہ کرتے ہوئے اقبال کی بصیرت اور سوزِ دروں کو حرزِ جاں بنائے گی

اور یوں اللہ کے ہاں فاضل مصنّف کی نیکیوں میں اضافے کا سبب بنے گی۔

دعا ہے کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اُن کی جولانیٔ طبع، اُن کی تندیٔ قلم اور اُن کی شادابیٔ تحریر فزوں تر ہوتی چلی جائے۔

عبدالستار نعیم
پرنسپل کالج آف انجینئرنگ وٹیکنالوجی
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد

۱۹ رجب ۱۴۳۷ھ
۲۷ / اپریل ۲۰۱۶ء (بدھ)

☆☆☆

پیش لفظ: طبع سوم

علامہ اقبال کی زندگی، فلسفہ، انسانیت اور ملّتِ اسلامیہ سے متعلق اُن کے افکار وغیرہ پہ اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ بعض علمی حلقوں میں یہ تأثر پایا جاتا ہے کہ علامہ اقبال تساہل پسند اور اپنے آپ کو گھر تک محدود رکھنا پسند کرتے تھے۔ مگر جب ہم اُن کی زندگی کے شب و روز اور مصروفیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ جس تحرک کی اپنے کلام و پیام میں بات کرتے ہیں اُن کی ذاتی زندگی میں بھی بدرجۂ اُتم پایا جاتا تھا۔ زیرِ نظر کتاب میں زیادہ تر اُن ''اسفار'' کو شامل کیا گیا ہے جو انھوں نے علمی، تعلیمی و ملّی جذبہ کے تحت کیے اِن میں وہ سفر شامل نہیں جو انھوں نے ذاتی، خاندانی اور نجی ضروریات کے لیے کیے جس طرح تقریباً ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں سیالکوٹ اپنے والدین سے ملنے جانا، ایبٹ آباد (کیمبل پور) اور کوئٹہ وغیرہ اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے کام کے سلسلہ میں جانا، لدھیانہ میں سسرال کے ہاں، اسی طرح نواب ارشاد علی خان نے ایک مقدمہ کی مشاورت کے سلسلہ میں انھیں شملہ کی دعوت دی اور وہاں علامہ نے دس دن قیام کیا...... وغیرہ۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے اسفار ہیں جو اگرچہ ملّی اور اسلامی جذبہ کے تحت ہوئے مگر اُن کی تفصیل نہ ہونے کی وجہ سے شامل نہیں ہو سکے۔ مثلاً دسمبر ۱۹۰۸ء میں نواب وقار الملک مشتاق احمد نے اسلامیہ ہائی سکول ہوشیار پور کا سنگِ بنیاد رکھا۔ تقریب میں علامہ اقبال، منشی منیر سب جج، میاں محمد شفیع، صاحبزادہ آفتاب احمد خان اور ڈپٹی کمشنر آجرٹن بھی شریک ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ کالج میں The Muslim Cummunity a Sociological Study کے موضوع پر لیکچر دیا، جسے مولانا ظفر علی خان نے ''ملّتِ بیضا پر عمرانی نظر'' کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا درجہ ملا، پہلی وائس چانسلر سلطان جہاں

بیگم کی صدارت میں یونیورسٹی کا پہلا جلسہ تقسیمِ اسناد اسٹریچی ہال میں ہوا تو علامہ اقبال اور عبداللہ چغتائی نے بھی اس تقریب میں یونیورسٹی کی دعوت پر شرکت کی۔ اسی طرح ۱۶؍جولائی ۱۹۳۲ء کو جالندھر میں عیدمیلا دالنبی ﷺ کے جلسہ میں شرکت کی......وغیرہ

انفارمیشن ٹیکنالوجی، کمپیوٹر اور موبائل نیٹ ورک کے اس دور میں کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا رجحان کم ہوتا جا رہا ہے ایسے میں کتاب کے پہلے دو(۲) ایڈیشن ختم ہونے کے بعد تیسرے کی طلب میرے لیے نہ صرف حوصلہ افزا اور مسرّت انگیز ہے بلکہ وہاں اس سے مجھے یہ موقع بھی فراہم ہوا کہ کچھ مزید اسفار کو بھی کتاب میں شامل کر دیا جائے۔ یہ اضافی اسفار، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (امرتسر) میں شرکت، کانپور اور دہلی کا سفر، امرتسر کا سفر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے دعوتِ خطاب، مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے دعوتِ خطاب ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب قارئین کے لیے بہت دلچسپی اور معلومات کا باعث ہوگی۔

ان سب کو زمانی ترتیب سے جگہ دینے کے لیے کتاب کی نئے سرے سے ترتیب و تدوین کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کتابت کی اغلاط کو بھی درست کیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے بہتری اور اصلاح کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے چنانچہ اس کے لیے قارئین کی طرف سے تنقید و تنقیص کا انتظار رہے گا۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ طبع اوّل کے بعد طبع دوم کی اشاعت اس قدر عجلت میں کرنا پڑی کہ کتاب پہ نظرِ ثانی اور پیش لفظ کا موقع ہی نہ مل سکا۔

اس کتاب میں زیادہ تر علامہ اقبال کی لاہور سے باہر کی مصروفیات کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ علامہ کا دَور برصغیر کے سیاسی اور اَدبی ہنگاموں سے بھرپور تھا۔ علامہ اقبال لاہور میں اپنی عدالتی اور یونیورسٹی مصروفیات کے باوجود اِن سیاسی اور اَدبی ہنگاموں میں بھرپور شرکت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں ہونے والے جگر پاش واقعات و حادثات کے مواقع پر بھی مسلمانوں کی بھرپور راہنمائی فرمائی۔ اس کے علاوہ اُن کے گھر پر ظہر عصر سے لے کر رات گیارہ بجے تک احباب کی محفل جمی رہتی تھی۔ انسان حیران ہوتا ہے کہ اس مردِ قلندر کو اُمتِ مسلمہ اور برّصغیر کے مسلمانوں کے مسائل پر غور وفکر کرنے اور اتنا بڑا علمی وفکری کام کرنے کے لیے فراغت و فرصت کب میسّر آتی ہوگی؟

یوں تو علامہ کی فکری اور علمی معراج کا ایک زمانہ گواہ ہے مگر ہم رسالہ ''عبرت'' کے مدیر

مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کے اس بیان پر ختم کرتے ہیں جو اس ماہرِ علم و فضل اور تاریخ دان نے لاہور میں علامہ اقبال سے ملاقات کے بعد نجیب آباد جا کر دیا تھا۔

''........بڑا ہی خوش نصیب ہے لاہور کہ اس میں نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کا بہترین سمجھدار اور روشن دماغ شخص موجود ہے اور بڑا ہی بدنصیب ہے لاہور کہ اس کے باشندوں نے اقبال کی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے اور فیض یاب ہونے کی کماحقہٗ کوشش نہیں کی۔ ایک زمانہ ضرور ایسا آنے والا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں پنجاب کے موجباتِ عظمت جب لکھے جائیں گے تو اُن میں ڈاکٹر اقبال کا نام نمایاں حروف میں نظر آئے گا اور ہر سیالکوٹی و لاہوری اقبال کا نام لے لے کر فخر کرے گا۔ لیکن اس کا یہ فخر ندامت و شرمندگی سے تبدیل ہو جائے گا جب اس حقیقت کا انکشاف ہو گا کہ روہیل کھنڈ کا ایک شخص صرف ڈاکٹر اقبال کی صحبت میں چند گھنٹے گزارنے اور بعض مسائل علمیہ سمجھنے کے لیے گنگا، جمنا، ستلج، بیاس وغیرہ دریاؤں کو عبور کر کے راوی کے کنارے لاہور پہنچ سکتا تھا مگر لاہور میں رہنے والوں کو کبھی برسوں بھی اس امر کی خواہش نہیں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال سے کچھ سنیں اور پوچھیں۔''

مَیں جناب عبدالستار نعیم پرنسپل کالج آف انجینئرنگ و ٹیکنالوجی رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کی حروف خوانی کی۔ جناب طارق واصفی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ جنھوں نے بعض جگہ پر فارسی متن کو اردو کے قالب میں ڈھال کر قارئین کے لیے آسان فہم بنایا۔ جناب غلام مصطفیٰ انجم کی سپاس گزاری مجھ پر واجب ہے جنھوں نے مسودہ کو ترتیب دینے میں میری مدد فرمائی۔

عنایت علی
۱۴۹- انجینئرز ٹاؤن سیکٹر بی
لاہور
فون: 0332-7655509

۲۷۔شعبان ۱۴۴۱ھ
۲۱/اپریل ۲۰۲۰ء

تقریظ: طبع سوم

علامہ اقبال کا ہر سفر با مقصد ہوتا تھا۔ وہ بہت پہلے سفر کی تیاری کرتے، ضروری معلومات حاصل کرتے اور ایک منظّم پروگرام کے تحت عازمِ سفر ہوتے تھے۔ سفر کے مقاصد اور اہداف کو ہمیشہ سامنے رکھتے تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ اپنے ہر سفر کی رُوداد اپنے مکاتیب کے ذریعے اپنے دوستوں کو بھیجا کرتے تھے۔ اور سفر کے مکمل احوال قلم بند کرتے۔ دورانِ سفر ہم سفروں سے تبادلہ خیال کرتے۔ مقامات، موسم، سمندروں، انسانوں اور خارجی مناظر کا گہرا مشاہدہ کر کے، ایک فلسفی کی حیثیت سے اُن کا تجزیہ کرتے اور شاعرانہ تخیّل سے اپنے تاثرات میں رنگ بھرتے اور کبھی تاریخی واقعات کا جو ہر کشید کر کے اپنا حالِ دِل کہا کرتے تھے۔ انگلستان جانے کے لیے بحری جہاز میں سفر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''آج ۱۳؍ستمبر کی صبح ہے۔ مَیں بہت سویرے اُٹھتا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں، چراغاں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے۔ آفتاب چشم آب میں سے اُٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے...... طلوعِ آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لیے تلاوت کا حکم رکھتا ہے......
چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحلِ عرب کے تصور نے جو ذوق وشوق اس دل میں پیدا کر دیا ہے اُس کی داستان کیا عرض کروں...... اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدّن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ اے پاک سرزمین تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش! میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مِل کر تیرے بیابانوں میں اُڑتی پھرے اور یہی

آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش! مَیں تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اِس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔''

اقبال تفصیلاتِ سفر لکھتے ہوئے دل چسپ سماجی پہلوؤں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اُن کی بذلہ سنجی اور ظرافت کی ایک جھلک دیکھئے:

''جب ہم سویز پہنچے تو مسلمان دکانداروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آ موجود ہوئی اور ایک قسم کا بازار تختۂ جہاز پر لگ گیا۔ کوئی پھل بیچتا ہے کوئی پوسٹ کارڈ دکھتا ہے۔ کوئی مصر کے پرانے بت بیچتا ہے۔ انھی لوگوں میں ایک شعبدہ باز بھی ہے کہ ایک مرغی کا بچہ ہاتھ میں لیے ہے اور کسی نامعلوم ترکیب سے ایک کے دو بنا کر دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان مصری دکاندار سے مَیں نے سگریٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں مَیں نے اُس سے کہا کہ مَیں مسلمان ہوں مگر چونکہ میرے سر پر انگریزی ٹوپی تھی، اُس نے ماننے میں تامّل کیا اور مجھ سے کہا کہ تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ مَیں نے اُسے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے کیا اسلام تشریف لے جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ اگر مسلمانوں کی داڑھی مُنڈی ہو تو اُس کو تُرکی ٹوپی یعنی طربوش ضرور پہننا چاہیئے۔ ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہو گی؟ خیر آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا اور چونکہ حافظِ قرآن تھا اس واسطے میں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ باقی تمام دکانداروں نے مجھے بلایا اور وہ میرے گرد حلقہ باندھ کر ماشاللہ ماشاللہ کہنے لگے اور میری غرضِ سفر معلوم کر کے دعائیں دینے لگے یا یوں کہیے کہ دو چار منٹ کے لیے وہ تجارت کی پستی سے اُبھر کر اسلامی اخوت کی بلندی پر جا پہنچے۔''

پچھلے پچاس سالوں میں اتنے سفر نامے لکھے گئے ہیں کہ اُردو ادب میں سفر نامہ ایک منفرد صنفِ سخن میں شمار ہونے لگا ہے۔ کچھ سفر نامے نہایت معلومات افزا ہیں اور اُن کا طرزِ بیان بھی شگفتہ اور سنجیدہ ہے لیکن کئی سفر ناموں پر ناول کا گمان ہوتا ہے۔ اُن میں حقیقی حالات اور مکالمات کم ہیں یارانِ سخن نے تخیّل کی بوقلمونی اور فنِ افسانہ طرازی سے اپنے سفر ناموں کو قاری کے لیے دل فریب اور سنسنی خیز بنایا دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سفر نامے تحریر نہیں کیے گئے بلکہ

تخلیق کیے گئے ہیں اس کے برعکس اقبال نے اپنے اسفار اور قیام کے جو احوال تحریر کیے ہیں وہ حقیقت نگاری اور صداقت بیانی کا نمونہ ہیں۔ اُن کے اسلوب، نگارش، منظر کشی اور طرزِ بیان نے احوال کو قاری کے لیے دل چسپ اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔

اقبالیاتی ادب کی اِس صنف میں سب سے پہلے محمد حمزہ فاروقی نے ''سفر نامۂ اقبال'' کے عنوان سے قلم اُٹھایا۔ حمزہ فاروقی کا شمار بلاشبہ متقدِ مین ماہرینِ اقبالیات میں ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے اس سفر نامہ کو صرف دو گول میز کانفرنسوں، اِس دوران ہونے والی دعوتوں/ ملاقاتوں اور راستے میں مختلف سربراہانِ مملکت، اہلِ علم، دانشوروں سے ملاقاتوں اور مختلف تاریخی مقامات کی سیّاحت تک محدود رکھا۔ زیرِ نظر کتاب علامہ اقبال کی پوری زندگی کے تعلیمی، ملّی اور سیاسی اغراض سے لاہور سے باہر کیے ہوئے اُنیس (۱۹) اسفار پہ محیط ہے۔ اس کے علاوہ مؤلف نے اِس میں 'سفرِ آخرت' شامل کر کے اقبال کی ہم نوائی کی ہے۔ ان تمام اسفار کی ایسی منظر کشی کی ہے جیسے وہ ایک مُرید کے طور پر اپنے مرشد کے ہم سفر رہے ہوں۔ کتاب کے پیش لفظ (طبع سوم) میں اُن چار (۴) اسفار کی نشاندہی بھی کر دی ہے جن کی تفصیل نہ ہونے کی وجہ سے شامل نہیں کیا جا سکا۔

عنایت علی کی کتاب ''اسفارِ اقبال'' معنوی لحاظ سے اقبال کا خود نوشت سفر نامہ ہے کیونکہ یہ بیشتر اقبال کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ اقبال کی تحریریں صفحات قرطاس پر گوناگوں پھولوں کی طرح بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ عنایت علی نے حسنِ ترتیب اور کمال مہارت سے ان پھولوں سے مہکتے ہوئے گلدستے بنائے اور اپنے گلہائے عقیدت و محبت کی پتیوں سے باندھ کر نظارۂ عام و خاص کے لیے سجا دیا ہے۔ اس کتاب کے مرتب اور محقق نے اقبال کی شخصیت کے کچھ ایسے گوشوں کے رخِ زیبا سے حسنِ ادا کے ساتھ پردہ اُٹھایا ہے جو ابھی اقبال کی شاعری اور خطبات کے مطالعہ سے واضح نہیں ہوئے۔ اسفارِ اقبال کے احوال پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک معروف،، متحرک اور پُر مشقّت (Hectic) زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ دورانِ سفر بھی پڑھتے، لکھتے اور اپنی قیام گاہ پر آنے والوں سے ملاقاتیں کرتے اور مختلف انجمنوں، تنظیموں اور اداروں کی دعوت پر لیکچر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مختلف مقامات، عمارات اور مزارات پر بھی تشریف لے جاتے تھے۔ احباب کے ساتھ پکنک پر جاتے اور ساحلِ سمندر پر ٹہلتے ہوئے فلسفہ

اور شاعری کے علاوہ کئی اور موضوعات پر بھی بحث جاری رکھتے۔ اُن کا نظام الاوقات بہت سخت (Tight) ہوتا تھا مثلاً:

''۵/ اپریل ۱۹۳۳ء ہی شام کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں انھوں نے جامعہ ملّیہ میں ''لندن سے غرناطہ'' کے موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ اگلے روز اُنھوں نے وائسرائے کے ہاں ''اینگلو انڈین کمیٹی برائے تعلیم'' کی تقریب میں شرکت کی۔ وہاں سے فارغ ہو کر پھر جامعہ ملّیہ میں طلبہ سے خطاب کرنے آ گئے۔''

علّامہ اقبال کے بارے میں یہ تاثر غلط ہے کہ وہ تن آساں اور سہل پسند تھے۔ اُنھوں نے بیرونِ ملک انگلستان، فرانس، سپین، اٹلی، مصر، فلسطین اور افغانستان کا سفر کیا اور اندرونِ ملک بھی کئی سفر کیے۔ ''اسفارِ اقبال'' میں زمانی ترتیب کے ساتھ ان سفروں کی تفصیلات بیان کی گئیں ہیں، بلاشبہ اقبال سیر سپاٹے اور آوارہ گردی سے گریزاں تھے۔ اُن کا ہر سفر با مقصد اور بار آور ہوتا تھا۔ اُن کا ہر لمحۂ زندگی غور و فکر اور قوم کے درد کے درماں کی تلاش میں گزرا۔ مشہور ادیب اختر حسن رائے پوری ان کے خیالات سے اختلاف رکھتے تھے، انھوں نے اعتراف کیا کہ ''غمِ دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمتِ انسان کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا''۔

علّامہ محمد اقبال کے لباس اور گھر میں سادہ طرزِ زندگی کو اُن کی تن آسانی پر محمول کرنا قرینِ انصاف نہیں۔ وہ ایک قلندر اور درویش صفت انسان تھے۔ وہ ریاکاری اور خودستائی سے مبرّا تھے۔ وہ اس لحاظ سے متحرک نہ تھے کہ اصحابِ اقتدار و اختیار کے کاشانوں پر جھکتے اور اپنی شہرت اور ناموری (Self Projection) کے لیے ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں گھومتے رہتے۔ اُن کی بے نیازی، استغنا اور اُن کا فقر ہی اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔

عنایت علی نے بھی اپنی کتاب کے ذریعے اقبال کی اِن خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے اور اس معمول کو بھی نمایاں کیا ہے کہ وہ کبھی تنہا سفر نہیں کرتے تھے۔ اپنے احباب کے ساتھ سفر کرنا پسند کرتے تھے۔ اقبال ۲۸/ جون ۱۹۱۷ء کے ایک خط بنام گرامی میں لکھتے ہیں:

''کیا امسال کشمیر چلیں گے؟ اگر ارادہ ہو تو لکھیے۔ ممکن ہے کہ مَیں بھی آپ کا ساتھ دوں۔ کشمیر کی سیر کا آپ کی معیّت میں لطف ہے۔ غنی کشمیری کی روح خوش ہو گی کہ گرامی جالندھری اُس کے مزار پر آئے ہیں''۔

۱۷/ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو مہاراجہ کے نام لکھتے ہیں:

''اب کے موسم گرما یہیں لاہور میں گزرا۔ کشمیر جانے کا قصد تھا مگر یارانِ طریقت ہم سفر نہ ہو سکے۔ اکیلے سفر کرنا اقبال سے ممکن نہیں''۔

عنایت علی سے میری پہلی ملاقات مجلسِ اقبال چشمہ کے پلیٹ فارم پر ہوئی جس کے وہ بانی ہیں۔ اس مجلس کی دعوت پر مَیں تقریب بیادِ اقبال (۶/ جون ۲۰۱۵ء) میں شریک ہوا۔ پاکستان جوہری توانائی کمیشن کے ممبر پاور جناب سیّد یوسف رضا اور چشمہ آفس کے افسران اور سٹاف نے میرا خیر مقدم کیا۔ سیّد موصوف دل آویز اور با اثر شخصیت ہیں اُنہوں نے مجھے ایک قیمتی کتاب بھی عطا کی۔ اسی محفل میں مشیر ممبر (پاور) محمد خان نیازی سے ملاقات ہوئی، وہ کمال کے سخن در ہیں اور بات سے بات نکالنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ مجلسِ اقبال چشمہ کی اُس سُہانی شام کو جب یاد کرتا ہوں تو علم وادب اور شوق وجنوں کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اُس جگمگاتی رات ترنم سے اقبال کی غزلیں اور نظمیں سنانے والوں نے ایسا سماں باندھا کہ میری روح، مادہ کی اسیری سے آزاد ہو کر رقص کناں تھی۔ اہلِ دل سامعین سے بھرے ہوئے ہال میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سب پر ''حال'' طاری ہے۔ فکرِ اقبال پر گفتگو کو سننے کے لیے وہ ہمہ تن گوش تھے اور اُن کے من میں حُبِ اقبال کا مدّ و جزر جاری تھا۔ فکرِ اقبال اور شعرِ اقبال کے ایسے رسیا مَیں نے کم ہی دیکھے ہیں۔

مجھے بتایا گیا کہ علم وادب کی اِس محفل کے شجر کی پرداخت اور آبیاری میں عنایت علی کا وافر حصہ ہے۔

عنایت علی سے پہلی ملاقات ہی تعلقِ دوستی کے لیے فیصلہ کن تھی۔ اُس کے بعد اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ وہ ملنسار، خوش اخلاق، وضعدار اور با اثر انسان ہیں۔ اُن کی نمایاں خوبی فکرِ اقبال سے عشق اور اقبال کو چاہنے والوں سے تعلقات بڑھانا ہے۔ انھوں نے محققانہ کاوش سے اپنی صلاحیت و فطانت کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت محنت سے ''اسفارِ اقبال'' کتاب کو مکمل کیا ہے۔ اُن کے پُر جوش جذبے اور معیارِ تحقیق کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کاش! اس جذبے اور معیار سے کلیات (کالجوں) اور جامعات میں اقبالیات کی تدریس کرنے والے بھی بہرہ ور ہوتے۔

اِس کتاب کی مقبولیت کا اِس سے اندازہ لگائیے کہ تین سال میں اِس کے دو ایڈیشن شائع ہو گئے اور اب تیسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اِس مقبولیت میں عنایت علی کی حسنِ نیت کے علاوہ اُن کی متین اور رواں تحریر، اُن کے شگفتہ اور پرتاثر اسلوب نگارش کا بھی حصہ ہے۔ مَیں نے جب اِس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو اس کی فکر انگیزی اور دل آویزی میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ جب تک کتاب ختم نہ ہوئی یہ میرے ہاتھ سے نہ چھوٹی۔

اسفارِ اقبال کا مطالعہ اقبال شناسوں، علم و ادب کے اساتذہ کرام، علمائے عظّام، طلبا و طالبات اور عام تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔ قاری کے لیے یہ اپنے اندر دلچسپی کا کافی سامان رکھتی ہے۔ امیدِ واثق ہے کہ برادرم عنایت علی کے فیض رساں قلم سے اور بھی نادر تحقیقی تصانیف منظرِ عام پر آئیں گی۔

ڈاکٹر طالب حسین سیال
سابق ڈائریکٹر اقبال بین الاقوامی
ادارہ برائے تحقیق و مکالمہ
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

۲۲۔ ذیقعدہ ۱۴۴۱ھ
۱۴/ جولائی ۲۰۲۰ء

باب:۱

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے

دبستانِ مولوی سیّد میر حسن کے گوہرِ تابندہ جناب محمد اقبال سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے جہاں سے ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے ایم۔اے فلسفہ میں داخلہ لیا۔

دسمبر ۱۸۹۸ء میں انھوں نے ایم۔اے کے امتحان کی تیاری کے ساتھ قانون کا ابتدائی امتحان P.E.L دیا لیکن اس کے فقہ (Jurisprudence) کے پرچے میں کامیاب نہ ہو سکے۔لیکن اس تعلیمی سفر کی بعض اتفاقی ناکامیاں ان کی آئندہ ترقی کا سبب بن گئیں۔ مارچ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے ایم اے فلسفہ کا امتحان دیا اور اس میں تیسرے درجے میں کامیاب ہو کر ۱۳رمئی ۱۸۹۹ء کو یونیورسٹی اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہو گئے۔ یہ وظیفہ صرف دو سال کے لیے تھا۔ ۱۹۰۰ء میں انھوں نے پی۔ای۔ایل کا دوبارہ امتحان دینے کی درخواست کی مگر ضابطے کی بعض وجوہ کی بنا پر اس کی اجازت نہ ملی۔

اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاست مدن پڑھانا اقبال کے فرائض میں داخل تھا۔اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے قائم مقام پروفیسر مقرر ہو گئے۔ معلّم کی حیثیت سے آپ نے سیاست مدن پر ایک کتاب ''علم الاقتصاد'' لکھی۔ یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر اردو زبان میں لکھی گئی اور اس میں اوّلیت کا شرف اقبال ہی کو حاصل ہے۔ انھوں نے جو راہ ہموار کر دی تھی، اس پر گامزن ہونا بعد کے مصنّفین کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ اس کتاب میں اقبال نے توضیح اصول کے ساتھ ہندوستان کے تمدّنی،

اخلاقی اور اقتصادی حالات کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں، جن سے پڑھنے والے کی نظر وسیع ہوتی ہے اور اُس کو مسائلِ اقتصاد پر آزادانہ غور وفکر کی تحریک ہوتی ہے۔ زرِنقد کی ماہیت پر جو لکھا ہے، ایک خاص منطقیانہ دلچسپی رکھتا ہے جس سے عقلی مسرّت حاصل ہونے کے علاوہ بعض اہم مسائل پر نہایت گہری روشنی پڑتی ہے۔

۱۹۰۱ء میں اقبال ای اے سی (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) کے مقابلۂ امتحان میں شریک ہوئے مگر طبی معائنہ کے وقت غالباً نظر کی کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹروں نے ان کا نام امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ اس ناکامی نے اقبال کو آگے بڑھنے کے لیے اور اکسایا اور ان کے دل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ پنجاب یونی ورسٹی کے رجسٹرار اور اورینٹل کالج لاہور میں سنسکرت کے پروفیسر ڈاکٹر الفریڈ سٹریٹن کی وفات ۱۹۰۳ء پر مسز سٹریٹن کے نام تعزیتی خط میں وہ امریکی یونی ورسٹیوں میں داخلے کے کوائف اور ممکنات پر غور کرتے نظر آتے ہیں۔

۱۹۰۴ء میں اقبال کے فلسفے کے استاد پروفیسر تھامس آرنلڈ ملازمت سے استعفا دے کر انگلستان روانہ ہو گئے۔ ان کی جدائی سے یہ جذبہ اور بھی شدت اختیار کر گیا اور اقبال نے اپنی مشہور نظم ''نالۂ فراق'' (آرنلڈ کی یاد میں) میں اس کا اظہار یوں کیا:

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں　　آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اُس کو سرزمیں
یادِ ایّامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں مَیں　　بہرِ تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں مَیں
ذرّہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا　　آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا　　آہ! کیا جانے کوئی مَیں کیا سے کیا ہونے کو تھا
ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت　　اند کے باغنچہ ہاے آرزو بارید و رفت
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم　　تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا مَیں پنجاب کی زنجیر کو

چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب شیخ عبدالقادر یورپ جانے لگے تو اقبال کو بھی اعلیٰ تعلیم کی تحریک ہوئی۔ انھوں نے شیخ عبدالقادر سے کہا کہ مَیں بھی بھائی کو لکھتا ہوں، اگر وہ بندوبست کر سکے تو

آپ کے جانے کے بعد ایک سال کے اندر اندر وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اقبال نے گذشتہ چند سالوں میں کچھ رقم اپنی تنخواہ سے پس انداز کی ہوئی تھی۔ اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے بھی اُن کی معاونت کی۔ اسلامی فلسفہ و تصوّف کے کسی موضوع پر ڈاکٹریٹ کرنے کی ترغیب تو ممکن ہے انہیں آرنلڈ نے دی ہو لیکن بیرسٹری کرنے کا ارادہ غالبًا اُن کا اپنا تھا۔ شیخ عبدالقادر نے مرزا جلال الدین کو لندن سے واپسی پر تاکید کی کہ اگر اقبال اُن کے پاس انگلستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آئیں تو اُن کی رہنمائی کی جائے۔ اقبال انگلستان جانے سے کچھ عرصہ قبل، مرزا جلال الدین کے پاس گئے۔ یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی، دوستانہ مراسم اقبال کی انگلستان سے واپسی کے بعد قائم ہوئے۔

اقبال انگلستان جانے سے قبل ہمیشہ قومی لباس زیب تن کرتے تھے۔ گھر میں وہ عموماً تہبند اور بنیان پہنتے۔ اگر سردیوں کا موسم ہوتا تو قمیض پہن کر اوپر دُھسا اوڑھ لیتے، باہر جاتے وقت عموماً شلوار قمیض اور اچکن یا کوٹ پہنتے تھے۔ پاؤں میں پمپ یا دیسی جوتا ہوتا اور سر پر رومی ٹوپی یا سیاہ قراقلی کی اونچی ٹوپی۔ بعض اوقات سر پر لنگی بھی باندھ لیتے تھے، لیکن یورپ میں پہننے کے لیے انھوں نے خاص طور پر انگریزی لباس یعنی سُوٹ سلوائے اور جب لندن پہنچے تو سوٹ ہی زیب تن کیا ہوا تھا۔ علی بخش نے ایک بار جاوید اقبال (فرزندِ اقبال) کو بتایا۔ کہ اقبال نے فیلٹ ہیٹ صرف یورپ میں طالب علمی کے زمانے میں پہنا۔ بعد میں اسے کبھی استعمال نہ کیا۔ لندن روانہ ہونے سے پہلے گرمیوں کی تعطیلات کا بیشتر حصہ اقبال نے سیالکوٹ میں اپنے والدین، اہل و عیّال اور بھائی بہنوں کے درمیان گزارا۔ مولوی سیّد میر حسن سے تحقیق کے معاملے میں مشورے بھی کیے۔ آخر کار وہ اپنے ماں باپ اور بھائی سے رخصت ہو کر لاہور پہنچے۔

لاہور سے دہلی کے لیے روانگی

لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اُن کے احباب نے انھیں الوداع کہا۔ اقبال کے لاہور سے لندن تک سفر کی تفصیل ان کی تحریروں اور احباب کے مضامین میں ملتی ہے۔ وہ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کی رات کو لاہور سے دہلی روانہ ہوئے۔ احباب میں سے غلام بھیک نیرنگ اور شیخ محمد اکرام انہیں رخصت کرنے کے لیے دہلی تک ساتھ گئے۔ گاڑی ۲ر ستمبر ۱۹۰۵ء کی صبح دہلی پہنچی۔ اسٹیشن پر خواجہ

حسن نظامی اور منشی نذر محمد استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ ریل سے اتر کر پہلے منشی نذر محمد کے مکان پر تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر سب دوست مل کر نظام الدین اولیاء کی درگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ رستے میں مغل شہنشاہ ہمایوں کے مقبرہ پر فاتحہ پڑھی اور داراشکوہ کے مزار کی زیارت کی۔ درگاہ میں پہنچ کر مزارِ نظام الدین اولیاء پر حاضر ہوئے۔ اقبال نے عالمِ تنہائی میں تربت کے سرہانے بیٹھ کر مندرجہ ذیل نظم اپنی خاص لَے میں پڑھی (ان کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں ٹھہرے رہے)۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا　　بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا　　اماں نہ دیتا تھا جب بحرِ بیکراں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے　　شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں　　تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر　　تری جناب سے واپس ملے فغاں مجھ کو
رہوں میں خادمِ خلقِ خدا جیوں جب تک　　نہیں ہے آرزوئے عمرِ جاوداں مجھ کو
پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں　　کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
یونہی بنی رہے محفل مرے احبا کی　　ہرا بھرا نظر آئے یہ بوستاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

دوستوں کی فرمائش پر یہی نظم درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر نہایت درد انگیز اور دلنشیں لہجے میں ایک دفعہ پھر سنائی گئی۔ یہ نظم ''بانگِ درا'' میں ''التجائے مسافر'' کے عنوان سے موجود ہے مگر اس کے کئی شعر حذف کر دیے گئے ہیں اور چند اشعار کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ وُہ کیا سعد لمحات تھے کہ علّامہ کی عرض اور غرض بارگاہِ رب العزت میں سندِ قبولیت پاتی ہے۔ اور آنے والے وقت میں اقبال نہ صرف اپنے ہم عصروں بلکہ بعد کے آنے والے اہلِ علم میں بھی مثلِ آفتاب و ماہتاب نظر آتے ہیں۔

درگاہ سے واپس ہو کر خواجہ حسن نظامی کے مکان پر قیام کیا اور دوپہر کو لنگر کی مہمانی سے لُطف اندوز ہوئے۔ اقبال نے خواجہ حسن نظامی سے کہا خواجہ صاحب اب ذرا مرزا غالب کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے۔ میر غلام بھیک نیرنگ کہنے لگے کیا شاعروں کا حج یہاں ہوتا ہے؟ اقبال کہنے لگے بجا فرمایا شاعروں کا قبلہ و کعبہ تو یہی ہے۔ خواجہ صاحب نے ایک ویران گوشے کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ چلیے ادھر ہے مرزا غالب کا مزار چنانچہ مرزا اسداللہ خان غالب کی تربت پر حاضر ہوئے۔ نیرنگ، تربت کے سرہانے لوحِ تربت پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے، ان کے دائیں اقبال عالمِ محویت میں بیٹھے اور باقی لوگ تربت کے اردگرد حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ دوپہر دو بجے کا وقت، تیز دھوپ اور ہوا میں گھمس، لیکن کسی کو گرمی کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ ایک نوعمر، نوآموز مگر خوش گلو اور بامذاق وقوال شخص ولایت نامی انھیں کچھ گا کر سناتا رہا۔ قوال زادے کو عجیب بروقت سوجھی کہ ان سے اجازت لے کر غالب کی غزل گانے لگا:

دِل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضا مند کر گئی

ذیل کے شعر پر عجیب کیفیت رہی:

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پَر گئی

جب گلوکار اس شعر پہ پہنچا

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اُٹھیے! بس اَب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

تو اقبال سے ضبط نہ ہو سکا اور آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور غزل کے اختتام پر جب کچھ لمحوں بعد ذرا ہوش بحال ہوئے تو وہاں سے چل دیئے۔ اقبال نے اپنے کلام میں غالب کو بجا طور پر خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے اور دہلی کی منظر کشی بھی۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستُور ہے
آہ! تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر☆ میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

بمبئی میں قیام

اقبال خود تحریر کرتے ہیں کہ ''رات منشی نذر محمد کے ہاں گزاری۔ ۳ر ستمبر کی صبح کو نیرنگ، شیخ

☆ ویمر - جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے۔

محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی روانہ ہوا اور ۴ ستمبر کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل پر پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں مگر مَیں نے ٹامس کک کی ہدایت پر انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلبہ کے لیے جو ولایت جا رہے ہوں نہایت موزوں ہے۔ یہاں کا منتظم ایک پارسی پیر مرد ہے جس کی شکل سے اس قدر تقدّس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے خشور (نبی) یاد آ جاتے ہیں۔ دکانداری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علماء میں باوجود عبادت اور مرشدِ کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔ اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آ کر مقیم ہوا جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا۔ کہنے لگا، چین میں سوداگری کرتا تھا لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے، مَیں نے سن کر دل میں کہا:

ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقل مند نکلے اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔ شاباش افیمیو، شاباش! نیند سے بیدار ہو جاؤ۔ ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ ہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو ازسرِ نو قائم کرنے میں تمھاری مدد کر سکیں ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروّت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکّا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں۔ ایک شب مَیں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے۔ فرانسیسی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر اٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی۔ جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح ان سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز مَیں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں...... یہ نوجوان ترک ینگ پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے۔ مَیں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ کہنے لگا، مَیں کمال بے (ترکی کا سب سے مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے وہ سب کے سب نہایت عمدہ تھے لیکن جو شعر اپنے سنائے وہ

سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے۔ایک روز سرِ شام مَیں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے وہاں اسکول کی گراونڈ میں مسلمان طلبہ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ہم نے اُن میں سے ایک کو بلایا اور اسکول کے متعلق بہت سی باتیں اس سے دریافت کیں۔غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجب شہر ہے۔ بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سر بفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہاں پارسیوں کی آبادی اسّی نوے ہزار کے قریب ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے۔اس قوم کی صلاحیّت نہایت قابلِ تعریف ہے اور ان کی دولت و عظمت بے اندازہ، مگر اس قوم کے لیے کسی اچھے مستقبل کی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ علاوہ اس کے نہ کوئی اُن کی زبان ہے، نہ اُن کا لٹریچر ہے اور طرّہ یہ کہ فارسی کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔افسوس یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں۔ ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے بلکہ زردشتی رنگ اس کے رگ و ریشے میں ہے اور اسی پر اس کے حسن کا دارومدار ہے۔مَیں نے اسکول کے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا۔چستی کی مورتیں تھیں مگر تعجب ہے کہ ان کی خوبصورت آنکھیں اسّی فی صد کے حساب سے عینک پوش تھیں۔اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا''۔

انگلستان روانگی اور بحری سفر کی رُوداد

اقبال تین روز بمبئی میں ٹھہرنے کے بعد ۷ر ستمبر ۱۹۰۵ء کو دو بجے دوپہر جہاز پر سوار ہوئے۔ لالہ دھنپت رام وکیل اور ان کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب جو اتفاق سے اس وقت بمبئی میں تھے، انہیں رخصت کرنے کے لیے گھاٹ پر گئے، کوئی تین بجے جہاز نے حرکت کی اور اقبال اپنے دوست کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے گئے، یہاں تک کہ موجیں اِدھر اُدھر سے آ آ کر جہاز کو چومنے لگیں۔اقبال لکھتے ہیں:

''فرانسیسی قوم کا مذاق اس جہاز کی عمدگی اور نفاست سے ظاہر ہے۔ ملازموں میں مصر کے چند حبشی بھی ہیں جو مسلمان ہیں اور عربی بولتے ہیں۔ جہاز کے فرانسیسی افسر نہایت خوش خلق ہیں اور ان کے تکلّفات کو دیکھ کر لکھنؤ یاد آ جاتا ہے...... کھانے کا انتظام بھی نہایت قابلِ تعریف ہے۔ ہمارے اس جہاز میں ساٹھ سے زیادہ مسافر نہیں ہیں۔ ہم لوگ رات کو اپنے اپنے کمروں میں سوتے ہیں اور صبح سے شام تک تختۂ جہاز پر کرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی پڑھتا ہے، کوئی باتیں کرتا ہے، کوئی پھرتا ہے۔ کیبن میں جہاز کی جنبش کی وجہ سے طبیعت بہت گھبراتی ہے مگر تختۂ جہاز پر بہت آرام رہتا ہے۔ میرے تمام ساتھی دوسرے ہی روز مرض بحری میں مبتلا ہو گئے۔ مگر الحمدللہ! کہ مَیں محفوظ رہا۔ بمبئ سے ذرا آگے نکل کر سمندر کی حالت کسی قدر متلاطم تھی۔ اتنی اونچی اونچی موجیں اٹھتی تھیں کہ خدا کی پناہ! دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ جہاز پر دیا سلائی استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تختۂ جہاز کے ایک طرف کمرے کی دیوار پر پیتل کی ایک انگیٹھی سی لگا رکھی ہے، جس میں چند لکڑیاں آگ لگا کر رکھ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کو سگریٹ یا سگار روی کرنا ہو، اس انگیٹھی سے ایک لکڑی اٹھا لیں۔ جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوتِ لامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے، شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدّنی اور روحانی فوائد ہیں، اُن سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پُورا پُورا یقین ہو جاتا ہے۔

آج ۱۲ر ستمبر کی صبح ہے۔ میں بہت سویرے اٹھا ہوں، جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے، آفتاب چشمۂ آب میں سے اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسے ہمارا دریائے راوی...... طلوعِ آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لیے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔ یہی آفتاب ہے جس کے طلوع و غروب کو میدان میں ہم نے کئی دفعہ دیکھا ہے۔ حقیقت میں جن لوگوں نے آفتاب پرستی کو اپنا مذہب قرار دے رکھا ہے، میں ان کو قابل معذور ہی سمجھتا ہوں۔ ناسخ مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں:

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھیے
تصویر کس کی ہے ورقِ آفتاب میں

کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب جو اٹھارہ ماہ کی رخصت لے کر ولایت جا رہے ہیں۔ بڑے

باخبر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کل رات اُن سے ہندوستان کے سیاسی معاملات پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ عربی اور فارسی جانتے ہیں۔ سر ولیم میور کی تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی تو کہنے لگے کاش یہ شخص ذرا کم متعصّب ہوتا۔ عمر خیام کے بڑے مداح ہیں، مگر مَیں نے ان سے کہا کہ اہل یورپ نے ابھی سحابی نجفی کی رباعیات کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ عمر خیام کو کبھی کے فراموش کر گئے ہوتے۔ اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحلِ عرب کے تصوّر نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منوّر کروں:

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرُو
خورشید بھی گیا تو اُدھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدّس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو! تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رّد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدّن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ اے پاک سرزمین! تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدّس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذرّوں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفّارہ ہو۔ کاش! میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔"

اقبال قرنطینہ کے سبب اور گرمی کے باعث عدن کی سیر نہ کر سکے اور جہاز ہی میں رہے۔ کچھ گھنٹوں بعد جہاز نے لنگر اٹھایا اور بحر قلزم میں سے گزرتا ہوا سویز پہنچا۔ اقبال تحریر کرتے ہیں:

"جب ہم سویز پہنچے تو مسلمان دکانداروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آ موجود ہوئی اور ایک قسم کا بازار تختۂ جہاز پر لگ گیا...... کوئی پھل بیچتا ہے، کوئی پوسٹ کارڈ دکھاتا ہے، کوئی مصر کے پرانے بُت بیچتا ہے۔ انھی لوگوں میں ایک شعبدہ باز بھی ہے کہ ایک مرغی کا بچہ ہاتھ میں لیے ہے اور کسی نامعلوم ترکیب سے ایک کے دو بنا کر دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان مصری دکاندار

سے مَیں نے سگریٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں مَیں نے اس سے کہا کہ مَیں مسلمان ہوں، مگر چونکہ میرے سر پر انگریزی ٹوپی تھی، اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا کہ تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ مَیں نے اسے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے کیا اسلام تشریف لے جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ اگر مسلمان کی داڑھی منڈی ہو تو اس کو ترکی ٹوپی یعنی طربُوش ضرور پہننا چاہیے ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہوگی۔ خیر آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا اور چونکہ حافظِ قرآن تھا، اس واسطے مَیں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ باقی تمام دکانداروں سے مجھ کو ملایا اور وہ میرے گرد حلقہ باندھ کر ماشاء اللہ، ماشاء اللہ کہنے لگے اور میری غرضِ سفر معلوم کر کے دعائیں دینے لگے یا یوں کہیے کہ دو چار منٹ کے لیے وہ تجارت کی پستی سے اُبھر کر اسلامی اخوّت کی بلندی پر جا پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز کی سیر کے لیے آیا۔ مَیں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے علی گڑھ کالج کے ایک ڈیپوٹیشن کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے اور مَیں بھی دخل در معقولات ان میں جا گھسا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوبصورت عربی بولتا تھا کہ جیسے حریری کا کوئی مقالہ پڑھ رہا ہو۔ آخر مسلمانوں کے اس گروہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سویز کینال میں جا داخل ہوا۔ یہ کینال جسے ایک فرانسیسی انجینئر نے تعمیر کیا تھا۔ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا، جس قدر اس مغربی دماغ نے زمانۂ حال کی تجارت پر اثر کیا ہے۔ سینکڑوں آدمی ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں جب ٹھیک رہتی ہے اور اس کا ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں جانب سے جو ریگ ہوا سے اڑ کر اس میں گرتی رہتی ہے، اس کا انتظام ہوتا رہے۔ جہاز سے گزرتے ہوئے ایک اور دلچسپ نظارہ بھی دیکھنے میں آیا اور وہ یہ کہ ہم نے ایک مصری جہاز گزرتے دیکھا۔ جو بالکل ہمارے پاس سے ہو کر گزرا۔ اس پر تمام سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور نہایت خوش الحانی سے عربی غزل گاتے جاتے تھے...... ابھی ہم پورٹ سعید نہ پہنچے تھے کہ ایک بارود سے بھرے ہوئے جہاز کے پھٹ جانے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غرق ہو جانے کی خبر آئی۔

''تھوڑی دیر میں اس کے ٹکڑے کینال سے گزرتے ہوئے دکھائی دیے۔ پورٹ سعید پہنچ کر پھر مسلمان تاجروں کی دکانیں تختۂ جہاز پر لگ گئیں۔ مَیں ایک کشتی پر بیٹھ کر مع پارسی ہم سفر کے

بندرگاہ کی سیر کو چلا گیا۔ مدرسہ دیکھا، مسجدوں کی سیر کی۔ اسلامی گورنر کا مکان دیکھا۔ موجدِ سویز کینال کا مجسمہ دیکھا، غرض کہ خوب سیر کی۔ آخر اپنے مسلمان راہ نما کو، جو اکثر زبانیں جانتا تھا، کچھ انعام دے کر جہاز کو لوٹا، یہاں جو پہنچا تو ایک نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تختہ جہاز پر تین اطالوی عورتیں اور دو مرد وائلن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا۔ ان عورتوں میں ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہو گی۔ نہایت حسین تھی۔ مجھے دیانتداری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اُس کے حسن نے تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر سخت اثر کیا، لیکن جب اُس نے ایک چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہو گیا، کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ القصہ فردوس گوش اور کسی قدر جنت نگاہ کے حظوظ اٹھا کر ہم روانہ ہوئے اور ہمارا جہاز بحیرۂ روم میں داخل ہو گیا۔ یہاں بہت سے جزیرے رستے میں ملتے ہیں۔ جن میں سے بعض کسی نہ کسی بات کے لیے مشہور ہیں۔ بحیرۂ روم کے ابتدائی حصے میں سمندر کا نظارہ بہت دلچسپ تھا، اور ہوا میں ایسا اثر تھا کہ غیر موزوں طبع آدمی بھی موزوں ہو جائے۔ میری طبیعت قدرتاً شعر کی طرف مائل ہو گئی اور مَیں نے چند اشعار کی غزل لکھی جو حاضر ہے۔

مثالِ پرتوِ مے طوف جام کرتے ہیں — یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں
عجب تماشا ہے مجھ کافرِ محبت کا — صنم بھی سن کے جسے رام رام کرتے ہیں (۱)
ہوا جہاں کی ہے پیکار آفریں کیسی — کہاں عدم کے مسافر قیام کرتے ہیں (۲)
نظارہ لالے کا تڑپا گیا مرے جی کو — بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں (۳)
رہینِ لذتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرار — یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں (۴)
جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری پستی سے — نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں (۵)
بھلی ہے ہم نفسو! اس چمن میں خاموشی — کہ خوش نواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں
غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی — حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں
بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ — کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں
ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو! — جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

(مازنی اٹلی کے محسنین کا سرگروہ تھا۔ یہ شعراس وقت لکھا گیا جب کہ اس ملک کا ساحل نظر کے سامنے تھا۔ یہ ''بانگ درا'' کے حصہ دوم کی غزل نمبر (٦) ہے۔اس کے (١) سے (۵) اشعار نکال دیے گئے ہیں اور کچھ کا اضافہ ہے)

''مارسیلز تک پہنچنے میں چھ روز صَرف ہوئے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ سمندر کا آخری حصہ بہت متلاطم تھا اور کچھ اس خیال سے کہ اصلی رستے میں طوفان کا اندیشہ ہوگا، ہمارا کپتان جہاز کو ایک اور رستے سے لے گیا، جو معمول کے رستے سے کسی قدر لمبا تھا۔۲۳ر ستمبر کی صبح مارسیلز یعنی فرانس کی ایک مشہور تاریخی بندرگاہ پر پہنچے اور چونکہ ہمیں آٹھ دس گھنٹے کا وقفہ مل گیا تھا، اس واسطے بندرگاہ کی خوب سیر کی۔ مارسیلز کا نوٹرڈام گرجا نہایت اونچی جگہ پر تعمیر ہوا ہے اور اس کی عمارت کو دیکھ کر دل پر یہ بات منقوش ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مذہبی تاثیر ہی حقیقت میں تمام علوم وفنون کی محرّک ہوئی ہے۔ مارسیلز سے گاڑی پر سوار ہوئے اور فرانس کی سیر بھی، حسنِ رہگزرے کے طریق پر ہوگئی۔ کھیتیاں جو گاڑی کے اِدھر اُدھر آتی ہیں، ان سے فرانسیسی لوگوں کا نفیس مذاق مترشح ہوتا ہے۔ ایک رات گاڑی میں کٹی اور دوسری شام کو ہم لوگ انگلش چینل کو عبور کر کے ڈوور سے لندن پہنچے۔ شیخ عبدالقادر کی باریک نگاہ نے باوجود میرے انگریزی لباس کے مجھے دور سے پہچان لیا اور دوڑ کر بغل گیر ہوگئے۔ مکان پر پہنچ کر رات بھر آرام کیا۔ دوسری صبح سے کام شروع ہوا، یعنی اُن تمام فرائض کا مجموعہ جن کی انجام دہی نے مجھے وطن سے جُدا کیا تھا اور میری نگاہ میں ایسا ہی مقدّس ہے جیسے عبادت۔''

اقبال ۲۴ر ستمبر ۱۹۰۵ء کو لندن پہنچے اور ایک رات شیخ عبدالقادر کے ساتھ گزارنے کے بعد ۲۵ر ستمبر کو کیمبرج روانہ ہوگئے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ اور دوسرے تعلیمی مراحل

اقبال کیمبرج میں ستمبر ۱۹۰۵ء کے آخری دنوں میں پہنچے اور یونیورسٹی کے ٹرنٹی کالج میں داخلہ لیا۔ اقبال کیمبرج میں سر طامس آرنلڈ کے مشورے پر تشریف لائے۔ پروفیسر آرنلڈ خود کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ ایک شہرہ آفاق مستشرق اور اسلامی عالم تھے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ (جو بعد ازاں علی گڑھ یونیورسٹی بنی) میں سرسیّد کے دور میں ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۸ء تک فلسفے کے استاد رہ چکے تھے۔ سرسیّد کی وفات کے بعد وہ لاہور آ گئے۔ پھر ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۴ء تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے

انگریزی میں Preaching of Islam کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھی انھوں نے تفسیرِ کبیر کا بھی انگریزی ترجمہ کیا جو آٹھ جلدوں پہ محیط ہے۔ گورنمنٹ کالج میں قیام کے دوران اقبال پر ان کی صحبت کا بہت اثر ہوا، اور بقول حکیمِ مشرق:

''یہ انھی کا فیضِ صحبت تھا جس نے میری روح کی تربیت کی اور اسے جادۂ علم پر گامزن کیا''۔

اقبال نے ٹرنٹی کالج کیمبرج کی کتابِ داخلہ (Admissions Book) بابت ۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۳ء میں اپنے مختصر کوائف درج کیے۔ وہ اس کالج میں درجۂ اعلیٰ کے طالب علم (Advanced Student) کی حیثیت سے داخل ہوئے، یعنی ایسا طالب علم جس کے پاس پہلے سے کسی اور یونیورسٹی کی بی۔اے یا ایم۔اے کی ڈگری ہو۔ اقبال بیرونی خرچ پر وہاں پہنچے۔ (ایسے طالب علم کو کیمبرج یونیورسٹی کی قدیم اصطلاح میں Pensioner کہا جاتا تھا)۔

بیسوی صدی کے اوائل میں جب اقبال کیمبرج پہنچے، تو وہ یونیورسٹی فلسفے کے میدان میں شہرۂ آفاق تھی، اور بالخصوص وہاں کئی ایک مستشرقین اور علمائے اسلامیات جمع تھے۔ فلسفے میں جارج مور (George Moore)، وائیٹ ہیڈ (Whitehead) سج وک (H. Sedgwick) جیمز وارڈ (James Ward)؛ کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اقبال کو کیمبرج میں فلسفہ کی تعلیم کے لیے جو اساتذہ ملے ان میں ٹرنٹی کالج کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ (۱۸٦٦ء۔۱۹۲۵ J.M.E. Mc Taggart:) بھی شامل ہیں۔ وہ اقبال کے ''نگران تحقیق'' (Research Supervisor) تھے اور ہیگل (Hegel) کے فلسفے کے ایک نامور اور مستند عالم تھے۔ انھوں نے اقبال کے فلسفیانہ ارتقاء پر بہت گہرا اثر کیا، اور اقبال کے فلسفے میں مستقل جدوجہد اور معرکۂ ضدّین کے جو آثار جا بجا ملتے ہیں، وہ ممکن ہے انھوں نے شاید پہلے پہلے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ ہی کے توسط سے حاصل کیے ہوں۔ کیمبرج میں اُن کے ایک اور استادِ فلسفہ، کنگز کالج کے پروفیسر سورلی (W.R. Sorely: ۱۸۵۵ء۔۱۹۳۵ء) تھے، جن کا خاص میدان ''نظریہ الوہیت اور اخلاقی اقدار'' تھا۔

فلسفے کے علاوہ علاّمہ اقبال قیام کیمبرج کے دوران جس دوسرے مضمون میں بالخصوص دلچسپی لے رہے تھے، وہ تاریخ اسلام اور خاص طور پر فارسی شعر و ادب اور تصوّف تھا۔ ان شعبوں میں بھی کیمبرج یونیورسٹی مالا مال تھی۔ ان میں سے ایک شخصیت ڈاکٹر (بعد ازآں پروفیسر) آر اے نکلسن (۱۸٦۸ء۔۱۹۴۵ء R.A. Nicholson) کی تھی۔ وہ اپنے زمانے میں اسلامی تصوّف

اور بالخصوص مولانا جلال الدین رومی پر ایک سند تسلیم کیے جاتے تھے۔ اُن کا ''دیوانِ شمس تبریز'' کا ترجمہ (۱۸۹۸ء) بہت مشہور ہے۔ اور تصوّف پر ترجمے اور چار مزید کتابیں اِن کی اہم تخلیقات ہیں۔ لیکن علّامہ اقبال سے متعلق ان کا بے حد اہم کام اقبال کی مثنوی ''اسرِ ارخودی'' (مطبوعہ لاہور، ۱۹۱۵ء) کا انگریزی ترجمہ ہے، جو ڈاکٹر نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں لندن سے The Secrets of the Self کے نام سے شائع کیا۔ (مطبوعہ Macmillan & Co. Ltd)۔

یہ علّامہ اقبال کی کسی تصنیف کے پہلے یورپی مترجم تھے اور اسی ترجمے کی بدولت علّامہ کا نام اوّل اوّل مغربی ممالک میں معروف ہوا۔ ایک طالب علم کے لیے اس سے زیادہ باعثِ فخر بات کیا ہوسکتی ہے کہ اُس عہد کے ایک عظیم استاد نے اُن کی تصنیف کا ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اس کے علاوہ اقبال کو ایک اور منفرد اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے تین سال کی قلیل مدّت میں تین ڈگریاں یعنی فلسفہ میں پی ایچ ڈی، بارایٹ لاء اور بی اے حاصل کیں۔

ٹرنٹی میں ان کے ٹیوٹر جناب ایڈم سیج وک (Adam Sedgwick) (۱۹۱۳ء۔۱۸۵۴ء) تھے۔ ٹرنٹی کالج، کیمبرج کا سب سے بڑا کالج ہے اور (شاید King's کالج کے بعد) اس یونیورسٹی کا حسین ترین کالج بھی، جس نے نیوٹن، بائرن، ٹینی سن اور برٹرینڈ رسل ایسی شخصیات پیدا کیں۔ علّامہ اقبال جس سال یعنی ۱۹۰۷ء میں اس کالج سے رخصت ہوئے، اسی سال پنڈت جواہر لال نہرو یہاں داخل ہوئے۔

کھڑکیوں میں سے نیچے دیکھیں تو نغمہ وخواب میں ڈوبی کیم (Cam) ندی اس کے پہلو میں گزر رہی ہے، جس پر بیدِ مجنوں کی شاخیں سایہ کیے ہوئے ہیں۔ ایک طرف سینٹ جان کے کالج کی خوبصورت عمارت ایک مرصّع تاج کی طرح جلوہ افروز ہے، اور دوسری طرف نارون (Elm) کے دو روّیہ اشجار کے درمیان خیابانِ فلسفیاں (Philosophers Walk) خیالوں میں کھویا ہوا نظر آتا ہے۔ دریا کی سطح پر طالب علم لڑکے لڑکیاں عموماً بجروں پر سوار محوِ سیرِ دریا دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی نظارہ عطیّہ فیضی اپنی کتاب ''اقبال'' میں کھینچتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ ''یکم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر مَیں پکنک کے لیے کیمبرج گئی۔ یہ دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے ترتیب دی گئی تھی، جہاں بہت سے نامور فضلا جمع تھے''۔

اقبال کے عہد میں علمی حلقوں میں عطیّہ فیضی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ محترمہ ایک

روشن خیال اور بہت ہی عُمدہ علمی خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اِن کی والدہ (بیگم مہر النساء) اور دونوں بڑی بہنیں (زہرا بیگم، نازلی رفیعہ بیگم) بھی صاحبِ تصنیف تھیں ماہانہ رسالہ ''تہذیبِ نسواں'' کے نام سے نکالتی تھیں یہ سب خواتین تعلیمِ نسواں تحریک کی اولین کارکن تھیں۔ عطیہ فیضی گورنمنٹ وظیفہ پہ انگلستان جانے والی غالباً پہلی مسلمان خاتون تھیں۔

یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو مس بیک نے ایک دعوت نامہ عطیّہ فیضی کو بھیجا تا کہ وہ برِّصغیر سے آئے ہُوئے ایک ذہین طالب علم سے ملاقات کریں جن کا نام محمد اقبال ہے جو کیمبرج سے خاص طور پر اُن سے ملنے کے لیے آرہے ہیں۔ عطیّہ فیضی کہتی ہیں کہ اس دعوت نامہ نے ان کے لیے قدرے دلچسپی پیدا کردی اس لیے کہ اس سے قبل انھوں نے اقبال کا نام بھی نہ سُنا تھا اور چونکہ لندن میں مختلف ہندوستانیوں کے پاس سے انہیں ایسے دعوت نامے آیا کرتے تھے اس لیے اس دعوت نامے نے عارضی شوقِ تجسس سے زیادہ اور کوئی جذبہ پیدا نہیں کیا۔ مگر چونکہ مس بیک لندن میں مقیم ہندوستانی طلبا کی بہبودی کی نگران تھیں اور ان سے مادرِ مشفق کا سا برتاؤ کرتی تھیں اس لیے اُن کے حکم کی تعمیل لازمی تھی۔ عطیّہ فیضی کہتی ہیں کہ کھانے کی میز پر جو گفتگو ہوئی اس سے مَیں نے یہ اندازہ کیا کہ اقبال فارسی اور عربی کے علاوہ سنسکرت میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں، بہت بڑے حاضر جواب ہیں اور دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور حاضرین پر مزاحیہ فقرے کسنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ مس بیک نے اُن کے آنے سے پہلے یہ حقیقت مس فیضی کے ذہن نشین کر دی تھی کہ وہ صرف اس سے ملنے کے لیے آرہے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ چونکہ مَیں نے سیدھی سادھی اور بے لاگ فطرت پائی تھی اس لیے مَیں نے اقبال سے پوچھا کہ ''اس ملاقات کی وجہ کیا ہے''۔ اُن کی عمیق آنکھوں سے یہ ظاہر نہ ہوسکا کہ آیا وہ تعریف یا تعریض سے کام لے رہے ہیں جب کہ اُنہوں نے کہا کہ ''آپ لندن اور ہندوستان میں اپنے سفر کی ڈائری کے باعث بہت مشہور ہوچکی ہیں اور اس لیے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ مَیں آپ سے ملاقات کروں''۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ مَیں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے کیمبرج سے یہاں تک آنے کی زحمت صرف اس لیے گوارا کی کہ آپ مجھے ہدیۂ تحسین پیش کریں۔ لیکن مذاق کو بالائے طاق رکھیے اور بتایئے کہ اس ملاقات کا حقیقی مقصد کیا ہے''؟ میری اس صاف گوئی اور رُوکھے پن پر وہ قدرے متعجب بھی ہوئے اور کہا،

''میں آپ کو مسٹر اور مسز سید علی بلگرامی کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں کہ آپ کیمبرج میں اُن کی مہمان بنیں اور میرا مشن یہ ہے کہ مَیں بغیر کسی رکاوٹ کے آپ کی منظوری اُن تک پہنچا دوں۔ اگر آپ انکار کر دیں گی تو اس ناکامی کا داغ مجھ پر رہے گا جسے مَیں نے آج تک کبھی قبول نہیں کیا اور اگر آپ دعوت منظور کر لیں گی تو آپ درحقیقت میز بانوں کی عزّت افزائی کریں گی''۔

بقول مس فیضی اقبال کو حسبِ خواہش اپنے تئیں گفتگو اور ماحول کو دلچسپ اور خوشگوار بنانے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ سوسائٹی میں وہ بہت زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے اور حاضر جوابی میں یا تعریف کرنے میں وہ کبھی نہیں جھجکتے تھے۔ اگرچہ بعض دفعہ ان کے مزاج میں مزاح کا رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ عطیّہ فیضی کہتی ہیں کہ دورانِ گفتگو حافظ کا ذکر آ گیا اور چونکہ مَیں خود اس شاعرِ اعظم سے دلچسپی رکھتی تھی اس لیے مَیں نے اُن کے بہت سے برمحل اشعار سنائے۔ مَیں نے اندازہ لگایا کہ خود اقبال بھی حافظ کے بے حد مدّاح ہیں۔ اُنہوں نے کہا، ''مَیں جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں اس وقت اُن کی رُوح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیّت شاعر کی شخصیّت میں گُم ہو جاتی ہے اور مَیں خود حافظ بن جاتا ہوں''۔ اقبال نے ایک اور ایرانی شاعر کا ذکر کیا جسے ہندوستان میں کوئی نہیں جانتا اور عطیّہ فیضی سے کہا کہ ''آپ بابا فغانی کے کلام کا ضرور مطالعہ کریں۔ اُن کی بہت کم تصانیف ہندوستان میں دستیاب ہوتی ہیں لیکن اُن کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے اس لیے کہ وہ ایک جُداگانہ زاویۂ نگاہ پیش کرتی ہیں''۔ یہ اقبال سے عطیّہ فیضی کی پہلی ملاقات کے تاثرات تھے اور اس دوران انھوں نے وعدہ کر لیا کہ وُہ ۲۲/اپریل کو کیمبرج آئیں گی۔ چند دن بعد اقبال نے عطیّہ فیضی کو فراسکےٹس میں (جو لندن کا ایک مشہور فیشن ایبل ہوٹل ہے) رات کے کھانے پر مدعو کیا تاکہ اُسے چند جرمن فضلا سے ملایا جائے جن کے ساتھ مل کر وہ کام کر رہے تھے۔ اس ڈنر کے موقع پر ہر چیز نہایت قرینہ اور نزاکت سے سجائی گئی تھی اور جب عطیّہ فیضی نے اس کی تعریف کی اور داد دی تو اقبال نے کہا کہ میں دو شخصیّتوں کا مجموعہ ہوں ظاہری شخصیّت کارآمد اور عملی ہے اور باطنی شخصیّت خواب دیکھنے والے فلسفی اور صوفی کی سی ہے۔ عطیّہ کہتی ہیں کہ ڈنر سے قطعِ نظر کرتے ہوئے، جو بہت ہی لذیذ تھا میری ذہنی طور پر بھی دعوت ہو گئی اس لیے کہ مجھے اقبال اور جرمن فلسفیوں سے گہرے فلسفیانہ مسائل پر گفتگو

کرنے اور بحث کرنے کا موقع مل گیا۔ اس دعوت کے جواب میں عطیہ فیضی نے ۱۵راپریل کو اقبال کے اعزاز میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا انتظام کیا جس میں عطیہ نے اپنے چند فاضل دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ ان میں مس سلوسٹر اور مس لیوی جولندن میں زبان اور فلسفہ کی طالبات کی حیثیت سے بہت مشہور تھیں اور ایم بینڈل اور ہیر میٹز ٹراتھ جو مشہور موسیقی دان تھے، خصوصیّت سے قابل ذکر ہیں۔ پارٹی میں جب اقبال نے فی البدیہہ چند شعر موزوں کر کے سنائے تو اُن خواتین نے بھی اسی انداز میں مزاحیہ اشعار سے جواب دیا اور اس طرح فضا میں شروع سے آخر تک علمی پھلجھڑیاں چھٹتی رہیں۔ ایک موقع پر عطیّہ نے اقبال کے اشعار کو قلمبند کرنے کی کوشش کی مگر اقبال نے یہ کہہ کر روک دیا، ''یہ باتیں اسی قسم کے خاص موقع کے لیے ہوتی ہیں اور ان کا مشن اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ زبان سے ادا ہو جاتی ہیں''۔ کچھ موسیقی دان دوستوں نے کلاسیکل موسیقی کا مظاہرہ کیا اور اس طرح جو تین گھنٹے وہاں صرف ہوئے، اُن کی یاد عرصۂ دراز تک دلوں کو گرماتی رہی۔

۲۲راپریل ۱۹۰۷ء کو عطیّہ، اقبال اور شیخ عبدالقادر کے ہمراہ کیمبرج روانہ ہوگئی۔ راستہ بھر یہ دونوں فاضل دوست نہایت عالمانہ گفتگو میں مصروف رہے جس میں کبھی کبھی مذاق بھی ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دو پہر کو بارہ بجے سیّد علی بلگرامی کے دولت کدہ پر پہنچ گئے۔ اقبال نے سیّد علی بلگرامی کے گھرانے والوں سے عطیّہ کا تعارف اس طرح کرایا گویا کہ کوئی مقدّس چیز اُن کے سپرد کی جارہی ہے اور پھر کہا، ''اگر زندگی میں مُجھے کبھی ناکامی کا خطرہ پیش آیا تو وہ اس وقت تھا جب کہ مَیں مس فیضی سے ملا جنھوں نے محض آپ کے احترام میں آپ کے دعوت نامہ کو ردّ نہ کر کے میری لاج رکھ لی''۔ اور آخر میں اپنا ایک فارسی شعر پڑھ کر سُنایا۔ دن بھر بڑی اچھی گفتگو ہوتی رہی اور جو لوگ بلگرامی کے مکان پر جمع تھے وہ سب ایک دوسرے سے عالمانہ مباحث کرتے رہے۔ کبھی کبھار اقبال تھکے ہوئے اور بے حس سے معلوم ہوتے۔ عطیّہ فیضی کہتی ہیں اقبال کی یہ کیفیّت اس وقت ہوا کرتی تھی جب وہ موقع کے منتظر رہتے تھے کہ پارٹی کے کسی شخص کے منہ سے کوئی بات نکلے اور وہ برق رفتاری سے اس کا جواب دیں۔ مَیں نے اقبال کی یہ خصوصیّت پہلی مرتبہ یہاں محسوس کی اور اندازہ لگا لیا کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے موقع کے متلاشی رہتے ہیں اور اس وقت ان کا جواب اتنا جلد اور غیر متوقع ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی

اس غیر متوقع اچانک پن سے کم سے کم تھوڑی دیر کے لیے تو ضرور سٹپٹا جاتا ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے ولیم گلیڈ اسٹون کی اور اُن کے طریقوں کی یاد تازہ ہوگئی جو وہ پارلیمنٹ کے ایوان میں برتا کرتے تھے۔ عطیّہ اسی شام کو لندن واپس آ گئی۔

یکم جون ۱۹۰۷ء کو عطیّہ پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر پکنک کے لیے کیمبرج گئی۔ اس پکنک کا انتظام دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے کیا گیا تھا اور اس موقع پر بہت سے نامی فضلا جمع تھے۔ گفتگو اِدھر اُدھر کے عام معاملات پر ہوتی رہی اور اسے فلسفیانہ رنگ دینے کی غرض سے پروفیسر آرنلڈ نے موت وحیات کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ ہر شخص نے زیرِ بحث مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جب بحث نے غیر واضح رنگ اختیار کر لیا تو اس وقت پروفیسر آرنلڈ نے اقبال سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''زیرِ بحث مسئلہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟'' اقبال نے جواَب تک بالکل خاموش بیٹھے تھے طنزیہ ہنسی سے جواب دیا، ''زندگی موت کی شروعات ہے اور موت زندگی کی''۔ اس کے ساتھ ہی بحث ختم ہوگئی۔

۹؍جون ۱۹۰۷ء کو عطیّہ فیضی پروفیسر آرنلڈ کے یہاں کھانے پر مدعو تھی اور اقبال بھی وہاں موجود تھے۔ پروفیسر آرنلڈ نے جرمنی میں ایک نایاب عربی مخطوطہ کی دریافت کا ذکر کیا جس کے بارے میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ کیا ہے؟ اور کہا۔ ''اقبال مَیں تمھیں وہاں بھیجنے کا خیال کر رہا ہوں اس لیے کہ تم ہی اس ذمہ دارانہ کام کے لیے موزوں ترین شخص ہو''۔ اقبال نے معذرت کے لہجہ میں کہا مَیں اپنے استاد کے سامنے بالکل مبتدی کی حیثیت رکھتا ہوں پروفیسر آرنلڈ نے جواب دیا مجھے پورا یقین ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے آگے بڑھ جائے گا۔ ''اقبال نے قدرے خشک مزاجی سے کہا۔ اگر آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں تو مَیں اپنے استاد کی بات مانے لیتا ہوں اور ان کے احکام کے سامنے سرِتسلیم خم کرتا ہوں''۔ پروفیسر آرنلڈ سمجھ گئے کہ اقبال کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور تصدیق کی کہ اس بارے میں اقبال کو ان پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی شستگی کے ساتھ اور ایسے مہذب پیرائے میں کی جا رہی تھیں کہ یہ دیکھنا موجبِ مسرّت تھا کہ اعلیٰ پایہ کے ذہین اور طباع اشخاص ایک دوسرے کے ساتھ کس پاکیزہ طریقے سے بحث کرتے ہیں۔

دوسرے دن اقبال عطیّہ کے ہاں گئے اور فلسفہ پر چند جرمن اور عربی کتابیں بھی ساتھ تھیں۔ ان کے ہمراہ ایک جرمن پروفیسر بھی تھے۔ اُنھوں نے ان کتابوں سے چند اقتباسات

پڑھ کر سنائے اور اس کے بعد بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں سب نے حصّہ لیا۔ بیچ میں تقابل کی غرض سے حافظ کی طرف اشارہ کرتے رہتے تھے۔ عطیّہ کہتی ہیں کہ مَیں نے یہ محسوس کیا کہ اقبال پر فارسی کے کسی دوسرے شاعر کے مقابلہ میں حافؔظ کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا ہے۔ اس لیے کہ وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے جس میں وہ اُن کے خیالات کو پیش کر کے دوسرے فلسفیوں کے ساتھ اُن کا مقابلہ نہ کرتے ہوں۔ پورے تین گھنٹے تک کتابیں پڑھی گئیں اور ان پر بحث ہوتی رہی اور اُنہوں نے کہا کہ ''اس طریقہ سے پڑھنے اور بحث و مباحثہ کرنے سے میرے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور میرے معتقدات پختہ ہو جاتے ہیں''۔

ایک جرمن خاتون نے جس کا نام مس شولی تھا، ۲۷/جون کو عطیہ فیضی کو ہندوستانی وضع کے ڈنر پر مدعو کیا۔ عطیّہ کہتی ہیں کہ مَیں بہت خوش ہوئی اس لیے کہ لندن میں ہندوستانی وضع کے کھانے کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا اور مَیں نے فوراً دعوت کو منظور کر لیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اقبال اسی کے یہاں رہتے ہیں۔ کھانا بالکل ہندوستانی وضع کا تھا، ہندوستانی خصائص پر مشتمل تھا اور اقبال کی زیرِ ہدایت تیار کیا گیا تھا۔ اقبال نے مجھ سے کہا کہ وہ ہر قسم کے ہندوستانی کھانوں کا اہتمام کر سکتے ہیں لیکن عطیّہ کو دعوت دینے میں اُن کا حقیقی منشا یہ ہے کہ مجھے وہ مقالہ پڑھ کر سنائیں جسے اُنہوں نے اپنی ڈگری کے لیے تیار کیا تھا۔ اقبال نے اسے تمام و کمال پڑھ کر سنایا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُنہوں نے اس کی تیاری میں کس قدر جانفشانی اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ جب وہ پڑھ چکے تو اُنہوں نے عطیہ کی رائے طلب کی اور جو کچھ انھوں نے کہا تھا اُسے مقالہ میں شامل کرنے کی غرض سے قلمبند کر لیا۔ ابھی مشکل سے یہ کام ختم کیا ہو گا کہ چند دوست آ گئے اور اُن کی معیّت میں امپیریل انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کرنے کی غرض سے گئے۔ جہاں خاندانِ شاہی کے اراکین بھی موجود تھے۔ سوائے اقبال کے باقی سب کے لیے ان کی موجودگی دلچسپی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اقبال ساری شام تھکے ہوئے اور پریشان سے معلوم ہوتے تھے اور جب اُنہوں نے یہ جملہ کہا کہ ''یہ سب مسرت بخش تضیعِ اوقات تھا''۔ تو عطیّہ نے اُسے سُن کر کہا کہ ''اِن ریمارکس سے اُن کی فطری امیج (اور ٹیکنیلیٹی) کا اظہار نہیں ہوتا''۔ ۲۹/جون ۱۹۰۷ء کو لیڈی ایلیٹس کے یہاں فیشن ایبل پارٹی دی گئی عطیّہ کہتی ہیں کہ اقبال کو وہاں دیکھ کر مجھے قدرے اچنبھا ہوا۔ جب مَیں اُن سے مصروف گفتگو تھی عین اُس وقت مس

سروجنی نائیڈو جو نہایت قیمتی لباس میں ملبوس تھیں اور ضرورت سے زیادہ ہیرے جواہرات میں لدی ہوئی تھیں اور بھدّے طریقے سے بنی ٹھنی تھیں، ایک دم اندر آ گئیں۔ مس موصوف اپنے آپ کو تمام خوبیوں کا مجموعہ سمجھتی تھیں۔ عطیہ اور ہر اس شخص کو جو اُن کی راہ میں آیا، کلیتاً نظر انداز کرتے اور پیکرِ جذبات بنے ہوئے سیدھی اقبال کے پاس پہنچیں اور اُن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا ''مَیں صرف آپ سے ملنے کے لیے آئی ہوں''۔ اقبال نے اس عزّت افزائی کا جو جواب دیا وہ یہ تھا'' یہ صدمہ اس قدر فوری اور اچانک ہے کہ مجھے تعجب ہوگا اگر مَیں اس کمرے میں سے زندہ باہر نکل سکوں گا''۔

فلسفہ میں عطیہ کی دلچسپی کے پیشِ نظر اقبال نے ۱۵۔۱۳/ جولائی ۱۹۰۷ء کی تاریخیں مقرر کیں تا کہ روزانہ دو گھنٹے تک فلسفہ کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ عطیہ، اقبال اور پروفیسر ہیر شیک سینٹ جنھوں نے جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی، آپس میں شاعری اور فلسفہ پر نہایت گہری دلچسپی کے ساتھ بحث کرتے۔ اقبال تمام تر جرمن علوم وفنون کی تائید میں تھے وہ کہتے تھے کہ ''اگر تم علم کے کسی شعبہ میں اپنی معلومات کو بڑھانا چاہتے ہو تو تمھارا منتہائے نظر جرمنی ہونا چاہیے''۔ مزید کہا کہ دوسروں سے بحث کرتے وقت ایک نئی دنیا تمھارے سامنے آ جائے گی اور مَیں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اسی طریقے سے حاصل کیا ہے۔

اقبال کیمبرج کے محنتی طالب علموں میں سے تھے۔ دو سال میں انھوں نے نہ صرف یہاں سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی بلکہ ۱۹۰۵ء ہی میں انھوں نے لنکنز ان (Lincoln's Inn) میں بھی داخلہ لے لیا تھا (یہ قائد اعظم کی تعلیم گاہ بھی رہی تھی)، اور جولائی ۱۹۰۸ء میں وہاں سے انھوں نے بیرسٹری کی سند حاصل کر لی۔ ڈاکٹر صاحب جیسے فلسفی اور شاعر کے لیے۔ بیرسٹری کا پیشہ کچھ عجیب سا تھا اس لیے ان کے احباب اور بہی خواہ اُن کے لیے اس کو پسند نہ کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کی بیرسٹری ان کی شاعری میں اور اُن کی شاعری بیرسٹری میں مُخل تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اُن سے پوچھ ہی لیا۔ ''آپ نے دو متضاد شغل کیوں اختیار کر رکھے ہیں''۔ فرمانے لگے۔ ''اس تضاد سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ وکالت دنیا داری کا نچوڑ ہے، تمام جہان کی کثافتوں اور خباثتوں سے انسان اس پیشے سے آگاہ ہو جاتا ہے اور طبیعت میں اس کے خلاف ایک ایسا رَدِّعمل پیدا ہوتا ہے کہ بڑے زور سے انسان کی روحِ لطیف چیزوں کے حصول

کے لیے بال وپَر پھیلاتی ہے"۔اس پر انھوں نے یورپ کے بعض ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو شاعر بھی ہیں اور بیرسٹر بھی۔

اس دوران نہ صرف انھوں نے میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی (نومبر ۱۹۰۷ء میں) بلکہ لندن یونیورسٹی میں چند مہینے موسم بہار ۱۹۰۸ء وہ پروفیسر آرنلڈ کی قائم مقامی میں عربی بھی پڑھاتے رہے۔

اقبال نے بی اے کی ڈگری کے لیے فلسفہ و اخلاقیات کے شعبے میں ایک تحقیقی مقالہ (Dissertation) داخل کیا، جو کیمبرج یونیورسٹی نے ۷؍مارچ ۱۹۰۷ء کو اجازتِ خاص سے (by special dispensation) بی۔اے کی سند کے لیے منظور کیا۔ یہ ڈگری انھوں نے ۱۳؍جون ۱۹۰۷ء کو حاصل کی۔

اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی سے بعد ازاں ایم اے کی ڈگری حاصل نہ کی (ورنہ حسب قواعد تین سال کے بعد مزید فیس ادا کرنے پر یہ ڈگری خود بخود مل جاتی ہے، بغیر کسی مزید امتحان کے)۔اُس زمانے میں کیمبرج میں پی۔ایچ ڈی کی ڈگری کا اجراء نہیں تھا۔

ٹرنٹی میں اقبال کی شبیہہ

ٹرنٹی کالج بادشاہ ہنری ہشتم نے ۱۵۴۶ء میں قائم کیا تھا اور یہاں کی بے حد حسین وجمیل لائبریری سر کرسٹوفر رین (Sir Chirstopher Wren) نے ۱۶۷۶ء تا ۱۶۹۰ء میں تعمیر کی۔ کالج کی کتاب داخلہ اسی لائبریری میں رکھی ہے۔ یہاں شہرۂ آفاق فلسفیوں اور علماء کے مجسّمے دو روّیہ ایستادہ ہیں اور بہت سی نادر روزگار کتابیں اور مسودات اس کو مالا مال کر رہے ہیں۔

اقبال کی علمی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اِن کی شبیہہ ٹرنٹی کالج کیمبرج میں آویزاں ہو چکی ہے۔اس اجمال کی مختصر رُوداد یُوں ہے کہ جنوری ۱۹۸۷ء میں جناب ڈاکٹر سعید اختر درّانی اقبال اکادمی برطانیہ کے صدر نشین منتخب ہوئے تو اُنہوں نے ٹرنٹی کالج کی انتظامیہ سے رابطہ کے بعد پاکستان کے شہرۂ آفاق مصوّر، جناب گل جی کو موسم خزاں ۱۹۹۰ء میں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ علاّمہ اقبال کا ایک نیا پورٹریٹ تیار کریں، جس کے لیے انھوں نے چند تصاویر جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے لاہور جا کر حاصل کیں۔ چنانچہ نومبر، دسمبر

۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر درّانی کے (سائنسی) دورۂ پاکستان، ملائشیا اور تھائی لینڈ کے دوران میں کراچی میں بالخصوص رکتے ہوئے جناب گل جی پر زور دیا کہ وہ یہ پورٹریٹ اپنے ساتھ واپسی کے سفر میں انگلستان لے کر جائیں گے۔ چنانچہ کراچی سے لندن روانگی سے کوئی ایک گھنٹہ پیشتر جناب گل جی نے علّامہ کی ایک بڑی خوبصورت نیلے، سفید اور سیاہی مائل رنگوں پر مشتمل بڑے سائز کی (قریب 110cm x 87cm اور Oils میں پینٹ کی ہوئی) شبیہہ ڈاکٹر درّانی صاحب کے ہاتھ میں تھمادی، جس میں علّامہ انگریزی لباس میں ملبوس ہیں (۱۹۳۰ء کے لگ بھگ کی شکل و شباہت میں) اس کے بعد ڈاکٹر درّانی موزوں موقعے کے منتظر رہے۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں اُن کے قدیمی کالج Caius کا سالانہ ڈنر تھا۔ اسی روز انھوں نے ٹرنٹی کالج کیمبرج کے نئے استاد اعظم سے ملاقات کی، جن کا اسم گرامی سر مائیکل عطیہ (Sir Michael Atiyah) تھا۔ وہ لبنان میں ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے مصر اور انگلستان میں تعلیم پائی تھی۔ اُس وقت وہ دُنیا بھر میں چوٹی کے چار پانچ ماہرینِ ریاضی (Mathematicians) میں شمار کیے جاتے تھے، انگلستان کی رائل سوسائٹی کے صدر بھی تھے، اور ملکۂ انگلستان بیک وقت جن صرف پندرہ اشخاص کو OM یعنی Order of Merit کے لقب سے سرفراز کرتی ہیں، ان میں سے وہ ایک تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ علّامہ اقبال کے نام سے واقف ہیں، بلکہ وہ عربی رسم الخط پڑھ سکتے ہیں۔

پروفیسر مائیکل عطیہ نے بخوشی اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ ایک خصوصی تقریب نومبر ۱۹۹۳ء میں ٹرنٹی کالج میں منعقد کریں گے، اور پھر علّامہ کا یہ پورٹریٹ وہاں آویزاں کر دیا جائے گا۔ اقبال اکادمی برطانیہ نے اس رسم کے سلسلے میں شب و روز بہت کام کیا، اور بالآخر جمعہ ۱۲رنومبر ۱۹۹۳ء کے روزِ مسعود کو کیمبرج میں ایک بڑی پر شکوہ تقریب انجام پائی۔ اس موقعے پر پورٹریٹ کے خالق، جناب گل جی بالخصوص امریکا سے آ کر شریکِ محفل ہوئے، چار اخباری نمائندوں کی موجودگی میں ڈاکٹر درّانی، سر مائیکل عطیہ اور قائم مقام سفیرِ پاکستان کمانڈر خالد شفیع نے تقاریر کیں اور موخر الذکر نے شبیہہ اقبال کی نقاب کشائی کی، جس کے بعد جناب گل جی نے کافی جذبات سے لبریز تقریر فرمائی۔ ٹرنٹی کالج کے اس دلکش ڈائننگ ہال میں جہاں کالج کے عظیم سپوتوں کی ساٹھ ستر شبیہیں آویزاں ہیں، اور جہاں نیوٹن، بائرن اور ٹینی سن کی نگاہوں

تلے نوجوان حضرت اقبال بھی بارہا ڈنر تناول کر چکے ہوں گے، ایک بے حد حسین و جمیل اور موی شمعوں سے جگ مگ کرتا ہوا ڈنر منعقد ہوا (جس کے آغاز میں کالج کے استادِ اعظم، سر مائیکل عطیہ نے ڈاکٹر درّانی کو Grace کہنے کی دعوت دی، جو عموماً ہر شام کھانا شروع کرنے سے پہلے لاطینی زبان میں پڑھا جاتا ہے۔ اور شاید کالج کی طویل تاریخ میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر درّانی نے بسم اللہ پڑھ کر حاضرین کو دعوتِ طعام دی) ڈاکٹر درّانی کا کہنا ہے کہ کھانے کے بعد جب وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو انہیں واقعی یوں محسوس ہوا گویا علاّمہ کی روح اس وقت ہمارے درمیان موجود ہے۔ سر مائیکل نے بھی کہا یوں معلوم ہوتا ہے کہ آج اس کالج کا ایک عظیم فرزند روحانی طور پر اپنے گھر واپس آرہا ہے۔ دیگر مقررین میں سفراء، بشپ مائیکل نذیر علی (جنھوں نے کیمبرج ہی میں علاّمہ کی ''اسرارِ خودی'' پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا)، اور ڈاکٹر اکبر احمد (جنھوں نے حال ہی میں Iqbal Visiting Fellow کے طور سے اپنا زمانۂ تعین ختم کیا تھا) شامل تھے۔ کیمبرج کے سابق استادِ فارسی جناب Peter Avery نے علاّمہ کے کلام کا بڑا خوبصورت ترجمہ پڑھ کر سنایا، جو انھوں نے اس موقعے کے لیے خاص طور سے تیار کیا تھا، جبکہ اردو اور فارسی کلامِ اقبال محترمہ پاکیزہ بیگ اور جناب اکبر حیدری نے ترنم کے ساتھ سنایا۔ اس موقع پر ہندوستان کی نمائندگی مہاتما گاندھی کے صوفی منش پوتے، جناب گوپال کرشن گاندھی نے کی (جو ایک انگریزی منظوم ڈرامہ داراشکوہ کے نام سے بھی تحریر کر چکے ہیں)۔

کیمبرج میں علمی مذاکرہ

جولائی ۱۹۰۷ء کو ایک علمی مذاکرہ ہوا جس میں بہت سے ہندوستانی مقیمِ لندن عطیّہ فیضی سمیت شریک ہوئے تھے۔ ایک ہندوستانی نوجوان نے جس کا نام پرمیشورلال تھا، بڑے ولولے کے ساتھ وہ خطوط پڑھ کر سُنائے جو اس کے گھر والوں نے اسے بھیجے تھے اور پھر رسالہ ''مخزن'' سے چند گیت اور نظمیں پڑھ کر سنائیں اور حاضرین کو محظوظ کیا۔ یہ سب نظمیں حُبِ وطن اور آزادی سے متعلق اقبال کے زورِ قلم کا نتیجہ تھیں۔ اُس نے کہا کہ یہ ساری نظمیں شمالی ہند میں گھر گھر گائی جاتی ہیں۔ اقبال کی ان قومی نظموں سے گھر، بازار اور گلیاں گونج رہی ہیں اور ان کی وجہ سے ہندوستان میں قومیّت کا وہ احساس پیدا ہو گیا ہے جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں

نہیں آیا تھا۔ تمام مجمع میں اس قدر جوش پھیلا ہوا تھا کہ سب نے 'مخزن'' کی مطبوعہ نظموں کو ایک ساتھ گانا شروع کر دیا اور سارا ہال اقبال کے اشعار سے گونج اُٹھا۔ جب ذرا جوش ٹھنڈا ہوا تو عطیّہ فیضی نے وہ خط نکالا جو اقبال نے اُسے جرمنی سے بھیجا تھا۔ یہ جرمن زبان میں تحریر کیا گیا تھا اور جب وہ پڑھا جا چکا تو سب نے یہ کہہ کر اُس کی تعریف کی کہ وُہ روانی اور ادبیت کا بہترین نمونہ ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے یہ کہہ کر عطیّہ فیضی سے وہ خط مانگ لیا کہ ''اگرچہ اقبال میرے شاگرد ہیں لیکن مَیں اُن کی تحریرات سے بہت کچھ سیکھتا ہوں۔ اُنہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ تم بہت خوش قسمت ہو کہ اُنہوں نے تمہیں ایسا اہم خط بھیجا''۔ اور عطیّہ فیضی کو یہ کہہ کر یقین دلایا کہ مَیں اس قیمتی جرمن شاہکار کو اپنے عزیز ترین مجموعے میں بہ حفاظت رکھوں گا۔ یہ صورتِ حال بہت نازک تھی اور عطیّہ اس عظیم المرتبت انسان کی درخواست کو ردّ نہ کر سکی اور اقبال کا خط اُن کے حوالے کر دیا۔

کیمبرج میں قیام کے دوران اقبال زیادہ دوست بنانے کے قائل نہ تھے۔ اجنبیوں میں کم آمیز ہو جاتے۔ وہ چلنے پھرنے یا باہر جانے سے گریز کیا کرتے تھے۔

سر عبدالقادر تحریر کرتے ہیں:

''اقبال کی طبیعت کی دو عادتیں وہاں (لندن میں) زیادہ نمایاں ہوتی جاتی تھیں، ایک تو اُن کی کم آمیزی، جس کا اشارہ انھوں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔ بہت سے دوست نہیں بناتے تھے۔ دوسری عادت نقل و حرکت میں تساہّل و تکاہل تھی۔ وہ کئی دفعہ کسی جگہ جانے کا وعدہ کرتے تھے اور پھر کہتے تھے، بھئی کون جائے۔ اس وقت تو کپڑے بدلنے اور باہر جانے کو جی نہیں چاہتا۔''

قیامِ یورپ کے دو اہم واقعات

شیخ عبدالقادر جو کیمبرج میں اقبال کے قیام کے دوران میں تقریباً دو سال اکٹھے رہے، بانگِ درا میں لکھتے ہیں کہ اُس زمانے میں دو بڑے تغیّر اقبال کے خیالات میں آئے۔ اِن تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے جن میں میرا بھی وہیں قیام تھا اور اکثر ملاقات کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ اُن کا ارادہ مصمّم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں۔ اور قسم کھا لیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صَرف ہوتا ہے اسے

کسی اور مفید کام میں صَرف کریں گے۔ مَیں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے، جسے ترک کرنا چاہیے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے۔ اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادۂ ترکِ شعر کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترکِ شعر اختیار کیا جائے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ اُن کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔ ایک تغیّر جو ہمارے شاعر کی طبیعت میں آیا تھا اس کا تو یوں خاتمہ ہوا۔

مگر دوسرا ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا یعنی اقبال کی شاعری نے فارسی زبان کو اردو زبان کی جگہ اپنا ذریعۂ اظہارِ خیال بنا لیا۔ فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی اور مَیں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب حالاتِ تصوّف کے متعلق لکھنے کے لیے جو کتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغیّرِ مذاق میں دخل ہو گا۔ اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعۂ علمِ فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انھوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اُردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اُردو میں فقرے ڈھالنا آسان نہیں۔ اس لیے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے۔ مگر بظاہر جس چھوٹے سے واقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں۔ انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ انھوں نے سوائے ایک آدھ شعر کہنے کے کبھی فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک اُن کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آ کر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اُٹھتے ہی جو مُجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انھوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان

غزلوں کے کہنے سے انھیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔ جس کا پہلے انھوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے تھے۔ مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہو گیا۔ یہ اُن کی شاعری کا تیسرا دَور ہے جو ۱۹۰۸ء کے بعد سے شروع ہوا اور جواب تک چل رہا ہے۔ اس عرصہ میں اُردو نظمیں بھی بہت سی ہوئیں اور اچھی اچھی، جن کی دھوم مچ گئی۔ مگر اصل کام جس کی طرف وہ متوجہ ہو گئے۔ وہ اُن کی فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' تھی۔ اس کا خیال دیر تک ان کے دماغ میں رہا اور رفتہ رفتہ دماغ سے صفحۂ قرطاس پر اترنے لگا اور آخر ایک مستقل کتاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوا، جس سے اقبال کا نام ہندوستان سے باہر بھی مشہور ہو گیا۔

فارسی میں اقبال کے قلم سے جو کتابیں نکلیں وہ ،اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق اور جاوید نامہ ہیں۔ ایک سے ایک بہتر۔ پہلی کتاب سے دوسری میں زبان زیادہ سادہ اور عام فہم ہو گئی ہے اور تیسری دوسری سے زیادہ سلیس ہے۔ جو لوگ اقبال کے اردو کلام کے دلدادہ ہیں، وہ فارسی نظموں کو دیکھ کر مایوس ہوئے ہوں گے۔ اگر چہ اردو میں شان وشوکت اور وضع داری موجود تھی لیکن زبانوں کی دُنیا میں یہ ایک نو وارد زبان تھی۔ جس کی تاریخ صرف پانچ سو سال پرانی تھی اس کے برعکس فارسی کی تاریخ دو ہزار سال پہ محیط ہے چنانچہ فارسی نے وہ کام کیا جو اردو سے نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام اسلامی دنیا میں جہاں فارسی کم وبیش متداول ہے، اقبال کا کلام اس ذریعہ سے پہنچ گیا اور اس میں ایسے خیالات تھے جن کی ایسی وسیع اشاعت ضروری تھی اور اسی وسیلے سے یورپ اور امریکہ والوں کو ہمارے ایسے قابلِ قدر مصنّف کا حال معلوم ہوا۔ ''پیامِ مشرق'' میں ہمارے مصنّف نے یورپ کے ایک نہایت بلند پایہ شاعر گوئٹے کے ''سلام مغرب'' کا جواب لکھا ہے اور اس میں نہایت حکیمانہ خیالات کا اظہار بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ اس کے اشعار میں بعض بڑے بڑے عقدے حل ہوئے ہیں، جو پہلے آسان طریق سے بیان نہیں ہوئے تھے۔''

اقبال کے روزمرہ کے معمولات بہت سادہ تھے وُہ سحر خیز تھے جس کا تذکرہ انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چُھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

سحر خیزی اور باقاعدگی سے نماز ادا کرنے کی عادت انہیں والد سے ورثے میں ملی تھی فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وُہ خوش الحانی سے بلند آواز سے تلاوتِ قرآن کرتے بعد میں ورزش۔ اس کے بعد کالج جانے کا وقت ہو جاتا۔ زیادہ تر بغیر ناشتہ کے کام پر چلے جاتے دوپہر کو ایک بجے کالج سے آکر کھانا کھاتے، شام کو اکثر نمکین چائے پیتے۔

بُدھ مذہب کی وضاحت

لندن میں اقبال کا معمول تھا کہ وہ شہر سے اپنی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے ریل استعمال کرتے تھے۔ اس قسم کے ایک سفر کے متعلق وہ بیان کرتے ہیں: انگلستان میں طالب علمی کے زمانے میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ گاڑی ایک جگہ پہ ختم ہو جاتی تھی اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ گاڑی اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ زوردار آواز سے پکارتا ''آل چینج'' یعنی سب بدلو۔ ایک روز مَیں حسبِ معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے اردگرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا یہ صاحب غالبًا ایشیائی ہیں، ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے۔ چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا مَیں نے کہا، ابھی جواب دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر مَیں چپ رہا۔ چند منٹوں کے بعد انھوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔ مَیں نے پھر کہا، ابھی جواب دیتا ہوں۔ وہ کہنے لگے، شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں۔ مَیں نے کہا، ہاں۔ اس دوران اسٹیشن آ گیا۔ گارڈ ''آل چینج'' پکارنے لگا۔ مَیں نے کہا، بس یہی بدھ مذہب ہے۔

کیمبرج کے زمانے میں چند ہم عصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب پوچھنے لگے، مسٹر اقبال یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیانِ مذاہب آئے وہ بلا استثناء ایشیا میں مبعوث ہوئے، یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پنترا جما لیا۔ اللہ میاں نے ایشیاء کو پسند کیا اور

شیطان نے یورپ کو اِس لیے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ وہ صاحب بولے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے انھوں نے جواب دیا ''یہ تمھارے میکاولی اور مشہور اہلِ سیاست اس کے رسول ہیں'' اس پر بہت قہقہہ پڑا۔

میونخ یونیورسٹی میں داخلہ

کیمبرج میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے قواعد، مئی ۱۹۲۰ء میں مرتب ہوئے اور اولین طالب علم نے ۱۹۲۱ء میں وہاں سے پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ (اس سے پیشتر صرف Fulll Doctorates مثلاً .DSc اور .D Litt وہاں سے ملا کرتی تھیں، جو عموماً بہت سی کتابوں کے مصنّفین وغیرہ کو دی جاتی ہیں)۔

چنانچہ پہلی جنگ عظیم سے قبل ذہین طلباء عموماً جرمنی جا کر پی ایچ ڈی کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ہائیڈل برگ اور میونخ وغیرہ سے ہر شعبے میں کثیر تعداد میں پی۔ ایچ۔ ڈی نکلا کرتے تھے، جن میں کئی کیمبرج کے اساتذہ کے بھیجے ہوتے تھے۔ اقبال کو بھی غالباً پروفیسر آرنلڈ نے مشورہ دیا ہوگا کہ وہ پی ایچ۔ ڈی حاصل کرنے کے لیے میونخ یونیورسٹی جائیں۔ چنانچہ انھوں نے کیمبرج میں جو تحقیقی کام کیا تھا، اس میں برلن اور ویانا کی لائبریریوں میں موجود مسودوں کی چھان بین کے بعد، کچھ اضافوں کے ساتھ ایک تھیسس ۴؍نومبر ۱۹۰۷ء کو داخل کر دیا۔ اس کا عنوان تھا Development of Metaphysics in The Persia (ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء)۔ اس مقالے پر انہیں میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ اور یہ مقالہ بعد از آں ۱۹۰۸ء میں لندن سے ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوا (Luzac & Co. London, ۱۹۰۸ء)۔ لیکن ظاہر ہے کہ لندن سے ۲۰؍جولائی ۱۹۰۷ء کے لگ بھگ جرمنی روانہ ہونے کے بعد، اور ۴؍نومبر ۱۹۰۷ء سے پیشتر میونخ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ داخل کرنے سے پہلے علّامہ اقبال کو مزید تحقیق کے لیے قلیل وقت ملا ہوگا (اور اس عرصے میں غالباً جرمن زبان کے امتحانات بھی شامل تھے)، اس لیے ان کو مابعد الطبیعیات کے علوم کی کم و بیش تمام تر معلومات کیمبرج ہی میں حاصل ہو چکی ہوں گی۔ چنانچہ یہ اُن کے کیمبرج یونیورسٹی کے اساتذہ ہی کا فیضانِ صحبت تھا، جس نے ان کے مذاقِ علمی کو پختہ کیا تھا۔

ہائیڈل برگ میں قیام اور پکنک پارٹی

اقبال جولائی ۱۹۰۷ء کے تیسرے ہفتے میں ہائیڈل برگ چلے گئے۔ غالباً وہ ڈوور سے کیلے یا بالون کے رستے فرانس کے شمال مشرقی حصے کو طے کرتے ہوئے جرمنی میں داخل ہوئے۔ ہائیڈل برگ جا کر وہ جرمن زبان سیکھنا چاہتے تھے تا کہ میونخ یونیورسٹی میں اپنے تحقیقی مقالے کے بارے میں زبانی امتحان جرمن زبان میں دے سکیں۔ ہائیڈل برگ ایک چھوٹا سا یونیورسٹی شہر ہے۔ جس کے درمیان سے دریائے نیکر گزرتا ہے۔ اسی نیکر سے متعلق اقبال کی نظم۔ بانگِ درا میں ''ایک شام'' کے عنوان سے ہے جس کے چند اشعار یوں ہیں۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش کہسار کے سبز پوش خاموش
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

اردگرد جنگلوں سے لدی پہاڑیاں ہیں۔ جن میں سے بعض کی چوٹیوں پر پرانے جرمن قلعے ہیں۔ شہر اپنی سیر گاہوں، پھلوں کے باغات اور پھولوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہر سمت خاموشی طاری رہتی ہے، جس میں صرف دریا کے بہتے پانی کی آواز ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ یونیورسٹی کی عمارت بھی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ دریا کے کنارے کنارے دور تک سیر گاہیں ہیں۔ نیز شہر یا یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کے قریب دریا کے ساتھ ساتھ نہایت خوبصورت قہوہ خانے ہیں۔ اقبال نے جرمنی میں تقریباً چار ماہ یعنی ۲۰ ر جولائی سے لے کر ۵ ر نومبر ۱۹۰۷ء تک قیام کیا وہ اکتوبر ۱۹۰۷ء کے پہلے ہفتہ میں ہائیڈل برگ سے میونخ چلے گئے۔ ہائیڈل برگ میں قیام کے دوران پرائیویٹ طور پر جرمن زبان اور ادب کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کی استانیاں دو پروفیسر فراؤلین ایما ویگے ناسٹ اور فراؤلین سینے شل تھیں۔ وہ دریائے نیکر کے قریب ہوسٹل میں رہتے تھے، جہاں چند طلبہ اور اساتذہ فروکش تھے اور جس کا انتظام ایک ستر سالہ خاتون فراؤ پروفیسر ہیرن کے ہاتھ میں تھا۔ طلبہ کو یونیورسٹی اور ہوسٹل میں رہائش کے اخراجات خود اٹھانے

پڑتے تھے لیکن اساتذہ کو کھانے پینے یا قیام کا کچھ ادا نہ کرنا پڑتا بلکہ مفت رہتے اور انہیں مزید کئی مراعات بھی حاصل تھیں۔ درس و تدریس کے اوقات صبح سے لے کر شام تک تھے۔ استادوں اور شاگردوں میں میل جول بہت تھا۔ فارغ اوقات میں سب اکٹھے پیدل سیر کو جاتے، کورس گانے گاتے، دریا میں کشتی رانی کرتے یا قہوہ خانوں میں بیٹھ کر گپیں اڑاتے۔ اقبال کی زندگی کے بہترین لمحے ہائیڈل برگ میں گزرے۔ وہ یہاں بے حد خوش اور بے تکلّف تھے۔ ہر کام میں بچوں کی طرح شریک ہوتے۔ ہر بات میں دلچسپی لیتے۔ وہ طلبہ میں نہایت ذہین سمجھے جاتے تھے۔ البتہ اوقات کی پابندی اُن کے لیے ممکن نہ تھی اس لیے دوسروں کو اُن کا انتظار کرنا پڑتا، مگر سب لوگ ان کی اس عادت سے واقف ہونے کے باوجود انہیں بہت پسند کرنے لگے تھے۔ ہائیڈل برگ میں قیام کے دوران اقبال کچھ فاصلے پر واقع میونخ آتے جاتے رہتے تھے۔ میونخ نسبتاً بڑا شہر ہے اور اپنے کلیساؤں، عجائب گھروں اور کتب خانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اقبال کا تعلق میونخ یونیورسٹی سے بھی تھا، کیونکہ انھوں نے اس یونیورسٹی میں اپنا تحقیقی مقالہ پیش کر رکھا تھا اور پی ایچ ڈی کے زبانی امتحان کے لیے انہیں یہیں آنا تھا۔ میونخ میں وہ پروفیسر ران اور ان کی بیٹی فراؤلین ران سے بھی جرمن زبان، ادب اور فلسفے سے شناسائی کے سلسلے میں رہبری لیتے تھے۔ ممکن ہے آرنلڈ کے بتائے ہوئے نایاب عربی مسوّدات کی تشریح اقبال نے میونخ میں کی ہو مگر اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

اقبال نے ہائیڈل برگ میں سکونت اختیار کرنے کے کچھ عرصے بعد عطیّہ فیضی کو وہاں آنے کی دعوت دی اور ساتھ کچھ کتابیں لانے کو بھی کہا۔ عطیّہ فیضی پانچ چھ اشخاص کے ہمراہ ۲۰/اگست ۱۹۰۷ء کی شام کو پانچ بجے ہائیڈل برگ پہنچیں۔ اقبال اپنے احباب کے ساتھ اُن کا استقبال کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ اُن کا تعارف فراؤلین ویگے ناسٹ اور فراؤلین سینے شل سے کرایا گیا۔ پہلے ایک قافلے کی صورت میں انہیں ان کی رہائش گاہ تک لے جایا گیا اور پھر سب رات گئے تک یونیورسٹی باغ کے قہوہ خانے میں بیٹھے کافی پیتے اور گپ شپ کرتے رہے۔ عطیّہ فیضی نے محسوس کیا کہ اقبال بے حد خوش ہیں۔ ان کا لندن والا طنزیہ انداز مفقود ہے۔ ان کی طبیعت میں ایک نئی قسم کا سادہ پن اور تحمل آ گیا ہے۔

دوسرے روز لیکچروں سے فراغت کے بعد پھر سب دریا کے کنارے قہوہ خانے میں

اکٹھے ہوئے۔ یونانی، فرانسیسی اور جرمن فلسفے پر بحث ہونے لگی۔ فراؤلین ویگے ناسٹ اور فراؤلین سینےشل، یہ تینوں زبانیں بخوبی جانتی تھیں اور اقبال ان کی باتیں سننے میں اس قدر محو یا پھر اپنے خیالات میں اتنے مستغرق تھے کہ جب جانے کا وقت آیا تو یوں محسوس ہوا گویا ابھی خواب سے بیدار ہوئے ہیں۔ عطیّہ فیضی بیان کرتی ہیں کہ اقبال لندن میں بڑے خودرائے اور تنک مزاج تھے لیکن اس کے برعکس یہاں بات بات پر اُن کا عجز وانکسار ظاہر ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے طلبہ بھی آ کر شریک ہو گئے، اور سب دریا کے پار ایک ہزار سیڑھیاں چڑھ کر پہاڑی کی چوٹی پر شلوس تک کورس میں جرمن گانے گاتے پہنچے۔ اقبال بھی کورس میں شریک ہوئے مگر بالکل بے سرے تھے۔

تیسرے روز پکنک کے لیے نائن ہائیم جانا طے پایا۔ سب گاڑی پکڑنے کے لیے علی الصبح تیار ہو کر اکٹھے ہوئے لیکن اقبال ندارد۔ گاڑی کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ فقط اقبال کا انتظار تھا۔ اتنے میں ایک خادمہ چلاتی ہوئی آئی اور کہا کہ نہ جانے ہیرٔ پروفیسر اقبال کو کیا ہو گیا ہے۔ سب سراسیمگی کے عالم میں اُن کے کمرے کی طرف دوڑے، کمرے میں بتی جل رہی تھی، اقبال کے سامنے دو چار کتابیں میز پر کھلی پڑی تھیں اور دنیا و مافیہا سے بے خبر سکتے کے عالم میں بیٹھے خلا میں گھور رہے تھے۔ فراؤ پروفیسر ہیرن بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ انھوں نے عطیّہ فیضی سے پوچھا کہ کیا کیا جائے۔ عطیّہ فیضی نے اقبال کا نام لے کر انہیں پکارا، مگر کوئی جواب نہ ملنے پر اُن کو شانے سے جھنجھوڑتے ہوئے اُردو میں کہا کہ خدارا اُٹھیے، آپ جرمنی کے سیدھے سادے شہر میں ہیں۔ یہ ہندوستان نہیں، جہاں ایسی کیفیت کو باآسانی قبول کیا جا سکے۔ رفتہ رفتہ اقبال نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ کہنے لگے کہ مَیں رات دیر تک کچھ کتابیں پڑھتا رہا اور اس اثناء میں مجھے محسوس ہوا کہ میرا شعور میرے جسم سے الگ ہو گیا ہے۔ شعور کے یوں بلاجسم بھٹکنے سے مَیں سخت پریشانی کے عالم میں تھا کہ آپ نے مجھے جگا دیا۔

چوتھے روز بجلی کی ریل میں بیٹھ کر سب پہاڑ کی چوٹی پر واقع کونگ اشٹال پر پہنچے۔ اقبال ہر ایک پر مزاحیہ اشعار موزوں کرنے لگے جو جرمنوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ان کے مطالب پوچھنے پر اقبال نے کہا کہ مَیں آپ کو آفاقی زبان میں حکم دیتا ہوں کہ ایک جادو کا دائرہ بنائیں اور ہمیں فرشتوں کا نغمہ سنائیں۔ اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور کسی جرمن آپیرا کا حصہ تمثیلی انداز

میں گایا گیا۔ اس کے بعد سب پیدل چلتے کو ہلوف گئے جو تین میل دور تھا، کچھ وقت ڈھلے تھکے ہارے ہائیڈل برگ پہنچے۔ پانچویں روز ریل میں سوار ہو کر شمال کی سمت نکل گئے اور ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس مقام پر پہنچے جہاں کوئی تاریخی باغ ہے، جس میں ہر مذہب کی عبادت گاہیں موجود ہیں، یونانی مجسمے ہیں، آبشاریں، تالاب، پھل دار درخت اور انواع و اقسام کے پرندے ہیں۔ اسی باغ میں ایک دلکش مسجد بھی تھی، جس کی دیواروں پر شاید چند آیات کندہ تھیں۔ ہر کوئی ان تحریروں کے مطالب جاننے کے لیے بے قرار تھا۔ اقبال نے نہایت متانت سے ان عربی عبارتوں کو پڑھا اور پھر کہنے لگے کہ جس شاہ نے یہ عظیم الشان باغ بنوایا تھا، اسے اتفاق سے ایک حور مل گئی، جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن حور صرف اسی شرط پر اس کی ملکہ بننے کے لیے تیار ہوئی کہ وہ اسلام قبول کرے اور ایک مسجد تعمیر کرائے اور اُن کا نکاح اسی مسجد میں پڑھا جائے۔ چنانچہ شاہ نے اس کی بات مان لی اور مسجد کی تعمیر کا حکم دیا اور یہیں اُن کا نکاح پڑھا گیا۔ اقبال نے یہ سارا افسانہ ایسی سنجیدگی اور خوش اسلوبی سے سنایا کہ سب اس کو حقیقت سمجھے۔

چھٹے روز پھر سب ہنستے ہنساتے، گاتے، کھاتے ریل میں بیٹھ کر کسی پہاڑ کی چوٹی پر جرمن دیہاتیوں کے لوک ناچ دیکھنے پہنچ گئے۔ اس چوٹی پر پھلوں کے باغ میں کسی پرانے قلعے کے کھنڈر تھے۔ سارا دن رنگ برنگے لباس پہنے دیہاتیوں کے رقص دیکھتے گزرا۔ ساتویں روز عطیہ فیضی، اقبال کے ساتھ میونخ گئیں۔ ایک دو دن وہیں گزارے۔ اقبال نے انہیں کلیسا، عجائب گھر، محلات، باغات، آرٹ گیلریوں اور کتب خانوں کی سیر کرائی۔ میونخ اقبال کو بے حد پسند تھا اور وہ اسے ''جزیرہ مست'' کہتے تھے۔ شام کو پروفیسر ران کے گھر پہنچے اور کھانا وہیں کھایا۔ فراؤلین ران نے انہیں پیانو پر جرمن کلاسیکی موسیقی کے کچھ ٹکڑے سنائے۔ فراؤلین ران نے عطیّہ فیضی کو بتایا کہ چند ماہ کی قلیل مدت میں جتنی جلد اقبال نے جرمن زبان سیکھی ہے، اتنی جلدی کوئی نہیں سیکھ سکتا۔ بالآخر دونوں ہائیڈل برگ واپس پہنچے۔

تقریروں کا سلسلہ

جرمنی سے واپسی کے بعد علاّمہ اقبال اپنے اُستاد پروفیسر طامس آرنلڈ کی جگہ یونیورسٹی کالج لندن میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ پروفیسر آرنلڈ چند ماہ کی رُخصت پر مصر گئے

تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال کچھ عرصہ تقریروں کے مشغلے میں منہمک ہو گئے تھے، لیکن بعد میں اسے بالکل ترک کر دیا۔ کہا (انبیاء اور مصلحینِ اقوام کو چھوڑ کر) جو لوگ بے ضرورت اٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں، اُن میں روحانیت کا فقدان ہو جاتا ہے۔ اپنے امتحانوں سے فارغ ہو کر انھوں نے اسلام پر چھ پبلک لیکچر دیے۔ ۱۰ر فروری ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں کہ:

''انگلستان میں مَیں نے اسلامی مذہب وتمدّن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے، دوسرا اسلامی تصوّف پر فروری کے تیسرے ہفتے میں ہوگا۔ باقی لیکچروں کے مضامین یہ ہوں گے:

مسلمانوں کا اثر تہذیب یورپ پر، اسلامی جمہوریت، اسلام اور عقلِ انسانی وغیرہ۔'' علّامہ اقبال کے یہ لیکچر بہت مقبول ہوئے اور ان سے آپ کی مذہبی تحقیقات کی دھوم مچ گئی۔

۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں انقلاب بپا ہو رہا تھا (جس کی بدولت عبدالحمید ثانی ۲۸/ اپریل ۱۹۰۹ء کو معزول ہوئے اور ترکی میں جمہوری حکومت قائم ہوئی) اقبال نے لندن کے رسالہ ''سوشیالوجیکل ریویو'' میں ایک فاضلانہ مضمون ''اسلام اور خلافت'' تحریر کیا، جس میں بتایا کہ جمہوریت اسلام اور آئین انتخاب خلیفہ مذہب و سیاست مشترک اور واحد مطمحِ نظر ہے۔ اس مضمون کا اردو ترجمہ منشی محمد الدین فوق مرحوم کی فرمائش پر اقبال کی اجازت سے چودھری محمد حسین ایم۔ اے نے ۱۹۳۳ء میں کیا، جو ''خلافت اسلامیہ'' کے نام سے ایک کتابچے کی صورت میں چھپا۔

اقبال نے جرمنی سے واپس آ کر لندن کے اپنے تقریباً ۹ ماہ کے اس قیام میں مسلم طلبہ کی اجتماعی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ مرزا جلال الدین کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے قیامِ لندن کے دوران وہاں پین اسلامک سوسائٹی کے نام سے ایک نیم سیاسی انجمن قائم کر رکھی تھی، سر عبداللہ سہروردی جس کے جنرل سیکرٹری اور سر سلطان احمد اور مرزا جلال الدین دونوں جائنٹ سیکرٹری تھے۔ سر عبدالقادر بیان کرتے ہیں کہ اقبال جب کیمبرج سے لندن آتے تو بعض اوقات وہ دونوں علمی مجالس میں اکٹھے شریک ہوتے تھے۔

اقبال نے اس دور (۱۹۰۸-۱۹۰۵) میں کل چوبیس نظمیں اور سات غزلیں کہیں، جو

''بانگ درا'' کے حصہ دوم کی زینت ہیں۔ ان نظموں میں سے بعض میں تو، جو کیمبرج یا ہائیڈل برگ میں قیام کے دوران لکھی گئیں، مناظرِ فطرت کی عکاسی ہے، حسن و عشق اور عاشقِ ہرجائی، میں عشقِ مجازی کی جھلک ہے اور وہ نسوانی حسن سے متاثر ہو کر یا یورپ کے خصوصی ماحول میں اپنی بے وفائی کو وفا سے بہتر قرار دیتے ہوئے کہی گئی ہیں۔ وطنی قومیّت کا جذبہ گو یورپ میں بھی موجود تھا لیکن رفتہ رفتہ ملّتِ اسلامیہ یا اس کے تحت عالمی اخوّت کا جذبہ فوقیت حاصل کر رہا تھا۔ فلسفہ اور تصوّف میں ابھی تک اقبال کے ذہن پر وحدت الوجود کا غلبہ تھا۔ گو قلب اس سے مطمئن نہ رہا تھا۔ اِن نظموں میں تین تو کسی نہ کسی طرح کے پیام سے متعلق ہیں۔ مثلاً ''پیام طلبہ علی گڑھ کالج کے نام''، ''پیام عشق'' اور ''پیام''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال میں یہ احساس فروغ پا رہا تھا کہ با مقصد شاعری کو پیغمبری کا جزو ہونا چاہیے۔ ایک غزل اور ایک نظم تو خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں۔ غزل مارچ ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی۔ اور مغرب و مشرق کے لیے پیش گوئیوں سے لبریز ہے۔ نظم ''عبدالقادر کے نام'' ہے، جس میں قوم و ملک کے اندازِ فکر میں انقلاب لانے کی خاطر ایک طرح کی دعوتِ شعلہ نوائی دی گئی ہے۔ ''صقلیہ''، وطن واپسی کے وقت سمندری سفر کے دوران کہی گئی ہے۔ جب ان کا جہاز جزیرۂ سسلی کے قریب سے گزر رہا تھا۔

عیسائی مبلغ

ایک دفعہ اقبال اپنا فارغ وقت گزارنے کے لیے چند دنوں کے لیے اپنے انگریز دوست کے ہمراہ اس کے گاؤں گئے۔ خود فرماتے ہیں:

''جب مَیں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو تعطیلات کے زمانے میں کچھ دنوں کے لیے مَیں اپنے ایک ہم سبق انگریز دوست کے ہمراہ اس کے گاؤں چلا گیا۔ اس کا گھر سکاٹ لینڈ کے ایک دور افتادہ قصبے میں تھا۔ مجھے وہاں گئے چند روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا ایک مشنری، جو ہندوستان سے آئے ہیں، آج شام قصبے کے اسکول میں لیکچر دیں گے اور بتائیں گے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو کس قدر فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ مَیں اور میرے میزبان دونوں لیکچر سننے کے لیے پہنچے۔ سامعین میں عورتیں اور مرد کافی تعداد میں تھے۔ مشنری نے بتایا کہ ہندوستان میں تیس کروڑ انسان آباد ہیں، لیکن ان لوگوں کو انسان کہنا جائز نہیں۔ عادات و خصائل اور بود و باش کے اعتبار سے یہ لوگ انسانوں سے بہت پست اور حیوانوں سے کچھ اوپر ہیں۔ ہم نے سالہا

سال کی جدوجہد سے ان حیوان نما انسانوں کو تھوڑی بہت تہذیب سے آشنا کیا ہے۔ لیکن کام وسیع اور اہم ہے۔ آپ ہمارے مشن کو دل کھول کر چندہ دیجیے تاکہ اس عظیم الشان مہم میں، جو ہم نے بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے جاری کر رکھی ہے، زیادہ سے زیادہ کامیابی ہو۔ یہ کہہ کر مشنری نے میجک لینٹرن (Magic Lantern) سے سامنے لٹکے ہوئے پردے پر ہندوستانیوں کی تصویریں دکھانا شروع کیں۔ ان میں بھیل، گونڈ، دراوڑ اور اڑیسہ کے جنگلوں میں بسنے والی قوم کے نیم برہنہ افراد کی نہایت مکروہ تصاویر تھیں۔

جب لیکچر ختم ہو گیا تو مَیں نے کھڑے ہو کر صدرِ جلسہ سے کچھ کہنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے بخوشی اجازت دے دی تو مَیں نے کھڑے ہو کر جوش سے پچیس منٹ تقریر کی۔ مَیں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ مَیں خالص ہندوستانی ہوں۔ میرا خمیر اسی ملک کی سرزمین سے اٹھا ہے۔ آپ میری وضع قطع، رنگ روپ، چال ڈھال دیکھ لیجیے۔ مَیں آپ لوگوں کی زبان میں اسی روانی سے تقریر کر رہا ہوں جس روانی سے مشنری صاحب نے بزعمِ خود حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ مَیں نے ہندوستان میں رہ کر تعلیم حاصل کی ہے۔ اب مزید تعلیم کے لیے کیمبرج میں آیا ہوں۔ آپ میری شکل وصورت دیکھ کر اور میری باتیں سن کر خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ مشنری صاحب نے ہندوستان کے باشندوں کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کہاں تک درست ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان مشرقی دنیا کا ایک متمدن ومہذب ملک ہے، جس نے صدیوں تک تہذیب اور علم کی شمع بلند رکھی ہے۔ اگرچہ ہم سیاسی طور پر انگلستان کے غلام ہو گئے ہیں، لیکن ہمارا اپنا ادب ہے، اپنا تمدّن ہے، اپنی قومی روایات ہیں، جو کسی طرح مغربی قوموں کی روایات سے کم شاندار نہیں ہیں۔ مشنری صاحب نے محض آپ کے جذبات کو برانگیختہ کر کے آپ کی جیبیں خالی کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی یہ گھناؤنی اور خوفناک تصویر پیش کی ہے...... جونہی میری تقریر ختم ہوئی۔ جلسے کا رنگ بالکل بدل گیا۔ سب لوگ میرے ہم خیال ہو گئے اور مشنری صاحب کو حد درجہ مایوس ہو کر وہاں سے خالی ہاتھ نکلنا پڑا''۔

انگلستان سے واپسی

اقبال ۳/جولائی ۱۹۰۸ء کو انگلستان سے وطن روانہ ہوئے۔ واپسی پر جب اُن کا جہاز اٹلی کے جزیرہ سسلی کے ساحل کے قریب سے گزرا تو ان کے دل میں کچھ اور ہی جذبات موجزن

تھے۔اب وہ سسلی کو ماضی کی سرزمین کے طور پر نہیں بلکہ تہذیب حجازی کے مزار کی صورت میں دیکھ کر رو دیے تھے اور اشعار کی صورت میں اس طرح اظہار کیا:

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خُوں نابہ بار! — وُہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرانشینوں کا کبھی — بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے — بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں — تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ، مَیں بھی سراپا درد ہوں — جس کی تُو منزل تھا، مَیں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے! — قصّہ ایّام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے!

مَیں ترا تحفہ سُوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

دہلی آمد

اقبال بمبئی سے لاہور آتے ہوئے ۲۵ رجولائی کی رات کو دہلی پہنچے۔احباب اسٹیشن پر اُن کا استقبال کرنے کی خاطر آئے ہوئے تھے۔ اگلے روز درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہ پر سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ وہاں اقبال کی شمعِ کمال کے چند پروانے بھی جمع ہو گئے۔اس بزم کے حاضرین میں خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر مدیرِ مخزن، مولوی محمد عبدالرشید الخیری، میر غلام بھیک نیرنگ اور سید جالب دہلوی خصوصیّت سے قابل ذکر ہیں۔اس مرتبہ اقبال نے مندرجہ ذیل نظم پڑھی جو آپ نے ۱۹۰۳ء میں اس وقت لکھی تھی جب ان کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد سب ڈویژنل انجینئر ملٹری ورکس بلوچستان ایک مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے اور اقبال نے یہ نظم لکھ کر کسی دوسرے کی معرفت دعا کی خاطر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں بھجوائی تھی۔ یہ نظم تین بند کی ہے اور علاّمہ کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ البتہ ''باقیاتِ کلیات شعر اقبال'' میں موجود ہے:

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے — طور در آغوش ہیں ذرّے تری درگاہ کے
مَیں تری درگاہ کی جانب جو نکلا لے اڑا — آسماں تارے بنا کر میری گرد راہ کے

شانِ محبوبی ہوئی ہے پردہ دارِ شانِ عشق   ہائے کیا رتبے ہیں اس سرکارِ عالی جاہ کے
رنگ اس درگہ کے ہر ذرے میں ہے توحید کا   طائران بام بھی طائر ہیں بسم اللہ کے
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا اثبات نفیٔ غیر میں   ''لا'' کے دریا میں نہاں موتی ہیں ''الا اللہ'' کے
میرے جیسے بے نواؤں کا بھلا مذکور کیا   قیصر و فغفور درباں ہیں تری درگاہ کے

محوِ اظہارِ تمنائے دل ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ مَیں اقبالؔ کا ہم نام ہوں

(اقبال، حضرت محبوب الٰہی کے ایک خادم کا بھی نام تھا)۔

سارا دن درگاہ ہی میں گزارا۔ احباب میں نیرنگ اور مقبول احمد نظامی نے اُن کی آمد کی خوشی میں نظمیں پڑھیں، قوالی کا لطف بھی اٹھایا۔ خواجہ حسن نظامی میر مجلس تھے۔ شام کو مرزا غالب کی قبر پر گئے اور فاتحہ پڑھی۔

لاہور میں استقبال

۲۷ / جولائی ۱۹۰۸ء کو پیر کے روز شام کے وقت گاڑی دہلی سے لاہور پہنچی۔ اسٹیشن پر شاندار استقبال ہوا۔ وقتِ مقررہ سے پہلے ہی اقبال کے احباب جن میں ہندو، مسلمان، سکھ بلا تخصیصِ مذہب و ملّت شامل تھے۔ وہاں موجود تھے۔ اقبال کا پلیٹ فارم پر قدم رکھنا تھا کہ پھولوں کی بارش شروع ہوگئی۔ اسٹیشن کے اندر اور باہر نوجوانانِ لاہور کا خاصا ہجوم تھا۔ عوام کے علاوہ اکثر بیرسٹر، وکیل، انجمنوں کے عہدیدار، اخباروں کے مدیر اور دیگر رؤسائے شہر موجود تھے۔ اقبال نہایت خندہ پیشانی سے سب کو ملے۔ مزاج میں ولایت والوں کی سی کوئی رعونت نہ تھی۔ جو سادگی اور خلوص آج سے تین سال قبل تھا، وہی اب بھی نظر آیا۔ ریلوے اسٹیشن سے تمام احباب بھاٹی دروازے کے باہر باغ میں آئے جہاں اقبال کے دوست شیخ گلاب دین وکیل چیف کورٹ پنجاب و مؤلف قانون شریعت و رواج نے شاندار ضیافت کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ خان بہادر میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء نے آپ کی قابلیت کی تعریف میں تقریر کی اور منشی غلام علی خان غلامی (خوش نویس پیسہ اخبار) اور منشی اللہ یار جوگی نے خیر مقدم میں نظمیں پڑھیں۔ یہ نظمیں اگست ۱۹۰۸ء کے ''کشمیری میگزین'' میں پوری آب و تاب کے ساتھ شائع

ہوئیں۔ چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

کدھر ہے کیفِ مسرت مجھے سنبھال سنبھال   کہ ہو کے آئے ولایت سے ڈاکٹر اقبال
خدا کے فضل سے کی ہیں وہ ڈگریاں حاصل   کہ اس زمین میں جن کا ہے اندراج محال
تھی حاجت ایسے ہی لیڈر کی اہلِ خطّہ کو   جواں خیال، جواں سال اور جواں اقبال

گئے وہ دن کہ جو کہتے تھے اب مٹی یہ قوم
اُڑا وہ رنگ جو سنتے تھے اب گرے پَر و بال

(منشی اللہ یار جوگی)

آمدِ اقبال ہے جشنِ طرب گھر گھر ہوا   اوج پر ہے آج پھر لاہور کا اختر ہوا
دوست اور احباب خرم ہیں ترے دیدار سے   جب کہ تو مثلِ ہلال عید جلوہ گر ہوا
ڈگریاں پا کر ولایت سے تو آیا کامیاب   فلسفے میں خاص کر بیکن کا تو ہمسر ہوا

فاضلانِ دہر میں پایا ہے تو نے امتیاز
کامیابی کا قلعہ ہمت سے تیری سر ہوا

(منشی غلام علی خاں غلامی)

ان کے علاوہ مولانا حامد حسن قادری، منشی نذر محمد اور بدرالدین قیصری نے بھی ان کی آمد کی خوشی میں نظمیں پڑھیں۔

سیالکوٹ آمد

اس تقریب سے فراغت کے بعد اسی دن شام کی گاڑی سے اقبال سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔ سیالکوٹ میں بھی ان کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ پلیٹ فارم استقبال کرنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اقبال کے والد، بھائی اور دیگر اعزہ واحباب موجود تھے۔ شیخ اعجاز احمد اس وقت ساڑھے نو برس کے تھے اور اپنے والد (شیخ عطا محمد) کے ساتھ وہاں گئے ہوئے تھے۔ ہار اتنی کثیر تعداد میں پہنائے گئے کہ اقبال کا چہرہ پھولوں میں چھُپ گیا۔ بڑی مشکل سے اسٹیشن سے نکل کر گھر پہنچے اور اپنی ماں سے، جو گزشتہ تین سال سے اُن کے لیے چشم براہ تھیں، لپٹ گئے۔

اقبال جو اُس وقت ڈاکٹر علاّمہ محمد اقبال بن چکے تھے۔ اور جن کا شہرہ چہار دانگِ عالم میں پھیل چُکا تھا۔ مگر اپنی والدہ کے لیے اب بھی ''بالا'' ہی تھے۔ اور اقبال واقعی اُن کے پاس جا کر بالکل ''بالا'' بن جاتے تھے اسی لیے تو اقبال کہتے ہیں:

زندگی کی اَوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

علی گڑھ کی پیشکش

گھر پہنچتے ہی آپ کو علی گڑھ کالج کی پروفیسری کی پیشکش آ گئی مگر آپ نے بیرسٹری میں کمال کرنے کے شوق میں اسے قبول نہ کیا۔ اس پر روزنامہ پیسہ اخبار اور دوسرے اخباروں میں بیشمار مضامین اور مراسلے شائع ہوئے، جن میں قومی کالج کی اس خدمت سے انکار پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ بعض دوستوں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے ۲۹/اگست ۱۹۰۸ء کو سیالکوٹ سے اپنے دوست منشی محمد الدین فوق کو لکھا:

''آپ کا نوازش نامہ مجھے کل ملا۔ مَیں ایک دو روز کے لیے بغرض مشورہ لاہور گیا تھا کیونکہ وہیں کام شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ ''کشمیری میگزین'' دیکھتا ہوں۔ اس میں جو کامیابی آپ کو ہوئی اور ہو رہی ہے اس کے لیے مبارک باد دیتا ہوں اور جو کچھ آپ گاہے گاہے میری نسبت اپنے کالموں میں تحریر فرماتے ہیں، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں''۔

لاہور واپسی

چند روز سیالکوٹ میں قیام کر کے اقبال لاہور تشریف لے آئے۔ انگلستان جانے سے قبل آپ بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں کے ایک مختصر سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ جو اب بھی موجود ہے اور اس پر محکمہ آثارِ قدیمہ نے تختی لگا دی ہے مگر اس دفعہ آپ نے پہلے موہن لعل روڈ پر جواب اُردو بازار کہلاتا ہے ایک کوٹھی میں اقامت اختیار کی۔ پھر انارکلی کی ایک بیٹھک کرائے پر لی۔ وہاں سے میکلوڈ روڈ (جہاں آجکل اقبال اکادمی ہے) پر آئے اور آخری عمر میں میو روڈ پر (جواب علاّمہ اقبال روڈ کہلاتی ہے) اپنی کوٹھی ''جاوید منزل'' تعمیر کرائی اور اس میں آخری دم تک رہے۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر وکالت کو اقبال کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت

حاصل نہ ہوسکی۔ کیونکہ وہ اپنا دماغی بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ کام ہی نہیں لیتے تھے۔ اُن کی زندگی کی ساری پونجی ان کا حیات افروز کلام ہے جسے وہ عمر بھر لٹاتے اور ٹھکانے لگاتے رہے:

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر　　　اسی سے فقیری میں ہوں مَیں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے　　　لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

☆☆☆

باب:۲

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (امرتسر) میں شرکت

علاّمہ اقبال ۱۹۰۸ء میں برطانیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے جب وطن واپس آئے تو انجمنِ کشمیری مسلمانان نے انھیں اپنا جنرل سیکرٹری بنا دیا۔ جبکہ انجمن کے صدر جناب خان بہادر خواجہ اللہ بخش، نائب صدور میاں شمس الدین رئیس، میونسپل کمشنر خواجہ کریم بخش اکاؤنٹنٹ، میاں نظام الدین رئیس، خواجہ کمال الدین بی۔ اے وکیل شیخ محمد کاظم، سید محمد شاہ وکیل، حاجی میر شمس الدین، ڈاکٹر محمد الدین ناظر تھے۔ منشی حیدر محمد (برادر کلاں شیخ دین محمد) جائنٹ سیکرٹری، منشی محمد الدین فوق اسسٹنٹ سیکرٹری اور منشی معراج الدین فنانشل سیکرٹری تھے۔

۲۷، ۲۸ اور ۲۹ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا۔ آنریبل نواب بہادر خواجہ محمد سلیم اللہ خاں سی۔ ایس- آئی کے۔ سی۔ ایس- آئی نواب آف ڈھاکہ اس کے صدر تھے۔ چونکہ وہ بھی کشمیری تھے اس لیے اہل خطہ برادری کے بہت سے بزرگ شوق ملاقات میں پنجاب کے مختلف شہروں سے کھنچ کر امرتسر پہنچے۔ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور نے نواب صاحب کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۲۷ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو ایک وفد غیر رسمی طور پر ایڈریس کا وقت مقرر کرنے کے لیے سرکٹ ہاؤس امرتسر میں حاضر ہوا۔ اس وفد میں خان بہادر خواجہ اللہ بخش، مولوی احمد دین وکیل، خواجہ رحیم بخش ای۔ اے۔ سی، خواجہ امیر بخش، حاجی میر شمس الدین جنرل سیکریٹری انجمن حمایت اسلام، منشی غلام محمد خادم، منشی محمد الدین فوق بابو غلام حسن اور بابو حیدر محمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خان بہادر اللہ بخش نے ہر ایک کا تعارف کرایا اور حاضری کی علت غائی بیان کی۔ نواب صاحب نے دستِ شوق بڑھا کر ہر ایک سے مصافحہ کیا اور وفد سے ملنے کے لیے ۲۸ر دسمبر کی

شام کا وقت مقرر کیا۔ چنانچہ دوسرے روز سیالکوٹ، امرتسر راولپنڈی، گوجرانوالہ، سرگودھا، لائل پور، لدھیانہ، گورداسپور، وزیرآباد، ڈیرہ غازی خان، جیکب آباد، سندھ وغیرہ مقامات کے نمائندوں کا ایک وفد وقتِ مقررہ پر سرکٹ ہاوس امرتسر میں پہنچا۔ اقبال اس وفد میں شامل تھے۔ انھوں نے نہایت بلند آواز سے فارسی زبان میں سپاس نامہ پڑھا جو پہلے سے طبع شدہ تھا اور جس کا ابتدائی مسودہ ڈاکٹر محمد دین ناظر مرحوم نے تیار کیا تھا۔

اس سپاس نامے میں نواب صاحب کے خیر مقدم کے بعد ترکِ کشمیر کا تذکرہ تھا اور پھر لکھا تھا کہ کشمیری قوم نے باوجود اجنبی ہونے کے علوم وفنون اور حصولِ مراتب و وجاہت میں وہ کوشش کی ہے کہ مقامی اقوام ان کی ذہانت اور طباعی دیکھ کر دنگ رہ گئی ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے قومی بھائیوں یعنی اہلِ خطہ مسلمانانِ پنجاب کی سرپرستی قبول فرمائیں تاکہ جمعیت قومی کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور ہماری ضروریات قومی اور حفاظت حقوق کی کوششیں جاری رہ سکیں۔

یہ سپاس نامہ چونکہ نایاب ہے اس لیے اقبال کی ایک یادگار سمجھ کر یہاں درج کیا جاتا ہے:

''الحمد للہ امروز ساعت سعید بل روز عید کہ ما اہل خطہ از مختلف مقامات صوبہ پنجاب بخدمت اقدس برائے خیر مقدم جناب والا حاضر شدیم واز شرف ملاقات مشرف گشتیم:

اے آمدنت باعث آبادی ما
ذکر تو بود زمزمہ شادی ما

پوشیدہ نیست کہ اسلاف ما بغرض سیر و سیاحت و ترقی تجارت وحصولِ روزگار راہ غربت گرفتند و از قطعہ جنت نظیر خویش الفراق نمودہ دریں ملک ہندوستان بہ مقامات مختلفہ اقامت درزیدند و در صورت اجنبی زندگانی می کردند- ہنگامیکہ آفتاب اقبال مغربیہ بہ ہندوستان طلوع نمود اقوام مختلفہ ایں دیار از علوم مغربیہ بہرہ اندوز گشتند۔ دراں زمان ایں بزرگان خطہ باوجود مشکلات مہاجرت دراں راہ قدم نہادند وافتان وخیزاں خویشتن را بجائے رسانیند کہ امروز باعتبار علوم وفنون و حصول مراتب و وجاہت دنیویہ واداۓ فرائض دینیہ و بہ نظر تہذیب اخلاق و خیر خواہی دولت انگلشیہ درصف اقوام ترقی یافتہ با گرفتند- ازاں جا کہ اہل خطہ را از فضل ایزد منان در ملک

ہندوستان جمعیت قومی بحصول پیوستہ کشمیریان صوبہ پنجاب بہ کمال آرزومندی برائے قبولیت عہدہ پیٹرن بحضور والاعرض رسان اند وامیدوارند کہ جناب والا ز منظوری ایں درخواست جملہ برادران خطہ را مشکور وممنون سازند و در انصرام ضروریات قومی وحفاظت حقوق اہلِ خطہ بیشتر از بیشتر سعی فرمایند۔

ما از ان خیر خواہی دولت برطانیہ کہ از طریق عمل جناب ظاہر وثابت شدہ است ومی شود ہر خودمی نازیم:

از بیم جان و مال ہراساں نہ گشتہ ای
این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

گورنمنٹ عالیہ کے از راہ الطاف خسروانہ اعزاز بزرگ یعنے عہدہ ممبر کونسل ہاے جناب والا صفات را عطا فرمودہ است، ما اہلِ خطہ شکریہ ایں نعمت ادا کردن نمے توانیم و بدرگاہ خداوند کریم دعا مے کنیم کہ حکومت برطانیہ را بر جادہ مستقیم برقرار دارد:

ایں دعا اما و از جملہ جہان آمین آباد''

ترجمہ: ''الحمد للہ آج اتنی مبارک گھڑی بلکہ روزِ عید ہے کہ پنجاب صوبہ کے مختلف مقامات سے ہم اہلِ خطہ جنابِ والا کے خیر مقدم کے لیے حاضر ہوئے ہیں اور شرفِ ملاقات سے مشرّف ہوئے ہیں۔

اے آمد نت باعث آبادئ ما
ذکر تو بود زمزمۂ شادئ ما

(اے کہ آپ کا آنا ہمارے گھر کے لیے باعثِ برکت ہوا اور آپ کی گفتگو ہمارے لیے شادی کی شہنائی ثابت ہوئی)

یہ رازِ مخفی نہیں کہ ہمارے اجداد سیر و سیاحت، تجارت میں ترقی اور حصولِ روزگار کے واسطے پردیس میں جاتے رہے اور انھوں نے اپنے جنت نظیر خطے سے جدائی اختیار کر کے ملکِ ہندوستان کے مختلف مقامات پر رہنا اختیار کیا اور اجنبی ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں۔ آج کل انگریزی کے عروج کا آفتاب ہندستان میں جلوہ گر ہے اور یہاں قیام پذیر مختلف اقوام کے لوگ علومِ مغرب سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ اس زمانہ میں خطہ کے بزرگ ہجرت کی مشکلات کے باوجود اس راہ پر قدم رکھتے ہیں اور عصرِ حاضر کے علوم کے حصول کے لیے منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں کیونکہ اسی دور میں علوم وفنون اور دنیاوی مراتب و وجاہت کا حصول اور اپنی فرائض کی

ادائیگی اور تہذیب و اخلاق کا حصول انگریز حکومت کی خیر خواہی کی بدولت ہی ممکن ہے اور وہ اس طرح ترقی یافتہ اقوام کی صف میں جگہ حاصل کرتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملک ہندستان کے صوبہ پنجاب کے کشمیری اکٹھے ہوئے ہیں اور ان کی آرزو کا کمال یہ ہے کہ وہ حضور والا سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کا سرپرست بننا قبول کر لیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ تمام برادرانِ خطہ کو یہ عہدہ قبول کر کے مشکور و ممنون فرمائیں اور قومی ضروریات کے ساتھ ساتھ اہلِ خطہ کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش فرمائیں۔

حکومتِ برطانیہ پر آپ کے طرزِ عمل کی خیر خواہی ظاہر و ثابت ہے اور آپ کی اس پذیرائی پر ہم فخر کرتے ہیں۔

از بیم، جان و مال ہراساں نہ گشتہ ای
ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

(آپ جان و مال کی آزمائش سے ہراساں نہیں ہوئے آپ نے یہ کام کیا ہے اور قابلِ فخر لوگ ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔)

حکومتِ برطانیہ نے الطافِ خسروانہ سے آپ کو ممبر کونسل کا رتبہ عطا فرمایا ہے۔ ہم اہلِ خطہ اس نعمت کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے اور اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں دعا گو ہیں کہ حکومتِ برطانیہ آپ کو اس جادۂ ترقی پر برقرار رکھے۔''

نواب صاحب نے اس سپاس نامے کا جواب انگریزی میں دیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

''صاحبو! نہیں نہیں بھائیو! مَیں آپ کے سپاس نامے اور ملاقات سے بہت خوش ہوا۔ مَیں اس وقت اپنے بھائیوں کے درمیان ہوں اور ان کی ہر خدمت کے لیے جو مجھ سے ممکن ہے حاضر اور تیار ہوں۔ آپ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ مَیں آپ کی قومی انجمن کا پیٹرن (مربی) بنوں۔ مَیں ہر چند اس قابل نہیں لیکن آپ کی خوشی کو مدنظر رکھ کر آپ کی خواہش منظور کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ میری قوم حکومت کی وفادار اور جاں نثار ہے۔''

ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ صدارت میں نواب صاحب نے اعزاز صدارت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

''اگرچہ میری حالتِ صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ مَیں اتنی دور کا سفر اختیار کروں اور اس شان دار مجمع میں شریک ہوں مگر آپ حضرات کے اخلاص نے مجھے مجبور کیا اور ڈھاکہ سے یہاں تک

کھینچ لیا۔ ڈھاکہ امرتسر سے سینکڑوں منزل پر واقع ہے۔ مگر مَیں یقین کرتا ہوں اور یقین کرنے کے لیے کافی وجوہ میرے پاس موجود ہیں کہ مَیں اپنے وطن میں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ امرتسر کی آبادی پنجاب میں بہ لحاظ کشمیری آبادی کے بہت زیادہ ہے اور اپنے خواص اور پیداوار اور صنائع کے اعتبار سے ثانی سرینگر ہے اور شاید آپ حضرات واقف ہوں گے کہ مَیں کشمیری الاصل ہوں۔ اس حیثیت سے اپنے موجودہ وطن سے جس قدر آگے بڑھوں گا اصلی وطن یعنی کشمیر مجھ سے قریب تر ہوتا جائے گا۔''

اقبال کی تحریک سے نواب صاحب نے ۵رفروری ۱۹۰۹ء کو وائسر لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں حکومت ہند سے یہ سوال بھی پوچھا کہ ''آیا کشمیری فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہو سکتے ہیں تو آج کل کتنے کشمیری سرکاری فوجوں میں ہیں؟ نیز امرتسر اور سرحد کشمیر پر جو کشمیری آباد ہیں کیا وہ پنجاب کے قانونِ انتقالِ اراضی کی تعریف میں شامل ہیں یا نہیں۔''

اس سوال کے جواب میں لارڈ کچنر نے حکومت ہند کی طرف سے کہا کہ ''کشمیری قوم کے فوج میں بھرتی ہونے پر کوئی روک ٹوک نہیں مگر رجمنٹوں میں چونکہ ان کی کلاس کمپوزیشن نہیں یعنی کوئی کمپنی پلٹن میں یا کوئی ٹروپ رسالے میں کشمیریوں کے لیے مخصوص نہیں اس لیے ہندوستانی فوج میں کوئی کشمیری بھرتی نہیں ہوتا۔''

اسی طرح مسٹر ملز نے حکومت کی طرف سے جواب دیا کہ ''جو کشمیری امرتسر اور حدود کشمیر میں رہتے ہیں، پنجاب کے قانون انتقال اراضی کی رو سے ان پر کچھ خراب اثر نہیں پڑا۔ پنجاب میں کاشت کار قوم مشتہر ہونے کے لیے کشمیریوں کو حکومت پنجاب سے درخواست کرنی چاہیے۔ پنجاب گورنمنٹ کو حکومت ہند سے دریافت کیے بغیر ہر قوم کو کاشت کار مشتہر کر دینے کا اختیار ہے۔

اس سلسلے میں اقبال کے کئی مراسلے اس وقت کے اخباروں میں نظر آتے ہیں جن کے ذریعے سے فوجی بھرتی اور حصولِ اراضی کی ضرورت اور اہمیت برادری اور حکام دونوں پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ایک مراسلے کا مضمون ملاحظہ ہو:

برادر مکرم و معظم! السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ، آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ہمارے مربی و محسن جناب نواب سر آنریبل خواجہ محمد سلیم اللہ صاحب نواب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، سی۔ آئی۔ ای نواب ڈھاکہ سے ۵رفروری ۱۹۰۹ء کی وائسریگل کونسل میں کشمیریوں کے متعلق فوج اور

زمینداری کی بابت سوالات پیش کیے تھے۔ فوج کے متعلق تو لارڈ کچنر صاحب بہادر کمانڈر انچیف افواج ہند نے فرمایا کہ کشمیری مسلمانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اگرچہ کشمیریوں کی کوئی کمپنی یا سکواڈرن علیٰحدہ موجود نہیں۔ اس امر کے متعلق انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور علیحدہ کوشش کر رہی ہے۔ مگر فی الحال مَیں آپ کی توجہ دو سوالوں کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں۔ زراعت پیشہ اقوام کے متعلق جو جواب نواب صاحب کے سوال کا دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ لوکل گورنمنٹ جس قوم کو مناسب سمجھتی ہے اقوام بندی زمینداری میں شامل کر لیتی ہے۔ گورنمنٹ پنجاب کو ہی دونوں سوال اور جواب زمینداری کے متعلق حضور وائسرائے بہادر نے بھیج دیے تھے۔ گورنمنٹ ممدوح نے حکم جاری فرمایا ہے کہ کمشنر اپنے اپنے علاقے کی مفصل رپورٹ کریں کہ آیا کشمیری مسلمان اقوام بندی زمینداری میں شامل کر لیے جائیں یا کیے جانے کے لائق ہیں؟ کمشنر صاحب بہادر نے ڈپٹی کمشنروں کے نام حکم صادر فرمایا ہے کہ وہ ان کو اس معاملے میں مدد دیں۔ ڈپٹی کمشنروں نے تمام کشمیری زمینداروں کی ایک فہرست مرتب کرائی ہے جس سے ان کو معلوم ہو گا کہ پنجاب میں کتنے کشمیری زراعت پیشہ ہیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب سیالکوٹ کا حکم نہایت صاف ہے۔ انھوں نے تحصیل داروں سے چار امور دریافت فرمائے ہیں، یعنی:

(۱) قوم کشمیری کے افراد کا عموماً کیا پیشہ ہے؟

(۲) کس قدر کشمیری ایسے ہوں گے جن کا گزارہ صرف زراعت کاری پر ہے؟

(۳) اگر وہ مالکان اراضی ہیں تو کب سے انھوں نے زمین حاصل کی ہے؟

(۴) کوئی کشمیری دخیل کار ہے یا نہیں؟

اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ مفصلات اور شہروں میں بود و باش رکھنے والے زراعت پیشہ کشمیریوں کی جو فہرست تیار ہو گی اس میں مندرجہ بالا چار امور کا خیال رکھا جائے گا۔

آپ مہربانی فرما کر تحصیلدار صاحبوں کو اس فہرست کے مرتب کرنے میں خود بھی امداد دیں اور دیکھیں کہ یہ فہرست موجب حکم صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر تیار کی جاتی ہے یا نہیں۔ تمام اہل خطہ کو جو آپ کے علاقے میں رہتے ہیں اچھی طرح سمجھا دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے گاؤں میں فہرست تیار کرنے میں امداد دیں تاکہ مکمل فہرست تیار ہو اور ہماری گورنمنٹ کو معلوم ہو جائے کہ کشمیری کس قدر پنجاب میں زمیندار ہیں اور زمینداری کا کام کرتے ہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ یہ فہرست بموجب حکم صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر تیار نہیں ہوئی تو صاحب اور ڈپٹی کمشنر کی

خدمت میں مودبانہ درخواست کریں کہ وہ ان کے بموجب تیار کرنے کا حکم صادر فرمائیں۔
جو نقشہ کہ تیار ہو رہا ہے اس کی ایک نقل انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے پاس جس قدر جلد ممکن ہو سکے ارسال فرمانے کی کوشش کریں۔ یہ چٹھی اپنے بھائیوں کو جو مفصلات میں رہتے ہیں، جلد بھیج دیں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ کس قسم کی فہرست تیار ہونی چاہیے۔ اگر وہ دیکھیں کہ فہرست بموجب حکم بالا تیار نہیں ہوئی یا نہیں ہوتی تو وہ آپ کی معرفت صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے خط و کتابت کریں۔ اس غرض کے لیے کہ مندرجہ بالا امر میں تمام قوم کے افراد متفقہ طور پر اپنی بہبودی کے لیے کوشش کریں نیز دیگر امور کے لیے جو قوم سے بحیثیت مجموعی تعلق رکھتے ہوں، مَیں تحریک کرتا ہوں کہ آپ اپنے سنٹر (مرکز) میں ضرور کشمیری مجلس قائم کریں۔ اس کے علاوہ ہر ایسے مقام میں جہاں آپ کا اثر ہو، اپنے دیگر بھائیوں کو کشمیری مجلس قائم کرنے کی ترغیب بھی دیں کیونکہ اس طریق سے نہ صرف قوم کے افراد میں اتحاد و یگانگت کی صورت پیدا ہوگی بلکہ قومی حقوق کی حفاظت اور توسیع میں بھی سہولت ہوگی۔

خاکسار

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاء جنرل سیکریٹری

انجمن کشمیری مسلمانان' لاہور

دوسری چٹھی جو اقبال نے بعض قومی کمیٹیوں اور بزرگان قوم کی خدمت میں چھاپ کر بھیجی، یہ تھی:

''فوجی، زمینداری اور مردم شماری کا مسئلہ''

''برادرم کرم و معظم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ!
انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کی طرف سے پہلے بھی مسئلہ زمینداری کے متعلق ایک مطبوعہ چٹھی بعض قومی کمیٹیوں اور بزرگان قوم کی خدمت میں ارسال کیے جانے کے علاوہ کشمیری میگزین بابت مئی ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی ہے جو امید ہے تمام برادران کی نظر سے گزری ہوگی۔ اس مسئلے پر دیگر قومی کمیٹیوں کے علاوہ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور بھی غور کر رہی ہے بلکہ اس نے ایک چٹھی بخدمت صاحب سینئر سیکریٹری جناب لیفٹیننٹ گورنر صاحب اور صوبہ پنجاب بدیں مضمون ارسال کی ہے کہ کشمیری زمینداروں کی فہرست اقوام بندی صرف ضلع سیالکوٹ و گورداسپور تک ہی محدود نہ رہے بلکہ یہ معلم از راہ الطاف خسروانہ دیگر اضلاع مثلاً گوجرانوالہ، لاہور امرتسر،

جہلم، راولپنڈی لدھیانہ، اٹک، ہزارہ وغیرہ میں بھی جہاں کشمیری آبادی کثرت سے ہے نافذ فرمایا جائے۔ صاحب ممدوح کی خدمت میں ایک نقشہ بھی اس مضمون کا ارسال کیا گیا ہے کہ فہرست کس طرح سے تیار ہونی چاہیے۔ جواب آنے پر سب بھائیوں کو بذریعہ میگزین اطلاع دی جائے گی۔ فوجی مسئلے کی ضرورت اور اہمیت سے بھی انجمن غافل نہیں ہے۔ اس مسئلے کے متعلق خاموشی اس لیے ہے کہ ہمارے ملی محسن نواب بہادر سر خواجہ محمد سلیم اللہ صاحب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی سی آئی ای نواب آف ڈھاکہ نے اپنی ایک تازہ چٹھی بنام جنرل سیکریٹری انجمن کشمیری مسلمانان لاہور میں وعدہ فرمایا ہے کہ وہ صاحب کمانڈر انچیف بہادر افواج ہند سے ملاقات کر کے اس مسئلے کی نسبت فیصلہ فرمائیں گے۔ اب نواب صاحب ممدوح کو تمام امور متعلقہ خدمات فوجی سے آگاہی کی ضرورت ہے تاکہ پوری واقفیت حاصل کر کے حضور کمانڈر انچیف بہادر سے گفتگو کر سکیں اور صراحت و وضاحت سے اپنے بھائیوں کی مردانگی اور جان نثاری اور ان کی فوجی خدمات کا تذکرہ کر سکیں۔ ایسا مصالح بہم پہنچانا معمولی بات نہیں ہے اور نہ ہی ایک شخص یا ایک کمیٹی کا کام ہے۔ جب تک تمام برادری متفقہ کوشش سے اس میں ہاتھ نہ بٹائے گی یہ کام سرانجام نہ ہوگا۔ اس لیے سب بھائیوں کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ کشمیری انجمن لاہور کو اس معاملے میں مدد دیں اور نقشہ ملازمان اہلِ خطہ فوج کو جو لف ہذا ہے اچھی طرح سے پر کر کے جتنی جلدی ہو سکے، جنرل سیکریٹری کو واپس ارسال فرمائیں تاکہ نواب صاحب بہادر کی خدمت میں افواج ہند کے کشمیری بہادروں کی مکمل فہرست ارسال کر دی جائے۔ آپ ہرگز یہ خیال نہ فرمائیں کہ اس نقشے سے کسی طرح ہمارے ان بھائیوں کو، جو اس وقت صیغہ فوج میں ملازم ہیں نقصان پہنچے گا۔ نقصان پہنچنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا اور خود کمانڈر انچیف بہادر تسلیم کر چکے ہیں کہ کشمیری مسلمان فوجوں میں ملازم ہیں۔ ان کے لیے کوئی بندش اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے، البتہ ان کی تعداد تھوڑی ہے۔ لاہور کی کمیٹی جس میں ہماری برادری کے اکثر اہل الرائے اور قانون دان بزرگ شامل ہیں، اپنے بھائیوں کے اس خیال پر کافی سے زیادہ غور کر چکی ہے اور وہ ہر طرح مطمئن ہے۔ بلکہ ایسی فہرستوں کے مرتب ہونے سے قومی فائدے کی بہت بڑی توقع رکھتی ہے۔

کمیٹی کوشش کر رہی ہے کہ ہمارا ایک ڈیپوٹیشن، جس میں ہماری برادری کے معزز فوجی پنشنر عہدہ دار خصوصیت سے شامل ہوں، سرپرستی نواب بہادر آف ڈھاکہ صاحب بہادر کمانڈر انچیف کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہو کہ کشمیری مسلمانوں کی رجمنٹ یا مختلف رجمنٹوں میں یا

رسالوں میں کمپنی علیحدہ بنائے جانے کا حکم صادر فرمایا جائے۔ اگر برادران قوم نے فہرستیں اور نقشے مکمل کر کے جلد تر واپس کر دیے تو غالب توقع ہے کہ گورنمنٹ ضرور ہماری گزارش پر توجہ فرمائے گی۔ اس چٹھی کے ساتھ علاوہ نقشہ ملازمان اہلِ خطہ فوج کے ایک نقشہ مردم شماری اہل خطہ کا بھی ہے۔ اس کی خانہ پری بھی ضروری ہے۔ اس نقشے سے نہ صرف اپنی برادری کی صحیح مردم شماری ہی دریافت کرنا مقصود ہے بلکہ یہ امر بھی، جیسا کہ نقشے کے ملاحظے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا، مدنظر ہے کہ قوم کے خواندہ اور ناخواندہ اور بے کار اور با کار اصحاب کا حال بھی معلوم ہو جائے تاکہ کمیٹی حتی المقدور اپنے بھائیوں کو کسی قسم کی امداد پہنچا سکے۔ دنیا اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی قوم زندہ قوموں میں شمار نہیں ہو سکتی جس قدر قومیں آج آپ کو مہذب، شائستہ اور ترقی یافتہ نظر آتی ہیں وہ سب علم کے زینے ہی سے آسمان عروج و کمال پر پہنچی ہیں۔ آپ کو یاد رہے کہ آپ میں بھی وہ سچے موتی اور جواہر موجود ہیں جن کی چمک دمک سے دنیا حیران اور خیرہ ہو سکتی ہے۔ لیکن صرف جلا کی ضرورت ہے اور جلا تعلیم کے ذریعے ہی سے ہو سکتی ہے۔

آخر میں پھر یہ گزارش کرتا ہوں کہ دونوں نقشے فوجی اور مردم شماری بہت جلد پُر کر کے واپس ارسال فرمائیں۔ اگر یہ نقشے ختم ہو جائیں تو آپ لاہور کمیٹی سے اور طلب فرما سکتے ہیں یا اسی نمونے کے اور نقشے دستی بنا سکتے ہیں۔

قوم کا خادم،
(ڈاکٹر شیخ) محمد اقبال

ایم اے بیرسٹرایٹ لاء لاہور۔''

انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور کی بنیادوں پر بعد میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس لاہور عالمِ وجود میں آئی جس نے کشمیر میں بیداری پیدا کرنے اور تعلیمی کمی دور کرنے میں بڑا کام کیا۔ اس کانفرنس کے بھی پہلے جنرل سیکریٹری اقبال تھے۔ بعد میں سید محسن شاہ بی۔اے، ایل۔ایل۔بی اس کے سیکرٹری ہو گئے تھے۔ آج مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں جو مسلمان اعلیٰ عہدوں پر فائز نظر آ رہے ہیں ان میں اکثر اس کانفرنس کے تعلیمی وظائف کے رہینِ منت ہیں۔ اس کانفرنس کے ابتدائی دو اجلاس تو لاہور ہی میں ہوئے جو زیادہ تر لاہور، امرتسر، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ وغیرہ چند شہروں کے نمائندوں تک محدود تھے۔ لیکن راولپنڈی، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے اجلاس مجمع اور اثر و اہمیت کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔ سیالکوٹ کے اجلاس کے صدر خان بہادر

نواب خواجہ محمد اعظم رئیس ڈھاکہ تھے۔ اِن اجتماعوں میں کشمیری الاصل فوجی سردار بھی شامل ہوتے تھے جن میں کئی لیفٹیننٹ، صوبیدار اور جاگیردار تھے۔

ان ایام میں خواجہ احد شاہ رئیس لدھیانہ اور خواجہ یوسف شاہ رئیس امرتسر پنجاب کونسل کے ممبر تھے۔ وہ دونوں کشمیری تھے اور قومی معاملات میں خوب دلچسپی لیا کرتے تھے۔ خواجہ احد شاہ کی طرف سے لاہور میں انگریزی اخبار ''پنجاب آبزرور'' جاری تھا جس کے ایڈیٹر مختلف وقتوں میں شیخ عبدالقادر، شیخ عبدالعزیز اور ملک برکت علی رہے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بی۔اے اپنے آپ کو آنریری (اعزازی) کشمیری کہا کرتے تھے۔ وہ بعد میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے آنریری سیکریٹری اور پنجاب گورنمنٹ پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ بھی ہو گئے تھے۔ اور وہ اپنے اخبار میں کشمیریوں کے مطالبات کی زبردست حمایت کرتے تھے ادھر فوق صاحب " کشمیری میگزین" میں کشمیری مسلمانوں کی بے کسی اور حکومتِ کشمیر کی بے توجہی کا قصہ چھیڑتے رہتے تھے۔ لیکن اخباروں کی چیخ پکار اور کشمیری کانفرنس کے مقرروں کی دھواں دھار تقریروں کے باوجود دربار کشمیر کسی مطالبے پر کان نہ دھرتا تھا بلکہ قراردادوں اور شکایتوں کے پہنچنے کی رسید تک نہ دیتا تھا۔

یہ حالات نہایت یاس انگیز اور حوصلہ شکن تھے لیکن ارکانِ کانفرنس نے ہمت نہ ہاری۔ آخر ان کے عزم و استقلال کی بدولت ایک وقت آیا جب قراردادوں کی رسیدیں بھی آنے لگیں۔ حکام سے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں اور کانفرنس کے وفد مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ کے سامنے اصالتاً اپنی شکایات پیش کرنے لگے۔ دو ایک موقعوں پر اقبال نے بھی ان میں شامل ہو کر کشمیری کانفرنس کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔

۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہے کہ ایک مرتبہ کشمیری کانفرنس کا وفد مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ والیِ کشمیر کی خدمت میں بمقام کشمیر ہاؤس (لاہور) جانے والا تھا۔ فوق صاحب اقبال کو بلانے گئے۔ اقبال ان دنوں انارکلی والی بیٹھک میں رہتے تھے۔ انھوں نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ ''جو مہاراجہ دن کے بارہ بجے سے پہلے کسی مسلمان کا منہ دیکھنا گوارا نہیں کرتا مَیں کسی وقت بھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا ایک ایسا شخص، جس کے شہر جموں کا نام صبح ہی صبح لینا نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو تک منحوس سمجھتے ہیں، اس منحوس شہر کا رہنے والا مسلمان کو منحوس سمجھ کر اس کی شکل سے نفرت کرتا ہے۔''

فوق صاحب نے کہا ''یہ بات تو سچ ہے کہ مسلمان بارہ بجے سے پیشتر اس کے پاس نہیں

جا سکتے لیکن اس کی ایک وجہ بھی ہے وہ یہ کہ مہاراجہ صبح سویرے اٹھ کر اشنان کرنے کے بعد پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ برہمن ان کے گرد ہوتے ہیں۔ اس میں کافی وقت صَرف ہو جاتا ہے۔ عبادت سے فارغ ہو کر کچھ ناشتہ کیا جاتا ہے، پھر حقہ بھرا جاتا ہے جس کے کش لگاتے لگاتے کھانے کا وقت آ جاتا ہے اور خواہ مخواہ بارہ بج جاتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ان کو برہمنوں اور رسوئی کے کاموں سے فرصت نصیب ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے وزیروں اور بڑے بڑے اہل کاروں کو بھی بارہ بجے دوپہر سے ایک بجے تک ہی جے جے اور سلام کا موقع دیا کرتے ہیں''۔ لیکن ان باتوں سے اقبال کی تسلی کب ہو سکتی تھی۔ انھوں نے ایک نہ سنی اور نہ آئے۔

وفد کے باقی ممبر وقت مقررہ پر کشمیر ہاؤس پہنچے۔ انھیں ایک چھوٹے سے خیمے میں بٹھایا گیا۔ دیوان امرناتھ چیف منسٹر تھے۔ وہ کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد باہر جاتے اور پھر خیمے میں آ کر باتوں میں مشغول ہو جاتے۔ ملاقات کا وقت آٹھ بجے شام تھا مگر جب نو بج چکے تو ایک آدمی دوڑا ہوا آیا اور دیوان صاحب کو خیمے سے باہر لے گیا۔ معلوم ہوا کہ مہاراجہ صاحب جو کسی کو اطلاع دیے بغیر اپنے گرو جی کے پاس چلے گئے تھے اور جن کی تلاش میں دیوان صاحب پریشان ہو رہے تھے، تشریف لے آئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سب کو بڑے کمرے میں بلایا گیا۔ غالبًا اواخر دسمبر کے دن تھے۔ کمرے میں انگیٹھی سلگ رہی تھی اور مہاراجہ صاحب گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ سب سلام کر کے فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ معروضات پیش کیں۔ مہاراجہ صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دیوان صاحب آپ سے گفتگو کر چکے ہیں وہ آپ کی باتوں کا خیال رکھیں گے۔ سرکار کو خود بھی خیال ہے۔ اس کے بعد خاموشی ہو گئی۔ سب سلام کر کے چلے آئے لیکن حیران تھے کہ یہ کیسی ملاقات ہے۔ ایک طرف تو دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے اور دوسری طرف، نشستند و گفتند و برخاستند کا معاملہ ہے۔

☆☆☆

باب:۳۰

حیدرآباد دکن کا سفر

دکن جنوبی ہند کا وسیع ملک تھا جس میں آج کے انڈیا کے آندھرا پردیش، مدھیا پردیش، مہاراشٹر، تامل ناڈو، کیرالا اور کرناٹک کے علاقے شامل تھے۔ یہ بڑی متمدّن اور خوشحال ریاست تھی۔ جس کا حکمران نظام کہلاتا تھا۔ حیدرآباد میں اہلِ سخن کی قدر افزائی کے چرچے اقبال کے کانوں تک پہنچتے رہتے تھے اور انہیں یہ توقع ہو گئی تھی کہ دہلی اور لکھنؤ کی بربادی کے بعد حیدرآباد دکن ہی ایک ایسی مسلم ریاست ہے، جہاں ہوسکتا ہے انہیں وہ مہلت میسّر آ سکے، جس کی انہیں جستجو تھی۔ اقبال کبھی حیدرآباد نہ گئے تھے۔ گو اُن کی غزلیں اور نظمیں وہاں کے مختلف رسالوں یا جریدوں میں چھپتی رہتی تھیں اور حیدرآباد کی بعض علم دوست شخصیات مثلاً سر اکبر حیدری، مہاراجہ ہرکشن پرشاد وغیرہ سے ان کا غیبی تعارف بذریعہ خط وکتابت تھا۔ نیز اقبال کے دوست غلام قادر گرامی بھی شاعرِ خاص نظام کی حیثیت سے وہاں مقیم تھے۔ چنانچہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے دس دن کی رخصت لے کر ۱۸/مارچ ۱۹۱۰ء کی رات کو حیدرآباد روانہ ہو گئے۔

اقبال کی تحریر سے واضح پتہ نہیں چلتا کہ اُن کے حیدرآباد جانے کا مقصد کیا تھا۔ اُن کے پیش نظر کوئی مخصوص ملازمت نہ تھی۔ یہ قیاس کرنا بھی درست نہیں کہ اُن کا دورہ کسی خاص ملازمت کی غرض سے تھا۔ بہر حال غالب امکان یہ ہے کہ اگر انہیں دربارِ دکن میں باریابی حاصل ہو جاتی تو وہ نظام کو تصنیف وتالیف کے سلسلے میں اپنے مستقبل کے عزائم کی اہمیت سے روشناس کرانا چاہتے تھے اور اگر ان عزائم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے نظام انہیں کسی مناسب منصب کی پیشکش کرتے تو غالباً اسے قبول کر لیتے، لیکن ایسی نوبت ہی نہ آئی۔

حیدرآباد میں اقبال نے سر اکبر حیدری کے ہاں قیام کیا۔ ممکن ہے، وہ (اکبر حیدری) خط

وکتابت کے ذریعے اقبال سے متعارف ہوئے ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اقبال سے ان کا غائبانہ تعارف گرامی کے ذریعے ہوا ہو، کیونکہ حیدرآباد جانے سے چند روز قبل اقبال نے اپنے ایک خط، محررہ ۱۱/ مارچ ۱۹۱۰ء بنامِ گرامی، میں تحریر کیا:

''خط لکھے ہوئے کئی دن گزر گئے، حیدری صاحب کے متعلق استفسار کیا تھا، جواب ندارد۔ دو خطوں کے جواب آپ کے ذمّے ہیں۔ آپ کس عالمِ غفلت میں قیام پذیر یا تشریف فرما ہیں''۔

سر اکبر حیدری اور ان کی اہلیہ علم و ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف اقبال کی خاطر تواضع کی بلکہ حیدرآباد کی مقتدر ہستیوں سے انہیں متعارف کرایا۔ یاد رہے سر اکبر حیدری کی شادی عطیّہ فیضی کی چچا زاد بہن امینہ بنت نجم الدین سے ہوئی تھی۔ یہ بھی یورپ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران اقبال نے جناب نظم طباطبائی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ نظم اُن ایّام میں نظام کالج میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے مامور تھے۔ سر اکبر حیدری نے انہیں بلوا بھیجا اور اقبال سے تعارف کرایا۔ کچھ دیر بات چیت کے بعد اقبال نے اُن سے اپنا کلام سنانے کی درخواست کی۔ نظم نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب کے اشعار سنائے۔

پردۂ ظلمت سے نکلا روئے سلمائے سحر
ناقۂ گردوں سے کھینچی لیلیٰ شب نے مہار

اشعار سن کر اقبال نے نظم کو ان کی قادر الکلامی پر بے انتہا داد دی اور بعد میں انھوں نے نظم طباطبائی ہی کی زمین میں مدحیہ قصیدہ ''شکریہ'' تحریر کیا، جو مہاراجہ ہرکشن پرشاد سے منسوب ہے۔

اقبال حیدرآباد میں گرامی کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ علاوہ اس کے وہاں کے تمام اہلِ کمال سے ملے۔ حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری نے، جو داغ کے بعد استادِ نظام مقرر ہوئے تھے، اقبال کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا، جس میں حیدرآباد کے متعدد شاعروں اور ادیبوں کو مدعو کیا گیا۔ اس تقریب میں ظہیر دہلوی بھی نقاہت اور بڑھاپے کے باوجود شامل ہوئے۔

اقبال نے حیدرآباد میں ایک نظم ''گورستانِ شاہی'' کے عنوان سے گولکنڈہ کے قطب شاہی بادشاہوں کے مقبروں سے متاثر ہو کر لکھی۔ یہ نظم (۵۸ اشعار پر مشتمل ''بانگِ درا'' میں ہے) ان کے حیدرآباد سے لاہور واپس آنے پر مخزن میں اقبال کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔

''حیدرآباد کے مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما مسٹر نذر علی بی اے، معتمدِ محکمۂ

فنانس...... مجھے ایک دن ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے، جن میں سلاطینِ قطب شاہی سورہے تھے۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم ان ہی بے شمار تاثرات کا اظہار ہے۔ اس کو مَیں اپنے سفرِ حیدرآباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام سے منسوب کرتا ہوں، جنھوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیام حیدرآباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا''۔

''گورستان شاہی'' کے چند اشعار یہ ہیں:

آہ جن کو آرزوئے ناصبور ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردُوں پایہ ہے
اک برگشتِ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دُور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

کیا یہی ہے اِن شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آسکتی نہیں

آہ! مُسلم بھی زمانے سے یُونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابرِ آذاری اُٹھا، برسا، گیا

حیدرآباد میں اقبال، مہاراجہ ہرکشن پرشاد سے بھی ملے، جوان دنوں ریاست کے صدر المہام تھے۔ مہاراجہ ہرکشن پرشاد، راجا ٹوڈر مَل کی اولاد سے تھے۔ ان کا اصل وطن لاہور تھا جہاں سے اُن کا خاندان پہلے دہلی اور پھر حیدرآباد پہنچا۔ وہ ذات کے کھشتری تھے، سنسکرت کے علاوہ عربی، فارسی اور اُردو میں مہارت کے سبب صوفیانہ خیالات رکھتے تھے۔ شعر گوئی اور شعر فہمی کا اُن کو خاص ملکہ تھا۔ داغ اور آصف کے شاگرد رہ چکے تھے۔ اپنا تخلّص شاد تھا۔ فنونِ سپہ گری کے ساتھ رمل، نجوم، خطاطی، مصوّری اور موسیقی پر بھی عبور حاصل تھا۔ ایک بہت بڑی جاگیر جس کی آمدنی سولہ لاکھ روپے سالانہ تھی، اُن کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کا ماحول تو امیرانہ تھا، لیکن عادات فقیرانہ تھیں۔ چار بیگمیں مسلمان تھیں، جن میں سے ایک کی محبت میں ختنہ بھی کرالیا تھا۔ تین رانیاں ہندو تھیں۔ مسلمان بیگمات کی اولاد مسلمان تھی اور ان کے رشتے مسلمانوں میں کیے گئے۔ اسی طرح ہندو رانیوں کی اولاد ہندوؤں میں بیاہی گئی۔ راجا صاحب کی تعلیم و تربیت

اسلامی طریقے پر ہوئی تھی، لہٰذا قرآن مجید کی کئی سورتیں اور احادیث انہیں زبانی یاد تھیں۔ مندروں میں قشقہ لگاتے اور مسجدوں میں نماز پڑھتے تھے۔ انھوں نے اپنا موحدانہ مسلک اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

مَیں ہوں ہندو، مَیں ہوں مسلماں　　ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے　　آزادی، آزاد ہی جانے

ان کے شعر و نثر کے کئی مجموعے مختلف ناموں سے شائع ہوئے اور ایک نعت کو تو یہ شرف حاصل ہوا کہ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی ﷺ کے پیچھے کتب خانۂ شیخ الاسلام کی ایک دیوار پر آویزاں کی گئی۔ مئی ۱۹۴۰ء میں جناب مہاراجہ ہرکشن پرشاد کا انتقال ہوا۔

حیدرآباد کے اس ہندو جاگیردار کی فقیرانہ عادات، موروثی عجز و انکسار، نوازشِ کریمانہ اور وسعتِ اخلاق نے اقبال کا دل ہمیشہ کے لیے جیت لیا۔ دونوں کے درمیان بہت گہرے تعلقات قائم ہوئے۔ اقبال نے مہاراجہ ہرکشن پرشاد کی تعریف میں ایک مدحیہ قصیدہ ''شکریہ'' کے عنوان سے تحریر کیا، جو ''مخزن'' میں اقبال کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا:

''گذشتہ مارچ میں مجھے حیدرآباد دکن جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے اور عالی جناب ہز ایکسیلنسی مہاراجہ ہرکشن پرشاد بہادر جی سی آئی ای، یمین السلطنت، پیش کار وزیراعظم دولتِ آصفیہ المتخلص بہ شاد کی خدمتِ بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسیلنسی کی نوازشِ کریمانہ اور وسعتِ اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا، وہ میری لوحِ دل سے کبھی نہیں مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگیٔ حیدرآباد سے پہلے ایک نہایت تلطّف آمیز خط لکھا اور اپنے کلامِ شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایت بے غایت کے شکریے میں دل سے زبان پر بے اختیار آ گئے''۔

یہ نظم جو ۱۳ اشعار پر مشتمل ہے علاّمہ کے غیر مطبوعہ کلام میں ہے۔ ان میں سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کھینچ کر سُوئے گلستاں لے گیا ذوقِ نظر　　عاشق فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کُوئے یار
اتنے دِن غائب رہا تُو گلشنِ پنجاب سے　　کر لیا تھا کیا کسی صیّاد نے تجھ کو شکار
کی وزیرِ شاہ نے وہ عزت افزائی مری　　چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار

دل ربا اس کا تکلّم، خُلق اس کا عطرِ گل   غنچۂ دل کے لیے موجِ نفس، بادِ بہار
کیوں نہ ہو، اس شاہ کو زیبا ہے ایسا ہی وزیر   ذات ہو جس کی شہنشاہانِ عالم کا وقار
شکریہ احساں کا اے اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

اورنگ زیب عالمگیر کی قبر پہ حاضری

اقبال ۲۳ رمارچ ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد سے واپس لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ رات کو اورنگ آباد میں ٹھہرے۔ یہاں مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر آٹھ کوس دُور خلد آباد میں آسودہ لحد ہیں۔ آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی آپ کے ہمراہ تھے (یہ اُن دنوں اُس علاقے میں ملازمت کے سلسلہ میں مقیم تھے) دو روز تک دونوں بھائیوں نے اورنگ آباد میں قیام کیا۔ یہیں عالم گیر کی پہلی بیوی رابعہ دورانی بھی دفن ہے۔ اقبال نے عالمگیر کے مقبرہ کی زیارت کی فاتحہ پڑھی۔ رابعہ دورانی کی قبر پر بھی فاتحہ خوانی کی، دولت آباد کا قلعہ بھی دیکھا، جس کا قدیم نام دیوگری تھا۔ محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء میں دہلی سے دیوگری دارالحکومت منتقل کیا تھا لیکن یہ تجربہ ناکام رہا لوگوں کی تکالیف اور پریشانیاں مدنظر رکھتے ہوئے ۱۷ برس بعد یعنی ۱۳۴۴ء میں دارالحکومت پھر دہلی منتقل کر دیا۔

جس طرح اورنگ زیب کا عقیدہ تھا کہ شریعت کی حفاظت شمشیر کے بغیر نہیں ہوسکتی (الشرع تحت السیف) اسی طرح اقبال کا نظریہ تھا کہ ''مذہب قوت کے بغیر محض ایک فلسفہ ہے''۔ اورنگ زیب پہ جامع لکھنے والا اور فاضل مورخ جادو ناتھ سرکار اس سے متعلق رقمطراز ہے کہ ''ہندوستان میں اس دورِ حکومت میں مستقبل کے لیے یہ اسلام کی آخری تحریک تھی''۔

مارچ ۱۹۱۰ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی قبر کی زیارت سے اُن کے دل و دماغ پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے چنانچہ انھوں نے برصغیر میں ملتِ اسلامیہ کے احیاء کے حوالے سے اورنگ زیب عالمگیر کو اسلامی سیرت کا عمدہ نمونہ قرار دیا۔ انھی خیالات کے تلاطم ہی کا نتیجہ تھا کہ علّامہ ۴ رنومبر ۱۹۱۷ء کو اپنے دوست نواب نیاز الدین خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خودستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج

تک نہیں لکھی گئی۔'' چنانچہ رموزِ بیخودی میں اُن کی نظم (حکایت شیر و شہنشاہِ عالمگیر) کے پہلے بند کے اشعار درج ذیل ہیں:

شاہ عالمگیر گردوں آستان — اعتبار دودمان گورگان
پایۂ اسلامیاں برتر ازو — احترامِ شرعِ پیغمبر ازو
درمیانِ کارزار کفر و دیں — ترکشِ ما را خدنگ آخریں *
تخم الحادے کہ اکبر پرورید — باز اندر فطرت دارا دمید
شمع دل در سینہ ھا روشن نبود — ملت ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را — آن فقیرِ صاحبِ شمشیر را
از پۓ احیائے دیں مامور کرد — بہر تجدید یقیں مامور کرد

برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت
شمعِ دیں در محفل ما بر فروخت

(اورنگ زیب عالمگیر عظیم الشان بادشاہ تھا۔ اس سے تیموری خاندان کو خاص عزت حاصل ہوئی۔ اس کی کوششوں سے مسلمانوں کا وقار بلند ہوا اور نبی کریم حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی شریعت کو احترام ملا۔ کفر اور دین کی جنگ میں وہ ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا۔ اکبر نے الحاد کا بیج بویا تھا، جو پھر دارا کی فطرت میں پلا بڑھا۔ دین کی شمع سینوں میں روشن نہیں تھی جس کے نتیجہ میں ہماری ملت فتنہ وفساد کی وجہ سے عدم حفاظت کا شکار ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان سے عالمگیر کو جو کہ ایک صاحب شمشیر درویش تھا، انتخاب کیا۔ اسے احیائے دین اور تجدید یقین کے لیے مامور فرمایا۔ اورنگ زیب کی برق شمشیر نے الحاد کے خرمن کو جلایا اور ہماری محفل میں دین کی شمع روشن کی۔)

اقبال اورنگ زیب کی شخصیت کے مداح تو تھے ہی اس کی قبر کی زیارت سے مزید متاثر ہوئے۔ اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۴ء میں لکھتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ خواجہ نظامی حیدر آباد سے اورنگ آباد چلے گئے۔ خلد آباد کی زیارت مقصود ہوگی۔ میں بھی وہاں گیا تھا اور عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے مزارِ پاک پر حاضر ہوا تھا۔ میرے بڑے بھائی بھی میرے ساتھ تھے۔ کہنے لگے میں قنات کے اندر نہ جاؤں گا۔ (مزار کے گرد قنات تھی) کہ میری داڑھی غیر مشروع ہے''۔ اس خط کا ایک ہی جملہ جو اقبال نے اپنے بھائی کے حوالے سے لکھا ہے۔ اورنگ زیب کی دینی شخصیت کے ذہنوں پر اثرات کے اظہار کے لیے کئی دفتروں پر

حاوی ہے۔ جس بادشاہ کے باپ نے بے اندازہ زر و جواہر، مال و دولت صَرف کر کے اپنے لیے تخت طاوس اور تاج محل بنائے وہ اس سے عظیم تر سلطنت کا مالک ہوتے ہوئے بھی اپنی وصیّت کے مطابق جب ایک کچی قبر میں دفن ہوا تو اہل بصیرت پر اس کے گہرے اثرات کا مرتب ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اسی لیے اقبال اپنے مجموعۂ کلام ''اسرار و رموز'' کی ایک نظم ''شہنشاہ عالمگیر......'' میں فرماتے ہیں:

کورِ ذوقاں داستاں ہا ساختند وسعتِ ادراک او نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود چوں براہیم اندربت خانہ بود
درصفِ شہنشاں یکتا ستے
فقرِ او از تربتش پیدا ستے

(حقیقتِ حال کے ذوق سے عاری لوگوں نے عالمگیر کے متعلق عجیب وغریب من گھڑت داستانیں وضع کر لیں۔ انہیں شہنشاہ کی دُور اندیشی اور وسیع النظری کا اندازہ نہ ہوسکا۔ عالمگیر توحید کی شمع کا پروانہ تھا اور ہندوستان کے بت خانے میں اُس کی حیثیت ابراہیمؑ کی سی تھی۔ (اس نے کفر و الحاد کا خاتمہ کیا) شہنشاہوں میں اس کا درجہ بے مثل و یگانہ ہے اس کی درویشی اس کی قبر ہی سے ظاہر ہے (اس کی قبر پر کوئی عظیم الشان مقبرہ تعمیر نہیں کیا گیا اس نے وصیّت کر دی تھی کہ نہ مقبرہ بنایا جائے اور نہ قبر پختہ کی جائے)

اقبال کے دل میں اورنگ زیب کے خاص احترام کے پیش نظر ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ نے اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن پاک کا نسخہ جو انہیں مولانا محمد علی جوہر سے ملا تھا۔ اقبال کو بھیجا تو اقبال نے خط میں لکھا کہ:

''اس مقدّس تحفہ کے لیے مَیں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں ان شاء اللہ یہی نسخہ استعمال کیا کروں گا''۔

اقبال نے ۱۹۱۰ء میں ایک خطبہ ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے انگریزی زبان میں دیا جس میں انھوں نے ہندوستان میں اسلامی تحریک کے ارتقا پر نظر ڈالتے ہوئے اورنگ زیب کے متعلق تحریر فرمایا:

''ان لوگوں کے نزدیک جنھوں نے عالمگیر کے حالات تاریخِ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سنے ہیں، عالمگیر کا نام سفا کی وقساوت، جبر واستبداد، مکاّری وغدّاری اور پولیٹیکل سازشوں اور

منصوبوں کے ساتھ وابستہ ہے۔خلط مبحث کا خوف مانع ہے ورنہ مَیں معاصر تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر وتفسیر سے ثابت کرتا کہ عالمگیر کی پولیٹیکل زندگی کی وجوہ تحریک سراسر جائز وحق بجانب تھیں۔اس کے حالاتِ زندگی اور اس کے عہد کے واقعات کا بنظر انتقاد مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین واثق ہوگیا ہے کہ جو الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں وہ ان واقعاتِ معاصرہ کی غلط تعبیر اور ان تمدنی و سیاسی قوتوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جو اِن دِنوں سلطنت اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی تھیں۔میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے، ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس نمونے کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیں''۔

لاہور واپسی

اقبال ۲۹/ مارچ کی صبح لاہور پہنچے پہلے سیدھے کالج گئے طلباء کو لیکچر دیئے اُس کے بعد وہاں سے کچہری پہنچے اور اپنے مقدمات کی پیروی کی۔ ۱۹۱۷ء میں اقبال کی توجہّ ایک بار پھر ریاست حیدر آباد دکن کی طرف مبذول ہوئی۔سیّد ہاشم بلگرامی کے انتقال سے حیدر آباد ہائی کورٹ میں جج کی اسامی خالی ہوئی۔ اس کے لیے منشی دین محمد مدیر میونسپل گزٹ لاہور نے (اقبال سے پوچھے بغیر) اقبال کا نام تجویز کیا اور اس سلسلے میں ایک خط بھی مہاراجہ ہرکشن پرشاد کو لکھا۔مہاراجہ نے منشی دین محمد کے خط کے جواب میں جو کچھ لکھا، اقبال نے اس کا شکریہ اِن الفاظ میں ادا کیا۔''اخباروں میں کئی دنوں سے یہ بات چکر لگا رہی ہے۔مَیں نے سنا ہے کہ پنجاب اور یو۔ پی کے اکثر اخباروں اور ''مخزن'' دکن نے بھی لکھا ہے، مگر مَیں نے سرکار کو عمداً اس بارے میں کچھ نہ لکھا زیادہ تر اس وجہ سے کہ اگر کوئی امکان اس قسم کا نکلے تو مجھے سرکار کی مساعی پر اعتماد تھا۔انھی وجوہ سے باوجود اس بات کے کہ سرکار کے قریب اور ظلِ عاطفت میں رہنے کا خیال مدّت سے دامن گیر ہے، مَیں نے سرکار کی خدمت میں کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔مَیں نے اب تک اپنے معاملات میں ذاتی کوشش کو بہت کم دخل دیا ہے ہمیشہ اپنے آپ کو حالات پر چھوڑ دیا ہے اور نتیجہ سے خواہ وہ کسی قسم کا ہو خدا کے فضل و کرم سے نہیں گھبراتا۔اس وقت بھی قلب کی کیفیّت یہی ہے کہ جہاں اس کی رضا لے جائے گی، جاؤں گا۔ دل میں یہ ضرور ہے کہ اگر خدا کی نگاہِ انتخاب نے مجھے حیدر آباد کے لیے چُنا ہے تو اتفاق سے یہ

انتخاب میری مرضی کے بھی عین مطابق ہے‘‘۔

بعد میں جب ’’مخبرِ دکن‘‘ سے اقبال کو معلوم ہوا کہ حیدرآباد جی کے لیے چند نام نظام کے زیرِ غور ہیں جن میں ایک نام اُن کا بھی ہے تو انھوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کو ۱۵/اپریل ۱۹۱۸ء کو لکھا۔

...... باقی جو میرے حالات ہیں وُہ سرکار پر بخوبی روشن ہیں ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقہٗ اسلام میں اس وقت مفصل کتاب بزبانِ انگریزی زیرِ تصنیف ہے جس کے لیے مَیں نے مصروشام وعرب سے مسالہ جمع کیا ہے جو ان شاءاللہ بشرطِ زندگی شائع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بےنظیر کتاب ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو تفصیلِ مسائل کے اعتبار سے ایسا ہی بناؤں جیسی کہ امام نسفی کی مبسُوط ہے، جو ساٹھ جلدوں میں لکھی گئی تھی‘‘۔

مگر قدرت کو اقبال کا حیدرآباد جانا منظور نہ تھا۔ اسی طرح فقہٗ اسلام پر انگریزی میں مفصّل کتاب لکھ پانے کی بھی فرصت انہیں کبھی نصیب نہ ہوئی اور یہ کام نا تمام رہ گیا۔ حیدرآباد اقبال کی عملی خدمات سے کیوں محروم رہا اس ضمن میں نظر حیدرآبادی لکھتے ہیں:

’’اس سوال کے جواب میں قیاس یہ کہتا ہے کہ باخبر اور ہوش مند انگریز، جس کے ذرائع معلومات بہت وسیع اور پوشیدہ ہوتے تھے اور جس نے حیدرآباد میں وقارالملک، محسن الملک، مولانا ظفرعلی خان، عبدالحلیم شرر اور آخر میں سیّد علی امام کو ٹکنے نہ دیا، وُہ حیدرآباد میں اقبال جیسے خطرے کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا تھا‘‘۔

☆☆☆

باب:۴

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (دہلی) میں شرکت

دسمبر ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ اقبال کو کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے لیے دہلی مدعو کیا جائے اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے مولانا شبلی اُن کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنے کی رسم ادا کریں۔ اقبال نے دعوت قبول کر لی اور کانفرنس کے اجلاس میں مولانا شبلی، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، سیّد سجاد حیدر یلدرم اور خواجہ کمال الدین کے علاوہ سر آغا خان، سید حسین بلگرامی، اعیان وارکانِ حکومت، رہبران وفرمان روایانِ ریاستہائے ہند اور برصغیر کی دیگر مسلم برگزیدہ ہستیاں موجود تھیں۔ اقبال نے کانفرنس کے اجلاس کی تیسری نشست کی صدارت کی مگر جس نشست میں اُن کے گلے میں ہار پہنانے کی رسم ادا کی جانے والی تھی، اس کی صدارت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے کی۔ اس اجلاس میں خواجہ کمال الدین نے ''اسلام اور علومِ جدیدہ'' کے موضوع پر لیکچر دیا اور اپنی تقریر کے اختتام پر اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''کہاں ہے تو ڈاکٹر اقبال! خدائے تعالیٰ تجھے دین و دنیا میں با اقبال کرے۔ تیرے نادر قوائے ذہنی ابھی دنیا کی نظروں سے چُھپے ہوئے ہیں۔ تجھ میں وہ ذہنی قابلیتیں اور استعدادیں ہیں کہ ان کا ٹھیک استعمال بقائے دوام کا تاج تیرے سر پر رکھ سکتا ہے، لیکن یہ خاص الخاص قویٰ تجھے اس لیے عطا نہیں ہوئے۔ کہ تو '' فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ '' (سورہ الشعرا: ۲۲۵) کا مصداق بن کر ایک بے ثمر باغ میں جس کا نام الشعرآء ہے، گلگشت کرے۔ اب وقت ہے، اُٹھ! اور حقیقی تلمیذ الرحمٰن بَن! عالمِ سفلی چھوڑ اور طائرِ قدس ہو جا! تجھے اگر مغربی حکمت وفلسفہ انھوں نے سکھا کر ڈاکٹر کا خطاب دیا تو یہ قرضہ ترانوں اور نغموں سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کا معاوضہ یہ ہے کہ تو قرآن کو کھولے اور اس کے دریائے حقیقت میں غوطہ لگائے اور اس سے حکمت وفلسفہ کے دُرِّ شہوار نکالے...... کیا یہ

بات درست ہے، جو چند دن ہوئے اٹلی اور ترکی کی جنگ کے متعلق لیکچر دیتے ہوئے اس بیسویں صدی کے ایک شقی ازلی شریڈن نے کہی اور ہمارے دل کو کباب کیا کہ اسلام ہمیشہ ہی بے ثمر رہا، اوراس سے نسل انسانی کو کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور یہ کہ اسلام کا نام ونشان مٹنا ہی اچھا ہے۔ یہ جرمنوں کے سامنے اُن کو دھوکا دینے کے لیے اور اُن کی نگاہ میں اٹلی کی قزاقی کا جواز ثابت کرنے کے لیے اس بیسویں صدی کا سب سے بڑا کذب بولا گیا۔ کیا یہ بہتر سے بہتر وقت جرمن کا قرضہ اتارنے کا نہیں؟ دیکھ یورپ کیا اور فلسفہ کیا ہے: یہ سب کا سب مالِ مسروقہ ہے اور بیرسٹر اقبال، آ میرے ساتھ وکالت میں شامل ہو اور ہم بحیثیت منصبی اس مال کو اپنے گھر کا مالِ مسروقہ ثابت کریں۔ تجھے خدا نے بے نظیر قابلیتیں اس لیے نہیں دیں کہ تو لفظی موشگافی میں پڑے اور اپنے شعروں سے ہمیں خوش کرے۔ تیرے گانے کا یہ وقت نہیں، یہ عملی کام کا وقت ہے۔ وہ ہار جو قوم تیرے گلے میں عملاً ڈال رہی ہے اور تو اس کا حقیقی طور پر مستحق ہے وہ ان گلہائے فردوس بریں کے مقابل کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ جو خدمتِ قرآن تیرے لیے وقف کرسکتی ہے۔قوم تجھے ملک الشعرآء بنانا چاہتی ہے اور وہ ایسا کرنے میں غلطی پر ہے اور تو پست ہمت ہوگا اگر اس پر قانع ہوا مَیں تجھ میں رازی اور غزالی کا بروز دیکھنا چاہتا ہوں''۔

خواجہ کمال الدین کے جواب میں اقبال نے اپنی تقریر میں کہا:

''خواجہ صاحب نے جو تقریر اس وقت کی ہے، وہ نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے......اس زمانے میں مسلمانوں نے اس مبحث پر بہت کچھ لکھا ہے کہ اسلام اور علومِ جدیدہ کے مابین کیا تعلق ہے؟ مَیں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں کہ جب سے یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا، یورپ میں علم کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا تھا۔ ان یونیورسٹیوں میں مختلف ممالکِ یورپ کے طلبہ آکر تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے اپنے حلقوں میں علوم وفنون کی اشاعت کرتے تھے۔ کسی یورپین کا یہ کہنا کہ اسلام اور علوم یک جا نہیں ہوسکتے، سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے اور مجھے تعجب ہے کہ علومِ اسلام اور تاریخِ اسلام کے موجود ہونے کے باوجود کوئی شخص کیونکر یہ کہہ سکتا ہے کہ علوم اور اسلام ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ بیکن، ڈی کارٹ اور مل، یورپ کے سب سے بڑے فلاسفر مانے جاتے ہیں، جن کے فلسفے کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر ہے، لیکن حالت یہ ہے کہ ڈی کارٹ کا میتھڈ (اصول) امامِ غزالی کی احیاء العلوم میں موجود ہے اور ان دونوں میں اس قدر تطابق ہے کہ ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے کہ اگر ڈی کارٹ عربی جانتا ہوتا تو ہم ضرور

اعتراف کرتے کہ ڈی کارٹ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے۔ راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ جان اسٹوارٹ مل نے منطق کی شکل اوّل پر جو اعتراض کیا ہے، بعینہٖ وہی اعتراض امام فخر الدین رازی نے بھی کیا تھا اور مل کے فلسفے کے تمام بنیادی اصول شیخ بو علی سینا کی مشہور کتاب ''الشفاء'' میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ تمام وہ اصول جن پر علومِ جدیدہ کی بنیاد ہے، مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں، بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف علومِ جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور اچھا پہلو ایسا نہیں ہے کہ جس پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو''۔

اس کے بعد سجاد حیدر یلدرم نے مولانا شبلی سے درخواست کی کہ وہ اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائیں۔ مولانا شبلی نے اپنی مختصر سی تقریر میں فرمایا:

''یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح نہ تصوّر کرنا چاہیے۔ ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں، اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوئی۔ جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لیے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں''۔

اس کے بعد انھوں نے اقبال کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا۔ اقبال نے اس عزت افزائی کے لیے قوم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

''میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو پان اسلام ازم کی تحریک پھیلانے والا بتایا جاتا ہے۔ مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے، وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی۔ اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے، اپنی نظموں کے ذریعے قوم کو پہنچانا چاہتا ہوں اور اس سپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہشمند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی کہ باوجود دولت و امارت کے وہ اس دارِفانی کو کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ مَیں جب بھی کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات وغیرہ پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں۔ مَیں نے ابھی ایک شاہی قبرستان میں ایک قبر پر الملک للہ کا کتبہ لکھا ہوا دیکھا۔ اس سے اس اسلامی جوش کا اظہار ہوتا ہے، جو دولت اور حکومت کے زمانے میں مسلمانوں میں تھا۔ جس قوم اور جس

مذہب کا یہ اصول ہو، اس کے مستقبل سے ناامیدی نہیں ہوسکتی اور یہی وہ پان اسلام ازم ہے، جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے اور اسی قسم کے خیالات کو مَیں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں‘‘۔

جلسے کے اختتام پر صاحبِ صدر مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اپنے خطبۂ صدارت میں اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

’’ایک اور قابلِ ذکر امر میرے عزیز دوست، فخرِ قوم، پروفیسر اقبال صاحب کو اُن کی قومی شاعری کی سند میں پھولوں کے ہار پہنائے جانے کا بھی ہے۔ اس کے متعلق مَیں قرآن سے کیا فیصلہ دوں۔ وہاں تو فرمایا گیا ہے **’’وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ‘‘** * مگر نہیں! یہ تو ایّامِ جاہلیت کے اُن شعراء کی نسبت کہا گیا ہے، جن کی شاعری کا مایۂ ناز ہزلیات، ہجو و مذمت، غیر مہذب اور مخربِ اخلاق باتیں تھیں، لیکن ڈاکٹر اقبال اُن شاعروں میں ہیں، جن کو اسی آیت کے آگے **’’اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا‘‘** سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں، جن کی شان یہ بتائی گئی کہ **’’فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ‘‘** (سورہ الزمر: ۱۷-۱۸) مسٹر اقبال تو **اَحْسَنَ الْقَوْلَ** والے ممدوح شاعر ہیں۔ اُن کے قومی ترانے اور اُن کی نعتیہ نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ اقبال کی شاعری کا رنگ ڈھنگ اگلے شعراء سے نرالا ہے۔ اگلے شاعروں کی سخاوت و دریا دلی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ محبوب کے خال پر قبضہ سے نکل کر روس کی عملداری میں ہیں، اس لیے یوں کہنا زیبا ہے۔ بخال روسیہ بخشم سمرقند و بخارا را۔ مگر پروفیسر اقبال صاحب کی عالی خیالی سنیئے کہ ایک طرف تو طرابلس قبضہ سے نکلا جاتا ہے، ایک طرف ایران معرضِ خطر میں ہے، مگر ان کا ترانہ یہ ہے کہ زمین ہماری، آسمان ہمارا، چین ہمارا، ہندوستان ہمارا، یہاں تک کہ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ خیر ہم بھی کہتے ہیں کہ خدا کرے سارا جہاں تمھارا ہو جائے اور کوئی نہ ہو تو ہم تمھارے ہیں۔ اقبال صاحب کے لیے یہ موقع بہت ہی مبارک ہے اور ہمیں بھی بڑی مسرت ہے کہ اس جلسے میں انھوں نے علاّمہ شبلی کے مقتدر ہاتھوں سے پھولوں کے ہار پہنے۔ نام بھی مبارک، کام بھی مبارک، پھولوں کا ہار بھی مبارک اور ہار ڈالنے والے کا دستِ کرم بھی مبارک‘‘۔

☆☆☆

باب: ۵

کانپور اور دہلی کا سفر

اگست ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے ایک حصے کی شہادت کا حادثہ پیش آیا۔ مقامی حکام نے محض ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لیے مسجد کا وضوخانہ گرا دیا۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو گئے، مظاہرے ہوئے، گولی چلی، کئی مسلمان شہید، سینکڑوں زخمی اور متعدد گرفتار ہوئے۔

علاّمہ اقبال اور مرزا جلال الدین، ملزمان کانپور کی طرف سے مقدمہ لڑنے کے لیے لاہور سے ۷ ستمبر ۱۹۱۳ء کو تشریف لے گئے جسے ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کے ہفت روزہ ''توحید'' میرٹھ میں ''حضرت خواجہ حسن نظامی اور کلکٹر کانپور کی ملاقات'' کے عنوان کے تحت علاّمہ اقبال کی آمد اور مصروفیات پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

''ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب اور مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹران لاہور بھی آج کانپور پہنچے تھے جن کے استقبال کے واسطے عمائدین شہر اسٹیشن پر گئے تھے۔''

مزید لکھا گیا ہے:

''شام کو کلکٹر صاحب سے مسٹر عبدالحمید خواجہ نے ڈاکٹر اقبال اور خواجہ صاحب کے لیے قیدیوں کو دیکھنے کی اجازت مانگی تھی۔ اقبال اور مرزا جلال الدین کو اجازت مل گئی مگر خواجہ صاحب کو نہ ملی۔''

کانپور سے فارغ ہونے کے بعد علاّمہ اقبال اپنے مرشد معنوی اکبر الہ آبادی سے ملاقات کے لیے الہ آباد گئے اور وہاں سے عازمِ دہلی ہوئے۔ اس کی شہادت اکبر الہ آبادی کے ۹ ستمبر ۱۹۱۳ء کے ایک خط سے ملتی ہے (''اکبر کے شب و روز'' مرتبہ رحیم دہلوی ص ۱۴۱) اس میں لکھتے ہیں:

''...... ڈاکٹر اقبال صاحب بھی بسلسلہ کانپور مجھ سے ملنے تشریف لائے تھے اب تو لکھنے پڑھنے میں زیادہ دل نہیں لگتا یا تسبیح یا حیرت، علالت اور ناتوانی، نیز عادات سابقہ نے محتاجِ خدمت کر رکھا ہے۔ کل ڈاکٹر صاحب، جو مجھ سے ملنے کو تشریف لائے تھے، دہلی گئے۔ مَیں جونپور کا قصد

کر رہا ہوں اگر اچھا رہا تو وہاں سے لکھنؤ جاؤں گا۔ ان شاء اللہ۔''

علّامہ اقبال کے قیام دہلی کی مختصر رُوداد ہفت روزہ ''توحید'' ۱۶؍ستمبر ۱۹۱۳ء میں اس طرح لکھی گئی ہے:

ڈاکٹر اقبال دہلی میں

کانپور سے واپس ہو کر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر دہلی میں کئی روز مقیم رہے۔ حاذق الملک حکیم اجمل خان صاحب نے اُن کے اعزاز میں عمائدین شہر کو مدعو کیا تھا۔ شعر و شاعری کی وہ دلچسپ صحبت گرم رہی کہ دہلی کے دَورِ گزشتہ کا لطف آ گیا۔ حاذق الملک کی غزل بھی پڑھی گئی۔ معلوم ہوا حکیم صاحب شعر گوئی میں بہت اچھا ملکہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے فرمایا۔

''حاذق الملک حکیم ہیں محض طبیب نہیں۔ یعنی اُن کو حکمت جیسی بے مثل نعمت کا حصہ ملا ہے۔''

☆☆☆

باب:٦

کشمیر جنت نظیر کا سفر

علّامہ اقبال کے آباء و اجداد کا تعلق خطۂ کشمیر سے تھا۔ ایک تحقیق کے مطابق اِن کے بزرگوں کا مسکن گاؤں چکو تھا جو سری نگر سے چند کلومیٹر دور شوپیاں کے راستے میں تھا اگر چہ اب وہ گاؤں امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں صفحۂ ہستی سے مِٹ چکا ہے یہ برہمنوں کا گاؤں تھا۔ علاّمہ کے اجداد برہمن تھے اور ذات کے سپرو۔ ان کے اجداد میں ''بابا صالح'' نامی شخص حضرت نورالدین رشی ولی کے خلیفہ بابا نصیرالدین نصرو رشی ولی کے دستِ حق پہ مشرف بہ اسلام ہوئے بعد میں انھوں نے متعدد بار حج کی سعادت حاصل کی اور بابا لول حج کہلائے۔ ''لول'' کشمیری زبان میں محبت اور پیار کو کہتے ہیں۔

اقبال نے اپنے بزرگوں کے برہمن ہونے کا ذکر اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔

مَیں اصل کا خاص سومناتی
آباء میرے لاتی و مناتی

مزید فرماتے ہیں:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریزاست

(مجھے دیکھ کہ ہندوستان میں میرے علاوہ تجھے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آئے گا جو برہمن زادہ ہو اور مولانائے روم وحضرت شمس تبریز کی رمزوں سے آشنا ہو۔)

ایک اور مقام پر فرمایا:

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست

ترجمہ: میر و مرزا اپنا دل اور دین، سیاست کی نذر کر چکے ہیں...... برہمن کے بیٹے یعنی میرے علاوہ اور کون (خدا کے) راز کا محرم ہوسکتا ہے؟

بہر حال اقبال کو اپنے مسلمان ہونے پر افتخار ہے۔ وُہ سچے عاشقِ رسولؐ تھے اور اوّل و آخر یہی اُن کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ فرماتے ہیں:

کوئی پنڈت مُجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے۔

آبائی وطن ہونے کے ناطے اقبال کو کشمیر سے بہت اُنسیّت تھی۔ آپ کی شاعری کے ابتدائی ایّام میں کشمیر سے متعلق بہت رباعیات وقطعات ملتے ہیں۔ جو رسالہ ''مجلسِ کشمیری مسلمانان لاہور'' اور بعدازاں اخبار ''کشمیر گزٹ'' اور ''کشمیری میگزین'' میں شائع ہوئے۔ ایک قطعہ ہے۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغِ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

علاّمہ کے کلام بالخصوص ''ارمغانِ حجاز'' اور 'جاوید نامہ' میں کشمیر سے متعلق بہت خوبصورت نظمیں ہیں جن میں وادیٔ ''لولاب'' بھی شامل ہے۔

پانی تیرے چشموں کا، تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
بیدار ہوں دل جن کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

پھر ارشاد ہوا:

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھر تھر اتا ہے جہان چار سُو و رنگ و بو
آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

اقبال کو کشمیر کے ایک ایک قریہ اور شخصیّت سے اُلفت تھی خصوصاً حضرت شاہ ہمدان سے

بے حد عقیدت وارادت تھی جن کی کوششوں سے کشمیر میں اسلام پھیلا اور یہ ریاست ایک مسلم ریاست بنی ''جاوید نامہ'' میں حضرت شاہ ہمدان سے اقبال کا مکالمہ بڑا ایمان افروز اور حکمت سے لبریز ہے۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ علّامہ اقبال کے ایک دوسرے ممدوح حضرت مجدد الف ثانی سر ہندی نے بھی مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے انکار کر دیا تھا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر لی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ علّامہ اقبال نے اُن دو بزرگوں سے اپنی عقیدت و ارادت کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ اُن کی زیارت گاہِ عزم و ہمت کے نشانوں پر حاضری بھی دی۔ یہ درست ہے کہ علّامہ اقبال ختلان (تاجکستان) میں حضرت شاہ ہمدان کے روضہ پر نہ جا سکے اور سر ہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری دی لیکن علّامہ اقبال سری نگر میں اپنے قیام ۱۹۲۱ء میں خانقاہ معلیٰ میں گئے جو حضرت شاہ ہمدان کی یادگار اور ریاست جموں و کشمیر میں تحریکِ آزادی کی اولین منزل مانی جاتی ہے۔ ''ذخیرۃ الملوک'' اُن کی بہت معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔

اقبال کشمیر کی سیّاحت کے بہت خواہشمند تھے۔ اس خواہش کا اظہار انھوں نے مختلف احباب کو اپنے خطوط میں وقتاً فوقتاً اس طرح کیا۔

۵رمئی ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام لکھتے ہیں:

''امسال کشمیر کا قصد ہے۔ بشرطیکہ حالات نے مساعدت کی۔''

۱۹رجون ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ کشن پرشاد ہی کے نام لکھتے ہیں:

''یونیورسٹی کا کام تو ختم ہو گیا تھا اور شہزادی دلیپ سنگھ کا تار بھی چند روز ہوئے آیا تھا کہ جلد کشمیر آؤ مگر سردار جوگندر سنگھ جن کی معیت میں سفرِ کشمیر کرنے کا قصد تھا، شملے میں بیمار ہو گئے۔ اس واسطے خطۂ جنت نظیر کشمیر کے سفر کو خیر باد کہنا پڑا۔''

۱۴رجولائی ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ کشن پرشاد ہی کے نام لکھتے ہیں:

''گرمی کے موسم میں کشمیر کی سیر ہو اور آپ کے ہمرکاب تو اس سے بڑھ کر اور کیا مسرّت ہو سکتی ہے۔ خدا نے چاہا تو کبھی یہ موقع بھی آجائے گا۔''

۱۱رستمبر ۱۹۱۶ء کو خان محمد نیاز الدین خان کے نام لکھتے ہیں:

''میرا ارادہ تو شملہ جانے کا تھا۔ نواب ذوالفقار علی خان صاحب سے وعدہ تھا اور اُن کے خطوط اب تک بھی آرہے ہیں۔ مگر بھائی صاحب نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ اگست کا سارا مہینہ

سیالکوٹ میں قیام کرو۔ سو مَیں مع اہل و عیال ۲۹/اگست تک وہاں رہا۔ وہاں سے ستمبر شروع ہونے سے پہلے اس واسطے آ گیا کہ مولوی احمد دین وکیل ہمراہ ہو گئے تو ستمبر کا مہینہ کشمیر میں بسر کروں گا۔ مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے کشمیر چلے گئے ہیں۔ کل منشی سراج الدین میر منشی ریذیڈنسی کا خط آیا ہے کہ چند روز کے لیے چلے آؤ اور نیز یہ کہ چودھری شہاب الدین کو تار دیا ہے کہ وہ تم کو ہمراہ لے کر آ جائیں۔ چودھری صاحب غالباً ڈلہوزی میں ہیں۔ اُن کے انتظار میں ہوں کہ وہ آئیں تو اُن کے ہمراہ چند روز وہیں بسر کر آؤں"۔

۸/جون ۱۹۱۷ء کو فوق کے نام لکھتے ہیں:

"رسالہ رہنمائے کشمیر جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے نہایت مفید اور دلچسپ ہے۔ طرز بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لیے نہایت مفید ہوگا۔ افسوس کہ مَیں نے آج تک کشمیر کی سیر نہیں کی لیکن امسال ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچے۔"

۲۸/جون ۱۹۱۷ء کو گرامی کے نام لکھتے ہیں:

"کیا امسال کشمیر چلیں گے؟ اگر ارادہ ہو تو لکھئے۔ ممکن ہے کہ مَیں بھی آپ کا ساتھ دوں۔ کشمیر کی سیر کا آپ کی معیّت میں لُطف ہے۔ غنی کشمیری کی روح خوش ہوگی کہ گرامی جالندھری اِس کے مزار پر آئے ہیں۔"

۱۷/اکتوبر ۱۹۱۹ء کو مہاراجہ کے نام لکھتے ہیں:

"اب کے موسم گرما یہیں لاہور میں گزرا۔ کشمیر جانے کا قصد تھا مگر یارانِ طریقت ہم سفر نہ ہو سکے۔ اکیلے سفر کرنا اقبال سے ممکن نہیں"

۱۹/جولائی ۱۹۲۰ء کو مولانا گرامی کے نام لکھتے ہیں:

"اگست کے مہینے میں کشمیر جانے کا قصد ہے۔ دیکھیں ارادہ پورا ہوتا ہے یا نہیں۔"

۱۰/مارچ ۱۹۲۱ء کو شیخ عطا محمد کے نام لکھتے ہیں:

"جموں کے مقدمے میں تاریخ ۱۸/مارچ ملی تھی مگر مَیں اِس تاریخ پر نہ جا سکا تھا۔ وسط اپریل کی تاریخ طلب کی جو نہ ملی۔ اِس اثنا میں ایک مقدمہ شملہ کا مل گیا۔ ایک ہفتہ وہاں رہنا ہوگا۔ یہ مقدمہ وسط اپریل میں ہوگا۔ اِس کے بعد ریاست کی طرف سے مجھے تار ملا کہ آپ کی خواہش کے مطابق وسط اپریل ہی کی تاریخ مقرر ہوگی۔ اب مشکل ہے کہ شملہ کا مقدمہ قبول کر چکا ہوں۔ آج کشمیر سے ملزموں کی طرف سے خط ملا ہے کہ ریاست سے استدعا کیجیے کہ مقدمہ سری نگر میں ہو۔ آنے جانے کا خرچ موکل ادا کریں گے۔ بہر حال دیکھیں کس طرح ہوتا ہے۔"

۳۰/مارچ ۱۹۲۱ء کو شیخ عطا محمد ہی کے نام لکھتے ہیں:

''جموں کے مقدمے کی تاریخ کشمیر میں مانگی تھی مگر ریاست نے نہیں دی۔ ۱۸/اپریل مقرر کی ہے مگر اس تاریخ کو مجھے شملہ جانا ہوگا۔ اِس واسطے یہ مقدمہ واپس ہی کرنا ہوگا۔''

ایک عرصہ تک احباب کے اصرار، مہاراجہ کشمیر کی دعوت اور اپنی خواہش کے باوجود اقبال کشمیر نہ جا سکے بہر حال جون ۱۹۲۱ء میں وہ لمحہ آ ہی گیا کہ علّامہ نے کشمیر کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اِن کے اس تاریخی سفر کی وجہ دو مقدمات کی پیروی بیان کی جاتی ہے۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے مگر اس غیر معمولی سفر کی وجہ صرف ایک یا دو مقدمات تک محدود کرنا درست نہیں پنجاب میں بھی اقبال کو مقدمات لینے کی کمی نہیں تھی۔ کشمیر میں مقدمات لینے کی وجہ اُن کی اپنے آبائی وطن اور اس خطۂ جنت نظیر کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ جگہ دیکھنے کی بے قراری بھی تھی جہاں انہیں حضور سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے نماز کے لیے طلب فرمایا تھا۔ کیونکہ ۱۹۲۰ء کے وسط میں سری نگر کے ایک گاؤں (غالباً نوگام) کا پیرزادہ علّامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر زاروقطار رونا شروع کر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ مَیں نے عالم کشف میں نبی اکرم ﷺ کا دربار دیکھا، صف نماز کے لیے کھڑی ہوئی تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ محمد اقبال آیا یا نہیں؟ اس پر ایک بزرگ اقبال کو بلا لائے مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان جس کی ڈاڑھی مُنڈی ہوئی رنگ گورا تھا، اِن بزرگ کے ساتھ نمازیوں کی صف میں کھڑا ہو گیا کشمیری پیرزادے نے کہا مَیں نے آج تک آپ کو نہیں دیکھا تھا نہ آپ کا نام جانتا تھا۔ کشمیر میں ایک مولوی نجم الدین سے یہ ماجرا بیان کیا تو انھوں نے آپ کا نام لے کر بہت تعریف کی گو انھوں نے بھی آپ کو دیکھا نہیں تھا مگر آپ کی تحریروں کے حوالے سے بہت خوب جانتے تھے۔ اس سے مجھے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ آپ سے ملنے اور دیکھنے کے لیے لاہور تک کا سفر کیا۔ آپ کی صورت دیکھتے ہی میری آنکھیں اشک بار ہو گئیں کہ اللہ کے فضل سے میرے کشف کی بے اختیار عالمِ بیداری میں تصدیق ہو گئی۔

چنانچہ جون ۱۹۲۱ء میں اقبال اپنے منشی طاہر الدین اور مولوی احمد دین وکیل کے ہمراہ سری نگر گئے اور پندرہ روز سری نگر میں ایک ہاؤس بوٹ میں قیام کیا۔ اسی قیام گاہ میں بعض دفعہ شعر و سخن کی محفل بھی جمتی۔ اپنے قیام کے دوران علّامہ اقبال نے کشمیر کے موضوع پر تین نظمیں

اور ایک قطعہ تحریر کیا یہ نظمیں ’پیامِ مشرق‘ میں ’ساقی نامہ‘ ’کشمیر‘ اور ’غنی کشمیری‘ کے نام سے ہیں۔

’’ساقی نامہ‘‘ کے چند اشعار یہ ہیں:

زچشمِ امم ریخت آں اشک نابے　　که تاثیر اوگل دماند زخارے
کشمیری که بابندگی خو گرفته　　بتے می تراشد زسنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے　　خودی ناشنا سے، زخود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او　　نصیب تنش جامہِ تار تارے
نہ در دیدهٔ اُو فروغِ نگا ہے　　نہ دَر سینہ او دلِ بیقرارے

ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

(قوموں کی آنکھ سے وہ اشک ناب گرا جس کی تاثیر کانٹے (میں) سے پھول اُگاتی ہے۔ کشمیری جسے غلامی کی لت پڑ چکی ہے قبر کے پتھر سے بُت تراش رہا ہے (اس نے ہر سنگِ مزار کو اپنا معبود بنا رکھا ہے)۔ اس کا ضمیر بلند خیال سے خالی ہے وہ خودی سے انجان ہے، خود سے شرمسار ہے، اس کی محنت سے حاکم ریشمی قبا پہنتا ہے اس کے تن کا نصیب ایک تار تار لباس ہے۔ نہ اُس کی آنکھ میں نگاہ کی روشنی ہے نہ اس کے سینے میں ایک بے قرار دل ہے (اے ساقی) کشمیری پر اس شراب کی ایک بوند چھڑک کہ اس کی راکھ کوئی چنگاری (شرر) پیدا کرے۔ (اے خدا بندگانِ کشمیر کے دل میں آزادی کا جذبہ پیدا کر دے تا کہ وہ بھی اس دنیا میں عزت کی زندگی بسر کر سکیں)۔

سرما کی ہواؤں میں ہے عُریاں بدن اُس کا
دیتا ہے ہُنر جس کا امیروں کو دوشالہ

دوسری نظم ’’کشمیر‘‘ کے چند اشعار یہ ہیں۔

رخت بہ کاشمر کشا کوه و تل و دمن نگر
سبزه جہاں جہاں ببیں، لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج، مرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج، برسرنارون نگر

(کشمیر کا سفر اختیار کر پہاڑ اور ٹیلے اور وادیاں دیکھ۔ ہر طرف اگا ہوا سبزہ اور ہر چمن میں کھلے

ہوئے لالہ کے پھول دیکھ۔ موج موج بسنت کی ہوا فوج در فوج بہار کے پرندے دیکھ۔ انار کے درخت پر فاختہ اور مینا کے جوڑے جھنڈ کے جھنڈ دیکھ۔)

تیسری نظم ''غنی کشمیری'' کے عنوان سے ہے جس میں اِس مرد درویش کی خودی اور عظمت کا اعتراف کر کے کشمیریوں کو یہ درس دیا ہے کہ اپنی اِس متاعِ عزیز سے حمیّت وحریّت کا کام لو۔

علاّمہ محمد اقبال کی ''پیامِ مشرق'' کی ان کی نظموں کی اشاعت کے بعد ہی کشمیر کے ریشم سازی کے کارخانے میں بغاوت ہوئی۔ اِس سلسلہ میں جناب ممتاز حسن فرماتے ہیں۔ ایک روز علاّمہ موصوف فرمانے لگے کہ مَیں نے کشمیر کے متعلق جو نظم ''ساقی نامہ'' نشاط باغ میں بیٹھ کر لکھی تھی، اِس میں ریشم ساز کارخانوں اور کاریگروں کا ذکر بھی شامل تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعد میں کشمیر کی سیاسی تحریک وجود میں آئی تو اِس کی ابتداء ایک ریشم کے کارخانے میں کاری گروں کی بغاوت سے ہوئی۔ علاّمہ اقبال کو اپنے قیامِ کشمیر کے دوران خاص ادبی وشعری ماحول بھی میسّر آیا۔ جھیل ڈل کی سیر کے دوران ہی کہا۔

تماشائے ڈل کن بہ ہنگامِ شام
دہد شعلہ را آشیاں زیرِ آب
بشوید زتن تا غبارِ سفر
زند غوطہ در آبِ ڈل آفتاب

(اے سیر گاہ پر آنے والے۔ تو ڈل جھیل پر شام کے وقت لطف اندوز ہو۔ شام کے وقت غروب ہوتا ہوا سورج پانی کے اندر شعلہ کو آشیانہ عطا کرتا ہے یعنی سورج کی سنہری کرنیں پانی میں دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ سورج اپنے بدن کو سفر کے غبار سے دھونے کے لیے ڈل کی جھیل میں غوطہ لگاتا ہے۔)

صاحبزادہ محمد عمر راوی ہیں کہ جھیل ڈل کی سیر کے دوران ہی اُن کے پاس سے ایک شکارے میں کشمیری بچے اقبال کی نظم ''ہندی ترانہ'' گاتے جا رہے تھے۔ اقبال اِس غیر متوقع چیز کو دیکھ کے بے حد خوش ہوئے۔ اپنے قیام کے دنوں میں اِن کے تعلقات مشہور کشمیری شاعر غلام احمد مہجور سے ہوئے جنہیں علاّمہ محمد اقبال نے تذکرۂ شعرائے کشمیر لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔

سری نگر میں دو ہفتہ قیام کے بعد اور وہاں کے سیاسی حالات دیکھتے ہوئے کشمیر کے سر کردہ لوگوں سے روابط قائم کیے اور انہیں آنے والے حالات سے عہدہ برآ ہونے کا درس دیا۔

جولائی کو آپ نے مولانا گرامی جالندھری کو خط لکھا:

ڈیئر مولانا گرامی......نہ سلامے نہ پیامے

کل ''زمیندار'' میں آپ کی غزل دیکھی تو معلوم ہوا کہ آپ زندہ سلامت موجود ہیں۔ واللہ ذالک شیخ محمد اقبال کا خط میرے نام آیا تھا جس میں وہ ہوشیار پور کی دعوت دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ گرمی بہت ہے۔ ورنہ آپ کی زیارت کا ایک اور موقع مل جاتا۔ اِس کے علاوہ میں کشمیر سے بیمار واپس آیا۔ ٹانگ میں درد ہے جس کی وجہ سے چلنے پھرنے میں بھی دِقّت ہے۔ آج علاج شروع کیا ہے۔ شیخ محمد اقبال سے میری مجبوری کا ذکر کر دیجیے۔ اِن کے کارڈ کا جواب اِس واسطے نہ لکھ سکا کہ وہ کارڈ کہیں گم ہو گیا اور اُن کا پتہ مجھے یاد نہ تھا۔ اُمید ہے کہ گرامی اور گرامی کے نصف بہتر کا مزاج بخیر ہوگا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ محمد اقبال لاہور۔

۱۹۳۶ء میں علاّمہ اقبال نے دوبارہ کشمیر جانے کا پروگرام بنایا مگر ڈوگرہ حکومت نے اُن کے کشمیر میں داخلے پر پابندی لگائی ہوئی تھی کیونکہ اِسے خدشہ تھا کہ علاّمہ کے اِس دورے سے کشمیری مسلمانوں کے جذبۂ آزادی کو اور تحریک ملے گی۔ اِس ضمن میں شیخ محمد عبداللہ اپنی خود نوشت سوانح عمری ''آتشِ چنار'' میں لکھتے ہیں:

''مَیں نے انہیں کشمیر آنے کی دعوت دی۔ اُن کے کشمیر میں داخلے پر ۱۹۳۱ء سے پابندی تھی۔ اِس پابندی کو واپس لینے کی درخواست کی گئی لیکن مہاراجہ کی حکومت نے اکتوبر (۱۹۳۷ء) تک اِنہیں کشمیر آنے کا اجازت نامہ نہیں دیا اور جب اجازت نامہ آیا تو سردی کا زمانہ آ گیا تھا اور اقبال نے دوسرے سال کے لیے اپنا دورۂ کشمیر ملتوی کر دیا۔ اِنہیں کیا معلوم تھا کہ دوسرے سال وہ جنّتِ ارضی کے بدلے جنت الفردوس کی سیّاحت کے لیے بلا لیے جائیں گے۔ جب مَیں اُن سے رخصت ہوا تو اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ کشمیریوں کی نجات اِسی میں ہے کہ وہ ایک متحدہ تنظیم میں شیرازہ بند ہو جائیں''۔

☆☆☆

باب: ۷

امرتسر کا سفر

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے مقام پر کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس قرار پائے۔ اس موقع پر گاندھی، تلک، مسز بیسنٹ، موتی لال نہرو اور دوسرے بڑے بڑے راہنما کانفرنس میں شریک ہوئے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے صدارت کی۔ مسلم لیگ کا اجلاس منڈوہ کنہیا لال میں ہوا۔ حکیم اجمل خان نے صدارت فرمائی۔ ۳۰ ردسمبر ۱۹۱۹ء کو علی برادران (مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی) بھی بیتول (سی۔ پی) جیل سے رہا ہوئے۔ امرتسر ریلوے سٹیشن پر دونوں بھائیوں کا زبردست استقبال ہوا۔ دونوں بھائی پہلے جلیانوالہ باغ میں گئے اور وہاں شہیدوں کے لیے فاتحہ پڑھی۔

علاّمہ اقبال اور مرزا جلال الدین نواب سر ذوالفقار علی کی موٹر کار میں لاہور سے روانہ ہوئے کہ امرتسر کے سیاسی ہنگاموں کو دیکھ آئیں۔ امرتسر پہنچ کر جب مسلم لیگ کے اجلاس میں داخل ہوئے اور علاّمہ اقبال علی برادران کے ساتھ بغلگیر ہوئے تو جلسے میں جوش و خروش کا عجب سماں تھا۔ اکثر لوگ اشکبار تھے۔ علاّمہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعار آبدار فرمائے، جو اسی موٹر کے سفر میں موزوں ہو گئے تھے۔ یہ نظم ''بانگِ درا'' میں ''اسیری'' کے عنوان سے رقم ہے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زنداں صدف سے ارجمند
مُشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مُشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت، مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

''شہپر زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند''

☆☆☆

سفرِ جنوبی ہند

پس منظر

''مدراس مسلم ایسوسی ایشن'' جنوبی ہند کی بہت فعال اور متحرک تنظیم تھی۔ ممتاز صنعتکار اور سماجی شخصیت حاجی جمال محمد اس کے صدر اور جناب حمید حسن بی۔اے ایل ایل بی (علیگ) اس کے معتمد (سیکرٹری) تھے۔ حاجی جمال محمد کے والد بزرگوار جناب حاجی غلام محی الدین بھی نہایت مخیرّ، فیاض سیٹھ تھے علماء اور علم کے بہت قدردان تھے، قرآن فہمی اور تفسیر وعقائد کی تعلیم پر بے حد توجہّ اور عمل تھا۔ انھوں نے اس کام کے لیے مدرسہء جمالیہ، بھی قائم کیا اس کے استحکام کے لیے کافی املاک و جائیداد وقف کر دی اور اپنے بیٹے حاجی جمال محمد کو اس مدرسہ اور وقف کا انچارج مقرر کیا۔ سب سے بڑی فیاضی جو پبلک میں حکیم اجمل کے ذریعہ مشتہر ہوئی وہ ترکی ہلالِ احمر وفد کو ایک لاکھ روپے کا عطیّہ تھا۔ اس عطیہ کا سہرا خاص طور پر حاجی جمال محمد کے سر تھا۔

حاجی جمال مسلم ایسوسی ایشن کے علاوہ ، ساؤتھ انڈین چیمبر آف کامرس اور ساؤتھ انڈین مرچنٹس ایسوسی ایشن کے صدر اور مرکزی بینکنگ تحقیقاتی کمیشن کے رُکن بھی رہے۔ سیٹھ جمال محمد دیگر خیراتی کاموں کے علاوہ معروف مسلم علمی شخصیتوں کو مدراس میں مدعو کر کے اُن سے اسلام سے متعلق موضوعات پر خطبات دلواتے تھے۔ چنانچہ اس نیک مقصد کے لیے وہ شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی کو بھی بلاتے رہے۔

اس سے پہلے ۱۹۱۶ء میں کولمبیا یونیورسٹی نیو یارک سے نکلس پی اغنیدس (Nicholas P. Aghnides) کی ایک کتاب ''مسلمانوں کے نظریاتِ مالیات'' (Mohammedan Theories of Finance) شائع ہو چکی تھی۔ چودھری رحمت علی خان جو عرصۂ دراز سے امریکہ میں مقیم تھے اور امریکہ کی مسلم ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ اُنہوں نے یہ کتاب راؤ علی محمد خاں (جو امریکی مسلم

ایسوسی ایشن کے سیکرٹری تھے اور ایک عرصہ سے امریکا میں مقیم تھے) کی ۱۹۲۲ء کے آخر میں بّرِصغیر آمد پر اقبال کو بھیجی اور اُس کے سرِ ورق پہ لکھا ''اس کتاب کا ماخذ: الھدایہ، فقہ الاکبر امام اعظم، الدر المختار، قدوری اور مسند امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی مستند کتب ہیں'' راؤ علی محمد خاں نے یہ کتاب اقبال کو پہنچانے کے لیے ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے حوالے کی۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں جب اقبال نے لاہور میں اپنی نظم ''طلوعِ اسلام'' انجمن حمایتِ اسلام کے جلسہ میں پڑھی تو مذکورہ کتاب ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے راؤ علی محمد خان کی موجودگی میں اقبال کو پیش کی۔ اقبال نے کتاب کو دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا اور اُسی وقت اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے لکھا۔ ''مَیں وہاں سے نکل کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا اور پھر بعد دو پہر ۴۔۳ بجے کے قریب اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

''ماسٹر! وہ کتاب جو تم دے گئے تھے بہت دلچسپ ہے۔ اس میں ایک مقام ہے، جس کی تحقیق لازمی ہے''۔

کتاب کے صفحہ ۹۱ پر اقبال نے درج ذیل عبارت پر نشان لگا رکھا تھا:

As regards the ijma, some hanifites and the mu,tazilites held that the ijma can repeal the koran and sunnah.

یہ اقتباس اقبال کے لیے علمی جستجو کا باعث بن گیا اور جو شخص بھی اقبال سے ملنے آتا اُس سے اِس موضوع پر خوب گفتگو اور بحث ہوتی۔ اقبال نے اس پہلو پر تحقیق شروع کی اور بہت سے نامور علماء سے استفسار کیا۔

تحقیق و بحث کے بعد اقبال نے ۱۳؍دسمبر ۱۹۲۴ء کو ایک انگریزی مقالہ بعنوان ''اسلام میں اجتہاد'' لاہور میں پڑھا۔ اس کی سرسری تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی۔ غالبًا یہی تفصیل مدراس کے بہت بڑے تاجر سیٹھ جمال محمد کی نظر سے گزری۔ سیٹھ جمال محمد صرف بین الاقوامی تاجر ہی نہ تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے علم و فضل کے مالک اور فہم قرآن بھی رکھتے تھے۔ علّامہ اقبال نے اِن کے متعلق فرمایا تھا:

''اللہ اللہ یہ انسان ایک کروڑ سالانہ کی تجارت کرتا ہے۔ تہہ کُرتا پہنتا ہے اور حقیقتِ رُوح اور مادہ جیسے مسائل پر انگریزی اور اُردو میں گفتگو کرتا ہے۔ اس کو فکر دامن گیر ہے کہ مسلمانوں کی

قدیم اور نئی تعلیم کا حقیقی اتصال ہو اور اسلام اپنی اصلی شان میں دُنیا پر ظاہر ہو۔ مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ قسم پیدا نہ ہو گی، نصب العین تک رسائی محال ہے''۔

سیٹھ جمال محمد نے اوائل ۱۹۲۵ء میں اقبال کو مدراس آ کر اجتہاد کے موضوع پر مقالات پڑھنے کی دعوت دی اور تمام اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ اقبال نے دعوت قبول کر لی، لیکن خطبات کی تعداد اور تاریخ کا تعین مستقبل پر چھوڑ دیا۔ مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت بلکہ اصرار پر علاّمہ اقبال نے ''الٰہیاتِ اسلامیہ اور فلسفۂ جدیدہ'' پر چھ لیکچرز دینا قبول کر لیے اِن خطبات کو دینے کا ابتدائی پروگرام ۱۸/دسمبر ۱۹۲۸ء سے تھا۔ لیکن جیسے ہی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کو اس کا علم ہُوا تو انھوں نے علاّمہ سے اس پروگرام میں تبدیلی کی درخواست کر دی کیونکہ ۱۳/دسمبر سے جامعۂ عثمانیہ میں تعطیلات ہو رہی تھیں اُن کا اصرار تھا کہ اگر پروگرام تبدیل نہ ہوا تو طلباء اور اساتذہ کی کثیر تعداد ان خطبات کی سماعت سے محروم رہ جائے گی چنانچہ علاّمہ اقبال نے اِن خطبات کو جنوری ۱۹۲۹ء میں دینے کا فیصلہ کیا۔

علاّمہ سیّد سلیمان ندوی سے مُراسلت

خطبات کی تیاری کے لیے اقبال نے وقتاً فوقتاً سیّد سلیمان ندوی سے جو سوالات پوچھے ان کا مطالعہ خطبات کو سمجھنے کے لیے اہم ہو گا، ان سوالات کا خلاصہ درجہ ذیل ہے:

''قرآن کتابِ کامل ہے اور وہ خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ اس کا کمال عملی طور پر ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاملات کے اصول پر جو دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، قرآنی نقطۂ نظر سے تنقید کی جائے۔ اس کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جائیں۔

متکلمین میں سے بعض نے علمِ مناظرہ و مرایا کی رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کو دیکھ سکنا ممکن ہے، یہ بحث کہاں ملے گی؟ رویتِ باری کے متعلق جو استنفسار کیا گیا اس کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس بحث میں کوئی ایسی بات نکل آئے جس سے آئن سٹائن کے انقلاب انگیز ''نظریہ نُور'' پر کچھ روشنی پڑے۔ اس خیال کو ابنِ رُشد کے ایک رسالے سے تقویت ہوئی جس میں انھوں نے ابوالمعالی کے رسالے سے ایک فقرہ اقتباس کیا ہے۔ ابو المعالی کا خیال آئن سٹائن سے بہت ملتا جلتا ہے۔ گو اوّل الذکر کے ہاں یہ بات محض ایک قیاس

ہے اور مؤخرالذکر نے اس کو ریاضی کی رو سے ثابت کر دیا ہے۔

کیا اجماعِ اُمت، نصِ قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے؟ مثلاً مدتِ شیر خوارگی جو نصِ صریح کی رُو سے دو سال ہے کم یا زیادہ ہو سکتی ہے، یا حصصِ میراث میں کمی بیشی ہو سکتی ہے؟ بعض حنفا اور معتزلہ کے نزدیک اجماعِ امت یہ اختیار رکھتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں ایسا کوئی حوالہ موجود ہے؟ ایسی تخصیص یا تعمیم کی کوئی مثال: کیا ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماعِ صحابہؓ ہی کر سکتا ہے یا علماء مجتہدینِ اُمت بھی کر سکتے ہیں؟ مسلمانوں کی تاریخ میں صحابہ کرامؓ کے بعد کوئی ایسی مثال ہو تو آگاہ کیجیے۔ تخصیص یا تعمیمِ حکم سے کیا مراد ہے؟ اگر صحابہ کرامؓ کا کوئی حکم نص کے خلاف ہو تو اس سے یہ مراد لی جائے گی کہ کوئی ناسخ حکم ان کے علم میں ہوگا۔ کیا کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ کرامؓ نے نصِ قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو؟

حضور سرورِ کائنات ﷺ نے کسی دریافت کردہ مسئلے کا جو جواب وحی کی بنا پر دیا وہ تمام اُمت پر حجت ہے اور وہ وحی بھی قرآن مجید میں داخل ہوگئی، لیکن جو جواب محض استدلال پر دیا گیا، جس میں وحی کو دخل نہیں، کیا وہ بھی تمام اُمت پر حجت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں یا بالفاظِ دیگر یہ کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں۔ نبوت اور امامت، نبوت میں احکامِ قرآنی اور آیاتِ قرآنی سے حضور نبی کریم ﷺ کے استنباط داخل ہیں۔ اجتہاد کی بنا محض عقلِ بشری اور تجربہ و مشاہدہ، کیا یہ بھی وحی میں داخل ہے؟ اگر وحی میں داخل ہے تو اس پر آپ کی دلیل کیا ہے؟ وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں؟

حضور نبی کریم ﷺ نے اذان کے متعلق صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا، کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت آئے گا یا امامت کے تحت میں؟

آیۂ توریث میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے، صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے؟ آیۂ وصیّت کی وضاحت کیجیے!

کیا امام کو اختیار ہے کہ قرآن کی کسی مقرر کردہ حد (مثلاً سرقہ کی حد) کو ملتوی کر دے اور اس کی جگہ کوئی اور حد مقرر کر دے؟ اس اختیار کی بنا کون سی آیتِ قرآنی ہے؟

امام ایک شخصِ واحد ہے یا جماعت بھی امام کی قائم مقام ہو سکتی ہے؟ ہر اسلامی ملک کے لیے اپنا

امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک امام ہونا چاہیے؟ مؤخر الذکر صورت موجودہ فریقِ اسلامیہ کی موجودگی میں کیسے بروئے کار آ سکتی ہے؟ حضرت عمر فاروقؓ نے طلاق کے متعلق جو طریقہ اختیار کیا، اگر اس کا اختیار انہیں شرعاً حاصل تھا تو اس اختیار کی اساس کیا تھی؟ زمانۂ حال کی زبان میں آیا اسلامی کانسٹی ٹیوشن ان کو ایسا اختیار دیتی تھی؟

فقہا کے نزدیک خاوند کو جو حق اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ہے، وہ بیوی کو یا اس کے کسی خویش یا کسی اور آدمی کے حوالے کیا جا سکتا ہے، اس مسئلہ کی بنا کوئی آیتِ قرآنی ہے یا حدیث؟

امامِ اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچے کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلے کی اساس کیا ہے؟ کیا یہ اصل محض ایک قاعدۂ شہادت ہے یا جزوِ قانون ہے؟

''شمس بازغہ'' یا ''صدرا'' میں جہاں زمان کی حقیقت کے بہت سے اقوال نقل کیے گئے ہیں ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے ''بخاری'' میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ملتی ہے، لا تسبوا الدھر...... الخ، کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟

قرونِ وسطیٰ کے ایک یہودی حکیم موسیٰ بن میمون نے لکھا ہے کہ ''خدا کے لیے کوئی مستقبل نہیں ہے بلکہ وہ زمان کو لحظہ بہ لحظہ پیدا کرتا ہے''۔ میمون نے قرطبہ میں مسلم یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی، اس لیے کیا اس کا یہ مذہب بھی کسی مسلم حکیم کی خوشہ چینی ہے؟

مولانا شبلی نے ایک فقرہ شعائر وارتفاقات کے متعلق نقل کیا ہے:

''**هو شعائر الدين امر ظاهر تخص به و يمتاز صاحبه به من سائر الاديان كالختان و تعظيم المساجد و الاذان و الجمعة و الجماعات**''۔ کیا یہ شاہ ولی اللہ کی اپنی تشریح ہے؟ اسی طرح ارتفاقات میں شاہ ولی اللہ کی تشریح کے مطابق تمام تدابیر جو سوشل اعتبار سے نافع ہوں، داخل ہیں، مثلاً نکاح وطلاق کے احکام وغیرہ۔ اگر شاہ ولی اللہ کی یہ تشریح صحیح ہے تو سوسائٹی کا کوئی انتظام نہ رہے گا اور ہر ایک ملک کے مسلمان اپنے اپنے دستور ومراسم کی پابندی کریں گے، اس کی وضاحت کیجیے۔

''الکلام'' (یعنی علمِ کلام جدید) میں مولانا شبلی نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے صفحہ ۱۲۳ کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا ہے، جس کے مفہوم کا خلاصہ انھوں نے اپنے الفاظ میں بھی دیا ہے اس کے آخری حصے کا ترجمہ یہ ہے:

''اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعائرِ تغیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے، جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے''۔ اس فقرے میں لفظ شعائر سے کیا مراد ہے، اور اس کے تحت کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں؟ کیا ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں کسی جگہ شعائر کی تشریح شاہ ولی اللہ نے کی ہے؟ شاہ ولی اللہ نے لفظ ارتفاقات استعمال کیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے ایک جگہ اس کا ترجمہ انتظامات اور دوسری جگہ مسلمات کیا ہے۔ ان کا اصل مقصود کیا ہے؟

شاہ ولی اللہ نے ارتفاقات کی چار قسمیں لکھی ہیں، ان چار قسموں میں تمدنی امور مثلاً نکاح، طلاق وغیرہ کے مسائل بھی آجاتے ہیں۔ کیا ان کے خیال میں ان معاملات میں بھی سخت گیری نہیں کی جاتی؟ محی الدین ابن عربی کی ''فتوحات'' یا کسی اور کتاب میں حقیقتِ زمان کی بحث کس کس جگہ ہے؟

ہندوستان میں بڑے بڑے اشاعرہ کون کون سے ہیں؟ مُلّا جونپوری کو چھوڑ کر کیا اور فلاسفہ بھی ہندی مسلمانوں میں پیدا ہوئے؟ اُن کے اسماء تصانیف سے مطلع فرمایئے۔ ہندی مسلم فلسفی ساکن پھلواری مصنّف ''تسویلاتِ فلسفہ'' کا نام کیا ہے؟ کتاب مذکورہ کا نسخہ کہاں سے دستیاب ہوگا؟ مولوی نورالاسلام کا عربی رسالہ بابت ''مکان'' جو رام پور میں ہے، کس زبان میں ہے؟ قلمی ہے یا مطبوعہ۔ مولوی نورالاسلام کا زمانہ کون سا ہے؟ مسئلہ آن کے متعلق ابھی تک مشکلات باقی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ پر جو اعتراض ہمارے متکلّمین نے کیے، وہ مسئلہ زمان کے متعلق خود اُن کے افکار پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ مولوی سیّد برکات احمد نے دہر اور زمان میں امتیاز کر کے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مسئلہ نہایت مشکل ہے۔ اس پر مزید روشنی ڈالیے۔ اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان اور مکان دونوں کی حقیقتِ اصلیہ دہر ہی ہے۔ کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے خیال کے مطابق صحیح ہے؟ کیا انھوں نے مکان پر بھی بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے؟ مَیں نے زمان و مکان کے مسئلے کے متعلق مطالبہ کیا ہے، جس سے ظاہر ہوا کہ ہندوستان کے مسلم فلسفیوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔ یہ کام آپ کو کرنا چاہیے۔

آپ نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اُسے معلوم ہو کہ بعض شرعی

اجازتوں میں فساد کا امکان ہے تو ان اجازتوں کو عارضی طور پر منسوخ کر دے، بلکہ بعض فرائض کو بھی یوں ہی منسوخ کر سکتا ہے۔اس کا حوالہ کہاں ملے گا؟
کیا یہ صحیح ہے کہ متعہ (نکاح مؤقت) حضرت عمر فاروقؓ سے پہلے مسلمانوں میں مروّج تھا اور حضرت عمر فاروقؓ نے اسے منسوخ کر دیا؟ زمانۂ حال کا کوئی امیر بھی کسی امر کی نسبت ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔
ان معاملات کی ایک فہرست دیجیے جن کے متعلق رائے قائم کرنا امام کے سپرد ہے۔ جرائم میں ایسے جرم ہیں جن کی تعزیر قرآن شریف میں مقرر ہے، ان کے متعلق امام کیوں کر کوئی رائے دے سکتا ہے؟ تواترِ عمل کی ایک مثال آپ کے نزدیک نماز ہے۔ مالکیوں، حنفیوں اور شیعوں میں جو اختلاف صورتِ نماز میں ہے، وہ کیوں کر ہوا؟
احکامِ منصوصہ میں توسیع اختیاراتِ امام کے اصول کیا ہیں؟ اگر توسیع کر سکتا ہے تو اُن کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے۔ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح کیجیے؟ زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ اسلامی فقہا کا مذہب اس بارے میں کیا ہے؟ ''قاضی مبارک'' میں شاید اس کے متعلق کوئی فتویٰ ہے، وہ فتویٰ کیا ہے؟ اگر کوئی اسلامی ملک (رُوس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیّت قرار دے تو کیا یہ بات شرعِ اسلامی کے موافق ہوگی یا مخالف؟ کیا یہ بات بھی امام کی رائے کے سپرد ہوگی؟
صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں، صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے؟ لفظ نبی کے دو معنی ہیں، خبر دینے والا اور مقامِ بلند پر کھڑے ہونے والا۔ اوّل الذکر نبی ہمزے کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزے کے۔ اس ضمن میں راغب اصفہانی نے ''مفردات'' میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے، یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں نبی بغیر ہمزے کے ہوں'' قرآن شریف میں جن انبیا علیہ السلام کا ذکر ہے ان میں کون سے نبی بالہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب کے سب بغیر ہمزے کے ہیں؟ اگر قرآنی انبیا علیہم السّلام نبی بغیر ہمزہ ہیں تو لفظ نبی کا مروّجہ انگریزی لفظ ''پرافٹ'' جس کے معنی خبر دینے والا کے ہیں، کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟ لفظ نار کا رُوٹ عربی زبان میں کیا ہے؟ لفظ نجات کا رُوٹ کیا ہے اور رُوٹ کی رُو سے کیا معنی ہیں؟''

خطبات کے موضوعات

مولانا سلیمان ندوی کو بھیجے گئے سوالات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کے موضوع پر خطبات تیار کرتے وقت اقبال کے سامنے کس قسم کے مسائل تھے۔

خطبات کوتحریر کرنے میں تقریباً پانچ سال لگے۔ان خطبات کے موضوع مندرجہ ذیل ہیں۔

۱-علم اور مذہبی مشاہدات

(Knowledge and Religious Experience)

۲-مذہبی تجربات کے کشف والہامات کا فلسفیانہ امتحان

(The Philosophical Test of the Revelation of the Religious Experience)

۳-تصوّرِ باری تعالیٰ اور دُعا کا مفہوم

(The concept of God and the meaning of Prayer)

۴-خودی، جبر واختیار اور حیات بعد الموت

(The Human Ego, his freedom and immortaility)

۵-اسلامی ثقافت کی رُوح

(The Spirit of Muslim Culture)

۶-اسلام کی تعمیر میں اصولِ حرکت

(The Principle of Movement in the Culture of Islam)

وعدہ چھ مقالات کے لکھنے کا تھا لیکن جنوری ۱۹۲۹ءتک صرف تین خطبات ہی لکھے جا سکے جو مدراس میں پڑھے گئے پھر نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ میں چھ خطبات (بشمول تین خطباتِ مدراس) دیے گئے۔تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ، ایک مشکل کتاب ہے کیونکہ اس میں مشرق و مغرب کے ڈیڑھ سو سے زائد قدیم وجدید فلسفیوں، سائنس دانوں، عالموں اور فقیہوں کے اقوال ونظریات کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

خطبات کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال دیباچے میں تحریر کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم فکر کے مقابلے میں عمل پر زیادہ زور دیتا ہے مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں اس زاویۂ نگاہ کو ترقی دی اور علماء وصوفیہ نے دین وایمان کی اساس باطنی وجدان پر رکھی۔آج پھر ضرورت ہے کہ علم دین کو سائنسی یا فلسفیانہ استدلال کے طور پر پیش کیا جائے۔

لاہور سے روانگی

آپ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء کی صبح لاہور سے دہلی پہنچے اور وہاں دو دن مسلم کانفرنس کے معاملات میں مصروف رہے۔اقبال دہلی سے ۲رجنوری ۱۹۲۹ء کی صبح کو فرنٹیئر میل سے مدراس

روانہ ہوئے۔ چودھری محمد حسین ایم۔اے، محمد عبداللہ چغتائی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اور علی بخش آپ کے ہمراہ تھے۔

۳/جنوری ۱۹۲۹ء کو دوپہر کے وقت وہ کولامبار (بمبئی) پہنچے۔ سیٹھ اسماعیل کے صاحبزادے سیٹھ ہاشم اسماعیل اسٹیشن پر استقبال کے لیے موجود تھے، کیونکہ پہلے ہی سے یہ طے پایا تھا کہ بمبئی میں اقبال جتنا عرصہ ٹھہریں گے انھی کے مہمان ہوں گے۔ سب نے دوپہر کا کھانا سیٹھ ہاشم اسماعیل کے ہاں کھایا۔ سیٹھ ہاشم اسماعیل کی اہلیہ بمبئی کے ایک مشہور سوداگر حاجی یوسف سبحانی کی بیٹی اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم جرمنی میں حاصل کی تھی۔ جب اقبال کھانے سے فارغ ہو چکے تو بیگم ہاشم اسماعیل نے گوئٹے کی تصنیف ''فاؤسٹ'' انہیں اس درخواست کے ساتھ بھجوائی کہ اس پر اپنے ہاتھ سے اپنا کوئی شعر لکھ دیں اقبال نے یہ شعر تحریر کیا:

کلام و فلسفہ از لوحِ دل فروشستم
ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق

ترجمہ: مَیں نے اپنے دل کی تختی سے کلام وفلسفہ کو دھوڑالا اور تحقیق کے نشتر سے اپنے ضمیر کو کشادہ کرلیا۔

اور ساتھ ہی فرمایا: یہ وہ نتیجہ ہے جس پر فاؤسٹ کو پہنچنا چاہیے تھا، مگر وہ نہ پہنچ سکا۔ شام کو پانچ بجے سیٹھ ہاشم اسماعیل نے اقبال کے اعزاز میں گرنیز ہوٹل (متصل تاج ہوٹل) میں ایک پُرتکلف چائے کی دعوت کا اہتمام کیا تھا، جس میں بمبئی کی اہم شخصیات شریک ہوئیں۔ اس کے بعد آٹھ بجے شب اقبال مسلم فیڈریشن بمبئی کے کھانے پر گئے۔ رات دس بجے وہ مدراس میل کے ذریعے مدراس کے سفر پر روانہ ہوئے، وہ رات، اگلا دن اور اگلی رات گاڑی میں گزری۔

مدراس آمد

۵/جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح ساڑھے سات بجے اقبال خطبات کے سلسلے میں مدراس پہنچے۔ اقبال کا استقبال کرنے کے لیے کچھ محبان مدراس سے ایک سٹیشن پہلے ہی باسن برج کے مقام پر ٹرین میں اقبال کے ہمنشین ہو لیے تاکہ اُن کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارا جائے اور اُن کے خیالات سے استفادہ ہو سکے۔ اِن پیش بینوں میں سیّد محمد اسمٰعیل بھی تھے ان کی بیٹی

حجاب اسمٰعیل (جو بعد میں حجاب امتیاز کے نام سے معروف ہوئیں) بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ حجاب اس وقت کانونٹ میں پڑھتی تھیں وہ لکھتی ہیں کہ ہم لوگ علاّمہ کو ٹرین کے درجہ اول میں تلاش کرتے رہے مگر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ علاّمہ درجہ دوم میں سفر کر رہے ہیں۔ حجاب کہتی ہیں مَیں نے اپنے والد کے کان میں سرگوشی کرتے ہُوئے کہا اگر کوئی انجمن مجھے درجہ دوم کا ٹکٹ دے کر بُلواتی تو مَیں صاف انکار کر دیتی۔ مگر میرے والد نے کہا کہ بڑے لوگ اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دوسری حیرت مجھے یہ ہوئی کہ علاّمہ اعلیٰ درجہ کا سوٹ زیب تن نہیں کیے ہوئے تھے اور نہ ہی ہاتھ میں سگار لیے ہوئے تھے۔ بلکہ سادہ پنجابی شلوار کُرتے پر واسکٹ اور پاؤں میں دیسی جُوتا پہنے تھے۔ لوگ چیونٹیوں کی طرح اقبال پر چڑھ دوڑے اور اُنھیں پھُولوں کے ہار سے لاد دیا۔ علاّمہ نے بہت سے ہار میرے گلے میں بھی ڈال دیے۔ لیکن جب مَیں نے ٹرین اور اس کے بعد اُن کے قیامِ مدراس کے دوران میں ان سے باتیں کیں تو اُن کی گفتگو بہت ہی شائستہ، شگفتہ اور معلومات افزا پائی۔ حجاب کہتی ہیں کہ مَیں نے علاّمہ سے پوچھا آپ ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' جیسی نظمیں کیسے لکھ لیتے ہیں تو انھوں نے مُسکرا کر کہا اب میں قائل ہو گیا ہوں کہ کانونٹ کی تعلیم نے آپ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ آخر میں جاتے ہوئے انھوں نے کہا ''مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، آپ ایک پُرجوش اور جوشیلی بچی ہیں''

مدراس اسٹیشن پر ایک ہجوم اُن کے استقبال کے لیے موجود تھا جس میں بیشتر مسلمان تھے اور جنھوں نے ترکی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ مدراس کے اکثر علماء وفضلا اور امراء ورؤساء بھی موجود تھے۔ اقبال کے لیے گاڑی سے اترنا مشکل ہو گیا تھا۔ اتنے میں سیٹھ جمال محمد کے صاحبزادے اور ان کے سیکرٹری عبدالحمید حسن گاڑی کے اندر آ گئے اور انھوں نے اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ بڑی مشکل سے انہیں گاڑی سے باہر نکالا گیا۔ عبدالحمید حسن نے لوگوں سے مخاطب ہو کر بآوازِ بلند کہا کہ رستہ چھوڑ دیں تاکہ ہر شخص کو اقبال سے ملنے کا موقع مل سکے۔ پھر پلیٹ فارم پر عمائدین ومعززین کا تعارف اقبال سے کرایا گیا۔ بعد ازاں وہ سیٹھ جمال محمد کے ساتھ موٹر کار میں اپنی قیام گاہ بوسوٹو ہوٹل پہنچے، جو سیٹھ جمال محمد ہی کی ملکیّت تھا۔ ناشتا یہیں کیا گیا۔ دوپہر کا کھانا سیٹھ جمال محمد کی عالی شان رہائش گاہ پر تھا۔ چار بجے شام

مدرسہ جمالیہ میں دعوتِ چائے تھی۔ یہ مدرسہ یتیم اور غریب مسلم طلبہ کے لیے سیٹھ جمال محمد کے والد نے ایک وقف کی صورت میں قائم کیا تھا اور کئی عمارتوں پر مشتمل تھا، جن میں جمالیہ ہوسٹل کی عمارت بھی شامل تھی۔ ہوسٹل میں مدراس کے کالجوں کے مستحق مسلم طلبہ مفت اقامت گزیں تھے اور سکونت کے علاوہ انہیں کھانا بھی سیٹھ جمال محمد کی طرف سے ملتا تھا۔ مزید برآں ہر طالب علم کو سات روپے ماہوار کالج کی فیس کی ادائیگی کے لیے دیے جاتے تھے۔ ہال میں اسلامی کتب کی ایک بڑی لائبریری تھی۔ مدرسہ میں اسلامیات کے مضمون کے لیے ندوہ کے فارغ التحصیل مدرّس تھے اور انگریزی یا ریاضی وغیرہ ایسے مضامین پڑھانے کے لیے ہندو مدرّس بھی رکھے گئے تھے۔ اقبال اساتذہ اور طلبہ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

خطباتِ مدراس

پانچ بجے شام گوکھلے ہال میں اقبال کا پہلا خطبہ ''علم اور مذہبی مشاہدات'' (Knowledge and Religious Experience) کے موضوع پر تھا۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان میں بیشتر مسلمان تھے، لیکن ہندو بھی کم تعداد میں نہ تھے۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر سبرائن چیف منسٹر مدراس نے انجام دیے۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوا۔ اقبال نے ایک گھنٹے سے زائد اپنا مقالہ پڑھنے میں لیے۔ آخر میں ڈاکٹر سبرائن نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

میرے لیے باعثِ عزّت ہے کہ ہندو ہونے کے باوجود اسلامی فلسفے پر لیکچر کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا ہوں۔ مَیں خوش ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ صحیح ہے۔ اسلام نے مشرق کو بلکہ ساری دنیا کو اخوت کا سبق دیا ہے۔ ہم ہندو ذات پات اور قومی امتیازات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر سے اخوت کا سبق سیکھنا ہے۔ مَیں یہاں غیر برہمن کی حیثیت سے تقریر نہیں کر رہا اور نہ اس نقطۂ خیال سے ذات پات کے خلاف کہہ رہا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے اور تمام ہندوستانی اقوام میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہمیں اسلامی اخوت کو دلیلِ راہ بنانا ہے۔

جلسے کے اختتام پر عبدالحمید حسن نے پہلے سے تیار کردہ مقالے کے خلاصے کی نقول اخباری نمائندوں کو دیں۔ رات کو نہایت پُرتکلّف دعوت عبدالحمید حسن کی طرف سے تھی اور اس میں جدّت

یہ تھی کہ اردو میں مطبوعہ نظام طعام کا کارڈ ہر مہمان کے سامنے میز پر رکھا تھا۔ کارڈ پر یہ تحریر تھا۔

نظامِ طعامِ دعوتِ اقبال

شنبہ ۵؍جنوری ۱۹۲۹ء	مقام دوکوچہ دانیار
شیرازی شربت	ہندی مرغ و نان
مدراسی بریانی دلی بریانی	گاجر حلوہ
زعفرانی پیوسی	فواکہات
ہندوستانی قلفی	

المکلّف عبدالحمید حسن

اقبال ۸؍جنوری ۱۹۲۹ء تک مدراس میں رہے اور چار دن نہایت مصروفیّت کے عالم میں گزرے۔ ۶؍جنوری ۱۹۲۹ء کو گوکھلے ہال میں انھوں نے دوسرا مقالہ ''مذہبی تجربات کے کشف والہامات کا فلسفیانہ امتحان''

(The Philosophical Test of the Revelation of the Religious Experience)

پڑھا۔ اسی دن صبح اخبار ''سوراجیہ'' کے خصوصی نمائندے کو انٹرویو بھی دیا، جس میں فرمایا کہ وہ مذہب کو سوراج پر مقدّم خیال کرتے ہیں اور انہیں ایسے سوراج سے کوئی واسطہ نہیں جو مذہب سے بے نیاز ہو، مگر اس کے ساتھ ایشیا کے لوگ یورپ کے خالص مادی روّیے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے، اس لیے اُن کے سامنے اصل مسئلہ یہی ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح یکجا کیا جائے۔ اقبال کے نزدیک جدید ترکِ روحانیت اور مادیّت کے مطلوبہ اجتماع کو حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ بہر حال وہ اُن کی طرف سے مایوس نہیں ہیں، مگر اُن کے عقیدے کے مطابق باشندگانِ ہندوستان اس کارِ عظیم کو انجام دے سکتے ہیں اور پرانی دنیا کے کھنڈروں پر نئے آدم کے لیے نئی دنیا تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اُن کی رائے میں نوجوانوں کی ایسی باتیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاسیات پر دینی چاہیے، یورپ کی غلامانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ ترکوں کی ناکامی کی زبردست وجہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے یورپ کی نقالی شروع کر دی تھی۔ اگر وہ اس مسئلہ کا حل اسلام کی وساطت سے ڈھونڈتے تو معاملہ مختلف ہوتا، کیونکہ اسلام تخیل اور حقیقت یعنی روحانیت اور مادیت کے

درمیان تطابق پیدا کرنے کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کو زندہ رہنے کی خاطر دنیائے جدید میں داخل ہونا پڑے گا، لیکن اس داخلے کے وقت صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو عہدِ حاضر کو بنانے اور بگاڑنے والی قوتوں سے پورے طور پر باخبر ہوں گے۔ پان اسلامزم سے متعلق سوال کے جواب میں ارشاد کیا کہ اس لفظ کے متعلق یورپ اور ایشیا میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے یہ اصطلاح ایک فرانسیسی اخبار نویس نے وضع کی تھی اور اس کا مقصد یورپ کو مسلم اقوام کے اتحاد کے خیالی اندیشہ سے متنبہ کرنا تھا۔ سو یہ لفظ بھی ''زرد خطرے'' کی طرح تھا جو ایسے ہی مقصد کے لیے گھڑا گیا تھا۔

جہاں تک معانی کا تعلق ہے پان اسلامزم کی کوئی تحریک موجود نہیں۔ کیمبرج کے پروفیسر براؤن بھی اس خیال کو بے بنیاد ثابت کر چکے ہیں۔ اگر اس لفظ کے کوئی معنی ہیں تو یہی کہ اخوتِ اسلام کا دوسرا نام پان اسلامزم ہے۔ لفظ پان اسلامی لغت میں موجود نہیں کیونکہ اسلام اس تجربے کا نام ہے جو نسل، رنگ، زبان، قوم اور ملک سے بالا ہو کر انسان کو یکجا کرنے کے لیے کیا گیا۔

۷؍جنوری ۱۹۲۹ء کو اقبال نے گوکھلے ہال میں اپنا تیسرا مقالہ بعنوان ''تصورِ باری تعالیٰ اور دُعا کا مفہوم'' (The concept of God and the meaning of Prayer) پڑھا۔ تینوں لیکچروں میں عظیم الشان اجتماع دیکھنے میں آیا اور مدراس کے اکثر و بیشتر انگریزی اخباروں میں لیکچروں کے اقتباسات شائع ہوتے رہے۔

انجمنِ خواتینِ اسلام مدراس سے خطاب

شام ۷؍جنوری ۱۹۲۹ء کو انہیں انجمن خواتین اسلام مدراس نے اپنے اجلاس منعقدہ ٹاکراس گارڈن میں مدعو کر رکھا تھا۔ اس جلسے کی روحِ رواں مسز عبدالسلام تھیں جو وہاں کے پوسٹ ماسٹر جنرل کی اہلیہ تھیں۔ اقبال کی خدمت میں ایک سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔ عبداللہ چغتائی کے بیان کے مطابق تمام مستورات پردہ میں تھیں اور اقبال پردے کے باہر بیٹھے تھے۔ سپاسنامہ میں اقبال کی دینی، علمی اور ادبی خدمات کا ذکر کیا گیا۔ مگر مندرجہ ذیل حصہ غالباً اُن کی خصوصی توجہ اور جواب کے لیے شامل کیا گیا تھا۔

''آپ سے یہ عاجزانہ التماس کرنا غیر موزوں اور نامناسب نہ ہوگا کہ آپ ہم اسیرانِ قفس کے لیے بھی اپنے قیمتی اوقات سے کچھ تھوڑا سا وقت وقف فرمائیں اور طبقۂ نسوانِ اسلام کی شرعی

آزادی کے لیے نغمہ سنجی فرمائیں۔ ہم اسیرانِ قفس کی حالت ناگفتہ بہ ہے، اس کے انسداد کے لیے کوئی ایک پُر جوش نظم لکھ کر سوتے ہوئے جذبات کو بھڑکائیے۔ مولانا حالی کے ہم مرہونِ منت ہیں کہ انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں اُن کے کلام نے طبقۂ نسواں کا رتبہ بلند کر دیا۔ اُن کی ''چپ کی داد'' نے ہماری عزت بڑھا دی۔ اُن کے اشعار نے اسلامی گھروں میں آزادیٔ نسواں کی جھلک بتا دی، لیکن اب بھی بہت سے گھرانے موجود ہیں، جہاں آزادی کا نام نہیں ہے، حالانکہ دنیا میں مرد عورت کے توقعات و مفادات ایک دوسرے سے یکساں ہوتے ہیں اور اسلام نے مساوات کی تعلیم دی ہے۔ ہم بہت رنج سے دیکھتی ہیں کہ مردوں کی جانب سے عورتوں کے حقوق کے متعلق سخت بے پروائی برتی جاتی ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتی ہیں۔ کہ آپ اس کی اصل وجوہ پر مفصل روشنی ڈالیں۔ ہم یہ کہنا نہیں چاہتے کہ ہمارے بھائی جو ہماری ہی ماں سے پیدا ہوتے ہیں، سخت ظالم وسفاّک ہوتے ہیں۔ لیکن ہم کو اس بات کا رنج ہے کہ فرقہ اناث کے ساتھ بے انصافی کرنے اور ان کی حق تلفی کرنے کی بنیاد خود والدین کے گھروں میں ہی ڈالی جاتی ہے۔ ماں باپ دونوں فریق میں افراط وتفریط وفرق کو ہمارے ساتھ ساتھ پرورش کرتے ہیں۔ لڑکی کو لڑکے کے مقابلے میں کھانے پینے کے علاوہ تقسیمِ املاک میں بھی محروم کر دیتے ہیں۔ لڑکی اگر بدقسمتی سے بیوہ ہوتی ہے تو ظالم ماں باپ اپنی خاندانی عزت وعظمت بچانے کے لیے اس کی شادی نہیں کرتے۔ ان کو بھائیوں اور چچاؤں کے دست نگر بنا کے تباہ کر دیتے ہیں۔ اب عصر جدید میں ہر جگہ طبقۂ نسواں کی آزادی کی چیخ پکار ہے۔ نئی تعلیم و روشنی کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی طبقۂ نسواں میں ان کے شرعی اور جائز حقوق آزادی اور مساوات ان کو حاصل ہوں۔ اسلام کی سچی اور زندہ روح اسلامی مستورات میں ہی ہے اور اسلامی صنفِ نازک نے زندہ آگ میں جل جل کر بھسم ہو ہو کر اپنے ایثار کا ثبوت دیا ہے۔ خاتمہ پر آپ کی تضیعِ اوقات کی معافی چاہتے ہیں اور امید قوی رکھتے ہیں کہ آپ زمانۂ قریب میں طبقۂ نسواں کی بہبودی و آزادی کی ترانہ سنجی فرمائیں گے اور فرقۂ اناث اس کارِ خیر کی ہمیشہ ممنون وشکر گزار رہے گی''۔

اقبال نے سپاسنامہ کے جواب میں جو تقریر کی وہ اتفاق سے محفوظ ہے۔ آپ نے فرمایا:

''میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ اگرچہ انحطاط کے دور میں عورت کے حقوق سے بے پروائی ہوئی، مسلمان مردوں نے

مسلمان عورتوں سے تغافل برتا، لیکن عورت باوجود اس تغافل کے اپنا منصب پورا کرتی رہی۔ کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو اپنی ماں کی تربیت کے اثرات اپنی طبیعت میں نہ پاتا ہو یا بہنوں کی محبت اس کے دل پر اپنا نشان نہ چھوڑتی ہو۔ وہ خوش نصیب شوہر جن کو نیک بیویاں ملی ہیں، خوب جانتے ہیں کہ عورت کی ذات مرد کی زندگی کے ارتقاء میں کس حد تک اس کی ممد و معاون ہے۔ مجھے یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں مرد و زن میں قطعی مساوات ہے۔ مَیں نے قرآن پاک کی آیت سے یہی سمجھا ہے۔ بعض علماء مرد کی فوقیت کے قائل ہیں۔ جس آیت سے شک کیا جاتا ہے، وہ مشہور ہے ''الرجال قوامون علی النساء'' عربی گرامر کی رو سے قائم کا صلہ جب اعلیٰ پر آئے تو معنی محافظت کے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ قرآن حکیم نے فرمایا: ''ھن لباس لکم وانتم لباس لھن'' لباس بھی محافظت کے لیے ہوتا ہے۔ مرد عورت کا محافظ ہے۔ دیگر کئی لحاظ سے بھی مرد عورت میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ قُرونِ اولیٰ میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش جہاد میں شریک ہوئیں۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں ایک موقع پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور تھیں اور خود فتویٰ صادر کرتی تھیں۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ عورت کو ووٹ کا حق ملنا چاہیے۔

''خلافتِ اسلامیہ میں خلیفہ کے انتخاب میں ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی خلیفہ کے انتخاب میں اپنی آواز رکھتی تھیں۔ اسلام تمام معاملات میں اعتدال کو مدنظر رکھتا ہے۔ عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ ان فرائض میں اختلاف ہے، مگر اس سے نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے۔

''مطلب یہ کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے، اسلام کے اندر مرد و زن میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ تمدّنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔ اسلام نے عورت کو کسی طرح مرد سے ادنیٰ درجہ پر نہیں رکھا۔ سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ ماں بچوں کی وراثت کا حق رکھتی ہے۔ یورپ کے کئی ملکوں میں اب تک آپ کی بہنوں کو علیحدہ جائداد کا حق حاصل نہیں۔ اولاد کی ولایت کا حق انگریز ماں کو اِس وقت تک بھی نہیں۔ اسلام میں یہ حق ہمیشہ سے موجود ہے۔ ان تمام امور میں یورپین قومیں یا تو اسلام کا تتبع کر رہی ہیں یا خود فطرت نے اب انہیں اس طرف توجہ دلا دی ہے۔ یورپ میں طلاق حاصل کر لینا مشکل تھا۔ مسلمانوں میں یہ شکایت کبھی خاص طور پر پیدا نہیں ہوئی۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کو مرد کی طرح طلاق دینے کا حق نہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہمارے علماء نے کبھی اس بات کی توضیح ہی نہیں کی کہ نکاح کے

وقت عورت کہہ سکتی ہے کہ جو حق اسلام نے طلاق کا تم کو (مرد کو) دیا ہے، وہی اس وقت مجھے (عورت کو) دے دو تو پھر نکاح ہو گا یا یہ حق میرے کسی قریبی تعلق رکھنے والے کو دے دیا جائے۔ آپ نے اپنے لیے ایڈریس میں اسیرانِ قفس، کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس سے مجھے مغربی عورتوں کی اس تحریک کا خیال ہوا جسے ترکی میں یا اور جگہ یورپ میں ایمنسی پیشن (مردوں کے غلبہ سے آزادی) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جن باتوں کو لفظی قیود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی اصل میں قیود ہیں یا نہیں۔ پردے کے متعلق اسلام کے احکام واضح ہیں۔ ''غضِ بصر'' کا حکم ہے اور وہ اس لیے کہ زندگی میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جب عورت کو غیر محرم کے سامنے ہونا پڑتا ہے۔ خاص اس وقت کے لیے یہ حکم ہے، دیگر حالات کے لیے اور احکام ہیں۔ پردے کے سلسلے میں اسلام کا عام حکم عورت کو یہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان مردوں نے اس اجازت سے بے جا فائدہ اٹھایا۔ اس میں اصول وقوانین کا کیا قصور؟ جب جنگ میں کسی قوم کے مردوں کی تعداد میں خاص کمی واقع ہو جائے تو آئندہ ملکی حفاظت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک مرد ایک سے زاید بیویاں کرے۔ قرآن پاک نے انھی مصالح کو ملحوظ رکھ کر اس قسم کی اجازت دی ہے اس لیے فقہ میں ''فرض'' اور ''رخصت'' میں فرق کیا گیا ہے۔ رخصت ترک کی جا سکتی ہے۔ فرض ہرگز نہیں۔ اگر نکاح کے وقت عورت مرد سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اس رخصت کو اپنے حق میں ترک قرار دو، جو تَعَدُّد ازدواج کے متعلق ازروئے قرآن تمھیں حاصل ہے، تو وہ اس مطالبے کا حق رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک الزام مَیں لڑکیوں کے باپوں کو بھی دوں گا کہ وہ نکاح کے وقت عورتوں کے حقوق پر نگاہ نہیں رکھتے۔ مگر ایک الزام خود عورتوں کو بھی دیے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ یہ کہ کیوں بوقت ضرورت عورتیں مردوں سے قانونی ذریعے سے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتیں؟ کیوں بھائیوں سے جائداد کا حصہ طلب نہیں کرتیں؟ افسوس ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قانون کی عدالتیں قائم نہیں، تاکہ یہ معاملے شریعت اسلامی کے ذریعے طے ہوں۔ گذشتہ پانچ یا چھ سو سال سے شریعت اسلامیہ جامد رہی ہے۔ انگریزی قانون والے شریعت اسلامی کو نہیں سمجھ سکتے۔ چند فقہ کی کتابیں مشہور ہیں جو آج سے پانچ چھ سو سال قبل لکھی گئی تھیں۔ اس وقت جو فتوئے دیے گئے وہ ان حالات کے مطابق تھے۔ آج حالات اور ہیں۔ اب ان حالات کو ملحوظ رکھ کر شرعی مسائل پر غور کرنا چاہیے۔ اگر عورتیں اپنے حقوق کی حفاظت پر پورے طور پر آمادہ ہو جائیں اور وہ حق جو شریعتِ اسلامی نے عورتوں کو دے رکھے ہیں، آپ مردوں سے لے کر رہیں، تو مَیں سچ کہتا ہوں کہ مردوں کی

زندگی تلخ ہو جائے۔ عورتیں بچوں کو دودھ پلانے کی اُجرت طلب کر سکتی ہیں۔ کھانا پکانے کی اُجرت بذریعہ عدالت حاصل کر سکتی ہیں مردوں کو آپ الزام دیتی ہیں، مگر آپ خود الزام سے بری نہیں ہیں۔ آپ کو اپنے حقوق پر شدّت کے ساتھ اصرار کرنا چاہیے۔ وہ حق جس کا عورت انصاف و عقل کے ساتھ کبھی مطالبہ کر سکتی ہے، وہ قرآن پاک نے دے دیا ہے۔ ہاں مادر پدر آزادی کی شریعت نے کبھی اجازت نہیں دی، نہ کوئی ہوش مند انسان کبھی اس کی خواہش کرے گا۔ ہمیں تو ملک میں مسلمانوں کے اندر اس قسم کی رائے عامہ پیدا کرنی چاہیے کہ جب تک یہ طے نہ پا چکے کہ آئندہ زندگی میں عورت کے کون کون سے حقوق ہوں گے، اس وقت تک نکاح نہ پڑھا جائے۔ یہ تحریک بہت زور سے شروع ہونی چاہیے۔ جیسا کہ مَیں نے کہا کہ مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کر سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ اصلاح کا صحیح اور عقل مندانہ رستہ اختیار کریں، اور ترکی یا دیگر یورپین ممالک کی عورتوں کی اندھا دھند تقلید کے دَرپے نہ ہو جائیں۔ آپ کو لفظ آزادی پر نہیں جانا چاہیے۔ آزادی کے صحیح مفہوم پر غور کرنا چاہیے۔ یورپ کی آزادی ہم خوب دیکھ چکے ہیں۔ یورپین تہذیب باہر ہی سے دیکھی جا رہی ہے۔ کبھی اندر سے دیکھی جائے تو رونگٹے کھڑے ہوں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ قرآن پڑھیں۔ اس کی تعلیم پر غور کریں۔ پنجاب میں تو اچھے اچھے عدالتوں میں کہہ دیتے ہیں کہ ہم رواج کے پابند ہیں شریعت کے پابند نہیں۔ محض اس لیے کہ بیٹیوں کو جائداد میں حصہ نہ دینا پڑے۔ ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ ہم رواج کی قیُود سے آزادی حاصل کریں''۔

تقریر ختم ہونے پر خواتین نے اصرار کیا کہ اقبال اپنی کوئی نظم سنائیں، مگر اقبال نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ انھیں اپنا کلام زبانی یاد نہیں اور یہ کہ وہ کوئی کتاب بھی ساتھ نہیں لائے۔ اس پر پردے میں سے بانگِ درا کے کئی نسخے باہر پھینک دیے گئے اور اقبال مجبور ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے ''بانگِ درا'' کا ایک نسخہ اُٹھا لیا اور نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' پڑھ کر سنائی۔

مدراس میں علاّمہ اقبال اور اُن کے رفقاء کے اعزاز میں مختلف انجمنوں اور سرکردہ افراد نے بہت سی ضیافتیں دیں اور بے حد عزت افزائی فرمائی۔

مدراس سے بنگلور آمد

۸؍جنوری ۱۹۲۹ء کی شام سے قبل سیٹھ جمال محمد بوسوٹو ہوٹل میں آئے اور اقبال کو خطبات کے اخراجات کے طور پر ایک چیک کے علاوہ نہایت نفیس کشمیری دُھسا بھی پیش کیا۔ اسی طرح

چودھری محمد حسین، عبداللہ چغتائی اور علی بخش کو پشمینہ کی اعلیٰ چادریں دی گئیں اور یوں اِن کے عمل نے اسلامی ثقافت کی ایک قدیم روایت کو زندہ کر دیا۔ اسی شام بنگلور روانہ ہونے کی خاطر اقبال مدراس چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے جہاں لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم انہیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھا۔

۹؍جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح سوا چھ بجے گاڑی بنگلور چھاؤنی کے اسٹیشن پر رکی۔ مسلمانانِ بنگلور ہزاروں کی تعداد میں اقبال کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے اور انھوں نے پھولوں کے بڑے بڑے ہار، جو خاصے قیمتی تھے، ہاتھوں میں تھام رکھے تھے۔ اسٹیشن کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر مجمع میں سب سے نمایاں فخر التجار حاجی سر اسمٰعیل امین الملک وزیر اعظم ریاست میسور، حاجی سیٹھ عبدالغفور، کلیم الملک سید غوث محی الدین مدیر اخبار 'الکلام' اور محمود خان بنگلوری تھے، جنھوں نے آگے بڑھ کر اقبال کو ہار پہنائے۔ حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ اور حاجی سیٹھ عبدالغفور کے ساتھ اقبال موٹر کار میں اُن کی رہائش ''الکس لاج'' کی طرف روانہ ہوئے۔ چونکہ لوگوں نے موٹر کار کے ساتھ بھاگنا شروع کر دیا تھا اس لیے تقریباً نصف میل اسے نہایت آہستہ چلانا پڑا۔

حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ بنگلور کے ایک بہت بڑے رئیس تھے۔ بنگلور کا مشہور زنانہ ہسپتال جو ''گوشہ ہسپتال'' کے نام سے پکارا جاتا تھا، انھی کا قائم کردہ تھا۔ کئی مساجد تعمیر کرا چکے تھے۔ لاکھوں روپے مسلمانوں کی تعلیم پر خرچ کرتے تھے۔ بین الاقوامی تاجر بھی تھے۔ تمام کاروبار انگریزوں کے ساتھ تھا۔ گھر میں انگریز خاتون ملازم رکھی ہوئی تھی جو تمام اہم امور کی نگرانی کرتی تھی۔ خود انگریزی بولتے تھے، لیکن انگریزی لکھنا نہ جانتے تھے۔ ایک موقع پر اقبال سے کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب مَیں انگریزی دان نہیں ہوں۔ اقبال نے جواب میں فرمایا۔ کہ آپ انگریزی دان نہ سہی ''انگریز دان'' تو ضرور ہیں، اس لیے آپ کو انگریزی جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی عمر تقریباً اسی سال تھی اور کانوں سے قدرے بہرے تھے۔ گھڑ دوڑ کا بے حد شوق تھا چنانچہ ان کی کوٹھی میں ایک کمرہ ایسا تھا جسے لاتعداد انعامات سے سجایا تھا۔ جو اُن کے گھوڑوں نے جیتے تھے۔ اُن کا ایک لڑکا سیٹھ محمد انھی دنوں بیمار ہو کر لندن سے آیا تھا اور کوٹھی میں مقیم تھا۔ اقبال اور اُن کے ہمسفروں کی رہائش کا انتظام اِسی کوٹھی میں کیا گیا تھا۔ اقبال ناشتہ سے فارغ ہو کر سیٹھ محمد کی عیادت کے لیے ان کے کمرے میں گئے اور ان کی یورپین اہلیہ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

بنگلور اور میسُور میں مصروفیات

دس بجے صبح مسلم لائبریری معسکر بنگلور کے زیرِ اہتمام اقبال کے اعزاز میں مہاتما گاندھی روڈ پر واقع اپرا ہاؤس میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں انہیں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ جلسے کی صدارت امین الملک سر مرزا اسمٰعیل وزیرِ اعظم ریاست میسور نے کی۔ اقبال نے اپنی جوابی تقریر میں دنیا کے اسلامی کتب خانوں پر روشنی ڈالی اور مسلم لائبریری کو ترقی دینے پر زور دیا۔ اس کے بعد کتب خانہ میں کتابوں کا معائنہ فرمایا اور کتاب آراء میں تحریر کیا:

''جنوبی ہندوستان کے مسلمان نوجوان خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہو چکا ہے، جس کو مَیں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نیک فال تصوّر کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور کی مسلم لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اراکینِ کتب خانہ کو چاہیے کہ تاریخِ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ فرمائیں''۔

شام چھ بجے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج میں انگریزی میں خطبہ دیا۔ ۱۰رجنوری ۱۹۲۹ء کی صبح سرنگا پٹم روانہ ہوئے راستے میں سلطان شہید کے مزار پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی۔

شام کو چھ بجے میسور یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام اقبال نے ایک لیکچر یونیورسٹی ہال میں دینا تھا۔ اس جلسے کی صدارت چاندی، وائس چانسلر نے کی تھی۔ جب اقبال وہاں پہنچے تو ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حاضرین میں یونیورسٹی کے پروفیسروں کے علاوہ شہر کے کئی برہمن اور غیر برہمن شرفاء و فضلا بھی موجود تھے۔ اقبال نے مدراس میں پڑھے ہوئے تین مقالوں میں سے ایک مقالہ اس موقع پر پڑھا۔

ٹیپو سلطان کے مزار پہ حاضری

۱۱رجنوری ۱۹۲۹ء کو ریاست میسور کی طرف سے اُن کے لیے سلطان ٹیپو کے قلعہ سرنگا پٹم جانے اور وہاں قریب ہی سلطان ٹیپو کے مزار وغیرہ کی زیارت کرنے کا پروگرام تھا۔ سو صبح تقریباً نو بجے سب موٹر کاروں میں سوار ہو گئے۔ اس قافلے کی ایک موٹر کار میں میسور کے مشہور و معروف درباری موسیقار علی جان اپنے سازندوں سمیت موجود تھے، جنہیں مہاراجہ میسور نے اقبال کی صحبت میں رہنے کے لیے خاص طور پر بھیجا تھا۔

مقبرے کے دروازے پر ریاست کی طرف سے ہر وقت نوبت بجتی رہتی ہے۔ روضہ سیاہ سنگِ مرمر یا سنگِ موسیٰ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اقبال بارہ بجے کے قریب سلطان ٹیپو کے مقبرے یعنی گنبد سلطانی پر پہنچے۔ اقبال اپنے احباب کے ساتھ روضۂ سلطانی میں نہایت اشتیاق اور ادب کے ساتھ داخل ہوئے۔ مزار پر سرخ غلاف چڑھا ہوا تھا۔ فاتحہ کے بعد اقبال نے کہا کہ مَیں یہاں تخلیہ میں مراقبہ کرنا چاہتا ہوں جب تک مَیں باہر نہ آ جاؤں، کوئی مجھے آواز نہ دے۔ سب باہر آ گئے اور انھوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

اقبال نے مزار کے اندر داخل ہوتے ہی قرآن مجید کی وہ آیت جو شہدا کے ضمن میں ہے (جو اللہ کے راستے میں مارے گئے، انہیں مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں۔ مگر لوگوں کو شعور نہیں ہے) تلاوت فرمائی۔ گنبدِ سلطانی میں تین قبریں ہیں۔ سیاہ غلاف والی قبر حیدر علی، والد سلطان ٹیپو کی ہے۔ اور دائیں طرف دو قبروں میں ایک سنہری قبر فاطمہ، والدہ سلطان ٹیپو کی اور دوسری قبر جس پر سُرخ غلاف ہے، سلطان ٹیپو شہید کی ہے۔ سُرخ رنگ دراصل شہید کی نشانی ہے۔ سلطان ٹیپو نے خود اپنے والدین کو یہاں دفن کیا اور یہ مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ مزار کے اندر کی فضا ایسی ہے کہ انسان پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اقبال نے جس عقیدت اور خلوص سے روضہ کے اندر فاتحہ خوانی کی، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ روضے کے اندر چاروں طرف دیواروں اور تعویذوں پر کئی فارسی اشعار شہدا کی شان میں کندہ ہیں۔ سلطان ٹیپو ۱۲۱۳ھ بمطابق ۱۷۹۹ء میں شہید ہوئے اور اِن کی تاریخ شہادت ''شمشیر گم شد'' کے الفاظ سے برآمد ہوتی ہے۔ یہی تاریخ ان کے بیشتر سوانح نگاروں نے بھی تحریر کی ہے۔ روضے سے باقی لوگ تو باہر چلے گئے، لیکن تنہا اقبال، سلطان شہید کی تربت کے قریب آنکھیں بند کیے دیر تک کھڑے رہے اور سب سے آخر میں باہر نکلے۔ عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ مَیں نے جو منظر اقبال کا یہاں دیکھا اسے الفاظ میں تو ڈھالنا ممکن نہیں۔ پھر بھی اس پر ایک الگ مضمون بعنوان ''شمشیر گم شد'' لاہور واپس آ کر تحریر کیا جو ''نیرنگِ خیال'' میں طبع ہوا۔

روضے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اس کے صحن میں سب لوگ جا کر بیٹھ گئے اور علی جان نے نہایت سوز کے عالم میں اقبال کا اردو اور فارسی کلام گانا شروع کر دیا۔ اقبال کے آنسوؤں کا سلسلہ نہ تھمتا تھا اور حاضرین پر بھی رقت طاری تھی۔ علی جان یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے اور گاتے

گاتے رک گئے۔ اقبال نے بڑے اضطراب کے عالم میں کہا: رک کیوں گئے جاری رکھو۔ سو علی جان گاتے رہے اور اقبال آنسو بہاتے رہے۔ جب وہاں سے رخصت ہوئے تو میسور کے مشہور تاجر سیٹھ محمد ابا (عباس) نے، جو ان کے ساتھ تھے، پوچھا کہ سلطان شہید نے آپ کو کوئی پیغام دیا۔ اقبال نے جواب دیا کہ ان کی معیّت میں میرا ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گزرا۔ پھر فرمایا کہ ایک پیغام یہ ملا ہے:

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

یہ شعر اُس واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے جب سلطان ٹیپو کو شہادت سے کچھ دیر قبل کسی مشیر نے رائے دی تھی کہ انگریزوں سے مصالحت کر لی جائے، اور انھوں نے فوراً جواب دیا تھا کہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ بعد ازاں رستے میں چار اور شعر بھی موزوں ہو گئے، جو اقبال کے انتہائی ذاتی تاثرات پر مبنی تھے اور ان کے کسی مطبوعہ کلام میں شامل نہیں:

آتشے در دل دگر بر کردہ ام   داستانے از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجرِ آئینہ فام   می کشم اورا بتدریج از نیام
نکتۂ گویم ز سلطانِ شہید   زاں کہ ترسم تلخ گردو روزِ عید
پیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او   تا شنیدم از مزارِ پاکِ او
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

(یعنی میں دکن سے ایک داستان اپنے ساتھ لایا ہوں، جس نے میرے دل میں نئی حرارت پیدا کر دی ہے۔ میرے پہلو میں آئینے جیسا ایک چمکدار خنجر ہے جسے میں آہستہ آہستہ نیام سے باہر نکال رہا ہوں۔ سلطان شہید کی طرف سے مجھے ایک نکتہ ملا ہے۔ جسے بیان کیے دیتا ہوں، گو مجھے خوف ہے کہ اسے سن کر کہیں تیری عید کی خوشیوں میں تلخی کا رنگ نہ بھر جائے۔ مَیں جب اُن کی خاک کو بوسہ دینے کی غرض سے وہاں تک پہنچا تو مزار پاک سے ندا آئی: اگر جہاں میں مردوں کی طرح زندہ رہنا ممکن نہ ہو تو مردانہ وار جان قربان کر دینے ہی میں زندگی ہے۔)

حقیقت یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں ٹیپو سلطان شہید کو صحیح معنوں میں اقبال ہی نے تلاش کیا اور اس آتشِ رفتہ کا سراغ لگا کر مسلمانوں میں اسلام کے لیے تڑپ پیدا کی۔ اقبال نے اس

شہید کی شخصیت کے بارے میں ایسے اعلیٰ و ارفع افکار کا اظہار کیا ہے کہ اس کی موت پر زندگی رشک کرتی ہے۔

اقبال ٹیپو سلطان کو شہیدانِ محبت کا امام قرار دیتے ہیں اور اسے اسلامی ممالک کی عزت و آبرو سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک سلطان ٹیپو شہید کا نام چاند اور سورج سے بھی زیادہ روشن اور اُس کی قبر کی مٹی ہم زندہ کہلانے والوں سے کہیں زیادہ زندہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

''عشق ایک راز تھا جسے سلطان ٹیپو شہید نے فاش کیا۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس نے کس شوق سے راہِ حق میں اپنی جان دی۔ نبی اکرم ﷺ کے فیضان نظر سے سلطانِ شہید کا فقر جذب حسینؓ کا وارث بن گیا۔ وہ اگرچہ دنیائے فانی سے چلا گیا لیکن اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سلطان شہید اقبال سے دریافت کرتا ہے کہ:

زائر شہر و دیارم بودۂ چشمِ خود را بر مزارم سودۂ

اے شناسائے حدودِ کائنات در دکن دیدی ز آثارِ حیات؟ (جاوید نامہ)

ترجمہ: اے کہ تو نے میرے وطن اور شہر کو دیکھا ہے اور میری قبر کی خاک کو آنکھوں سے لگایا ہے کیا تو نے دکن میں زندگی کے کچھ آثار بھی دیکھے ہیں۔

زندگی را چیست رسم و دین و کیش یک دم شیری بہ از صد سالِ میش

(زندگی کے لیے رسم و دین اور مسلک کیا چیز ہے؟ شیر کا ایک پل (زندہ رہنا) بھیڑ کے سو سال (زندہ رہنے) سے بہتر ہے (یہ فقرہ ٹیپو نے اپنی شہادت کے وقت کہا تھا) یعنی شیر بن کر رہو اور شیر ہی کی طرح مرو یہی حقیقی زندگی ہے۔)

سرنگا پٹم کی سیاحت

مزار سے سرنگا پٹم قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ کوئی ایک بجے کے قریب اقبال دولت باغ پہنچے جو قلعے کے نزدیک ہے۔ سرنگا پٹم دراصل ایک جزیرہ ہے جو دریائے کاویری کی دو شاخوں کے درمیان واقع ہے۔ ایک حصے میں باغ اور قلعہ ہے جب کہ دوسرے حصے میں شہر آباد تھا، جس کی آبادی سلطان ٹیپو کی شہادت کے چار پانچ سال بعد بھی دو تین لاکھ سے کم نہ تھی، مگر اب یہ ایک ویرانہ ہے۔ مہاراجہ میسور کے مصاحبِ خاص صدیق الملک صادق زین العابدین شاہ، اقبال کے استقبال کے لیے دولت باغ میں منتظر تھے۔ دوپہر کی ضیافت طعام کا انتظام تھا۔

دولت باغ میں سلطان ٹیپو کے زمانے کے درخت ابھی تک موجود تھے۔ سلطان ٹیپو کو قلعے کی عمارت اور باغ سے خاص انس تھا۔ دولت باغ کے ایک طرف دریائے کاویری بہتا ہے اور اس کا منظر نہایت ہی دلفریب ہے۔ کھانے سے فراغت کے بعد اقبال سرنگا پٹم قلعے کی سیر کو نکل گئے وہاں انھوں نے قلعے کی مسجد اعلیٰ، وہ مقام جہاں سلطان ٹیپو کی شہادت واقع ہوئی، زندان، میر جعفر کی مفروضہ قبر، لنگڑے غلام علی کا مقبرہ، وہ مندر جسے حیدر علی نے مرمت کر کے ہندوؤں کے لیے واگزار کیا تھا اور دیگر آثارِ سلطانی دیکھے۔ محمود خان محمود بنگوری جو مسجد اعلیٰ کے امام تھے ہر مقام کا تعارف کراتے اور تاریخی پس منظر بتاتے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے والد کی روایت سے اقبال کو بتایا کہ سلطان ٹیپو مسجد کی عقبی دیوار کے دروازے سے مسجد میں نماز کے لیے آیا کرتے تھے۔ اسی طرح دیوار پر سید غفار شہید، سپہ سالار افواج سلطانی کی، جو سلطان ٹیپو سے کچھ لمحے پیشتر شہید ہوئے، تصویر دیکھ رہے تھے کہ کسی نے بتایا کہ رفیقِ سفر کلیم الملک سید غوث محی الدین، مدیر اخبار ''الکلام'' ان کے پڑپوتے ہوتے ہیں، تو اقبال نے فرطِ عقیدت سے انہیں گلے سے لگا لیا۔ سرنگا پٹم سے واپسی پر رستے میں سدِ کاویری (کاویری ڈیم) دیکھا۔ کاشتکاروں کو زراعت کے لیے وافر پانی فراہم کرنے کی خاطر اس بند کی بنیاد سلطان ٹیپو نے رکھی تھی، لیکن اس کی تکمیل ان کی شہادت کے بعد ہوئی اور اب اسے کرشنا راج ساگر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سلطان ٹیپو کا سنگِ بنیاد (Foundation Stone) جس پر فارسی زبان میں کتبہ کندہ تھا، اتفاق سے وہیں پتھروں میں پڑا مل گیا اور اسے مہاراجہ میسور کے حکم سے سدّ کے اوپر عام گزرگاہ کے قریب نصب کر دیا گیا۔ کتبے کا انگریزی ترجمہ بھی مرمر کے ایک ٹکڑے پر کندہ کر کے ساتھ نصب کیا گیا اور ساتھ ایک باغ بھی لگوایا گیا جس کے فوارے بجلی کے زور سے چھوٹتے تھے اور عجیب و غریب منظر پیدا کرتے تھے۔ اقبال عصر کے قریب واپس میسور پہنچے۔

میسور میں مصروفیات

مہمان خانے میں تھوڑا آرام کرنے کے بعد چھ بجے شام اقبال ٹاؤن ہال گئے، کیونکہ وہاں انہیں مسلمانان میسور کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا جانا تھا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے منتظر تھے۔ اس جلسے کا اہتمام سیٹھ محمد ابا (عباس) نے کیا تھا۔ صدارت نواب غلام احمد

کلامی نے کی۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآنِ مجید سے ہوا۔ قاری مولانا ابوالمظفر تھے۔ بعدازاں علی جان نے اپنے سازندوں کے ساتھ اقبال کی چند نعتیہ نظمیں نہایت رقت آمیز سُروں میں گائیں۔ پھر سیٹھ محمد ابا (عباس) نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اقبال نے جواب میں نہایت موثر تقریر کی۔ اُن کے بعد میسور یونیورسٹی کے فلسفے کے پروفیسر واڈیا نے منتظمین کی طرف سے چند اختتامی کلمات کہے جس میں اقبال کے پچھلے دن کے لیکچر کی خوب تعریف کی اور کہا کہ اقبال کو مسلمان ہزار اپنا کہیں مگر وہ سب کے ہیں، کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں۔ اگر مسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال اُن کا ہم مذہب ہے تو ہندوؤں کو یہ فخر کچھ کم نہیں کہ وہ ہندوستانی ہے۔

۱۲؍جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح کو اقبال میسور یونیورسٹی کا شعبۂ نفسیاتِ عملی دیکھنے گئے۔ ڈاکٹر گوپال سوامی صدر شعبہ نے انہیں طلبہ سے ملوایا اور چند دلچسپ تجربے دکھلائے اِن میں سے ایک تجربہ یہ تھا:

ڈاکٹر گوپال سوامی نے اقبال کی نبض پر اپنے نفسیاتی آلہ کا تار باندھ دیا اور انہیں کہا کہ ایک سے دس تک کسی عدد کو اپنے ذہن میں رکھ لیں۔ اقبال نے چھ کا عدد اپنے ذہن میں چن لیا۔ ڈاکٹر گوپال سوامی ایک دو گننے لگے۔ جب چھ پر پہنچے تو آلے کا کانٹا زور سے حرکت کرنے لگا۔ اس تجربے پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال نے بتایا کہ مثنوی رومی کی پہلی حکایت میں طبیبِ الٰہی بھی نبض کی رفتار میں فرق آجانے کے ذریعے کنیز کے مرض کی نوعیت معلوم کر لیتا ہے۔ اور اسی طرح بوعلی سینا نے بھی قابوس بن وشمگیر کے مرض کی تشخیص کی تھی۔ سو آج سے کئی صدیاں قبل حکماء اسی اصول سے کام لیتے تھے۔ بعدازاں اقبال میسور کے چند پرانے محلات دیکھنے گئے۔ ایک مقام پر سلطان ٹیپو کی یاد میں پتھر میں تراشا ہوا شیر ان کی توجہ کا مرکز بنا۔ بجلی کی ٹرالی کے ذریعے ایک پرانے مزار پر پہنچے، کیونکہ سلطان ٹیپو اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ چڑیا گھر دیکھا جہاں شیر بالکل کھلے پھرتے تھے، لیکن انہیں علم نہیں کہ درمیان میں ایک خندق حائل ہے جو دکھائی نہیں دیتی۔

اسی روز دوپہر کے کھانے کے بعد اقبال اپنے ہمسفروں کے ساتھ بذریعہ موٹر کار واپس بنگلور روانہ ہوئے رستے میں دو تین مقامات پر دیہاتیوں نے انہیں پھولوں کے ہار پیش کیے۔ سلطان ٹیپو کے مزار کے قریب سے گزرتے وقت انھوں نے موٹر کار سے اتر کر ایک بار پھر فاتحہ پڑھی۔ شام پانچ بجے کے قریب بنگلور پہنچے۔ چائے سر مرزا اسمٰعیل کے ساتھ نوش فرمائی۔ اُن کے گھر کا سارا ماحول ایرانی تھا۔ چائے سے فارغ ہو کر سر اسمٰعیل سیٹھ کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ رات

کا کھانا بنگلور کے کسی تاجر محمد علی کے ہاں تھا۔ تمام عمائدینِ شہر وہاں مدعو تھے۔ رات گئے سر اسمٰعیل سیٹھ کی رہائش گاہ میں آ کر سوئے۔

۱۲ر جنوری کو میسُور یونیورسٹی میں حاضری کے بعد بنگلور کے لیے روانہ ہو گئے۔ مرزا محمد اسماعیل دیوانِ ریاستِ میسور صدر تھے۔ شام کو انٹر میڈیٹ کالج میسور میں جماعتِ ملیّہ اسلامیہ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے مدعو کیا۔ مدراس کا پہلا لیکچر ڈاکٹر صاحب نے اس میں پڑھا۔ روز نامہ ''الکلام'' (بنگلور) نے علاّمہ اقبال کے بنگلور تشریف لانے کی خوشی میں اپنا ایک خاص پرچہ ''اقبال نمبر'' نکالا۔

میسُور میں محمود بنگلوری سے ملاقات

سفرِ میسور میں علاّمہ اقبال کی ملاقات مشہور مسلم مؤرخ جناب محمود بنگلوری سے ہوئی۔ اس کی تفصیلات انھوں نے اپنی تصنیف ''صحیفہ ٹیپو سلطان'' کے صفحات ۱۶۔۱۷ پر یوں بیان فرمائی ہیں:

''.......... ٹیپو سلطان کی عظمت کو نمایاں کرنے میں علاّمہ اقبال نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ آپ کی سرنگا پٹم میں تشریف آوری اور اخبار ''انقلاب'' لاہور میں آپ کے مضامین اور اس کے بعد ''جاوید نامہ'' کی اشاعت نے ملک میں سلطان کی شہرت کو وسیع کر دیا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس حکیمِ مِلّت نے ایک ہی دن میں اپنی روحانی بصیرت سے وہ سب کچھ دیکھ لیا جس کو ہندوستان ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں نہ دیکھ سکا۔ اِن آنکھوں نے یہاں دیکھاع

مشرق اندر خواب او بیدار بود (اقبال)

راقم الحروف مدة العمر کبھی ان زریں گھڑیوں کو بھول نہ سکے گا جو اس حکیمِ مِلّت کی معیّت میں بسر ہوئیں اور شاید ہی یہ فخر کسی کو حاصل ہو گا کہ گنتکل میں کھانے کے وقت، جب مَیں اپنا برتن (جنوبی ہند کے رواج کے مطابق) الگ لے بیٹھا تو آپ نے اس کو کھینچ کر علیٰحدہ کر دیا اور آپ کے روبرو جو برتن تھا اُس میں نہ صرف کھانے کو کہا بلکہ اپنے ہاتھ سے نوالے تک بنا کر میرے مُنہ میں دیے۔''

بنگلور سے حیدر آباد کے لیے روانگی

۱۳ر جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے اقبال بنگلور سے میٹر گیج ریل پر حیدر آباد روانہ

ہوئے۔عثمانیہ یونیورسٹی نے انہیں لیکچروں کے لیے دعوت دے رکھی تھی جو قبول کر لی گئی تھی۔سیّد غوث محی الدین مدیر''الکلام'' بھی میسور سے ساتھ گئے۔اگلے روز یعنی ۱۴رجنوری ۱۹۲۹ء کو صبح جب گاڑی فلک نما سے گزر کر حیدر آباد کے اسٹیشن پر رکی تو پلیٹ فارم پر سینکڑوں مسلمان بچے قطاروں میں کھڑے''چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا'' خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار انصاری اور دیگر اصحاب یہیں سے ساتھ ہوئے۔انھوں نے اقبال کو مطلع کیا کہ وہ حیدر آباد میں حکومتِ نظام کے مہمان ہوں گے، اس لیے انہیں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا ہوگا۔اس سے پیشتر''دلکشا'' میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔چائے گاڑی ہی میں آ گئی۔اگلے اسٹیشن سکندر آباد پر اترنا تھا۔اُس وقت سر اکبر حیدری وزیرِ مالیات ریاست حیدر آباد تھے۔اُن کی شخصیت نہایت متنوع اور ہمہ گیر تھی۔سیاست اور نظم ونسق سے گہری دلچسپی کے باوجود ریاست حیدر آباد اور ہندوستان کی جن عظیم علمی شخصیّات سے اُن کے قریبی مراسم تھے، اِن میں اقبال بھی شامل تھے۔اقبال کی حیدر آباد میں آمد کے موقع پر جو سرکاری استقبالیہ کمیٹی بنائی گئی سر اکبر اُس کے سربراہ تھے۔جب علّامہ وہاں پہنچے تو سر اکبر حیدری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا عبداللہ عمادی، سیّد ابراہیم، ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ استقبال کے لیے موجود تھے۔دستور کے مطابق اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔اس کے بعد وہ سر اکبر حیدری کے ہمراہ بیلا وسٹا گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

حیدر آباد میں مصروفیات

اقبال نے ۱۴رجنوری ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۸رجنوری ۱۹۲۹ء تک حیدر آباد میں قیام کیا۔اپنی آمد کے پہلے ہی دن وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے ساتھ جا کر محل کی کتابِ حضوری میں اپنا نام لکھ آئے۔اگلے روز یعنی ۱۵رجنوری ۱۹۲۹ء کی شام کو باغِ عامہ کے ہال میں اقبال کا پہلا لیکچر تھا۔جلسے کی کاروائی کا آغاز وقت پر ہوا۔اقبال اور سر اکبر حیدری ڈائس پر گئے۔سب سے پہلے سر اکبر حیدری نے اپنے مخصوص لہجہ اور فصیح انگریزی میں اقبال کا مختصر سا تعارف کروایا۔اس کے بعد اقبال نے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔صدارت مہاراجہ سرکشن پرشاد نے کی اور حاضرین میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ شامل تھے۔رات کو مہاراجہ کشن پرشاد کے ہاں پر تکلّف

ضیافت اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا اور تمام مدعوئین کو ہدایت تھی کہ آصف شاہی دستار او رنگلس یعنی ریاست کا درباری لباس پہن کر آئیں۔ سو حیدر آباد کے تمام مشہور اردو اور فارسی کے شعرا اسی لباس میں آئے۔ اقبال کو البتہ اس مخصوص لباس سے استثنیٰ تھا۔ طعام کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ حیدر یار جنگ طباطبائی، نواب ضیاء یار جنگ بہادر، نواب عزیز یار جنگ بہادر، مولوی مسعود علی محوی، جوش ملیح آبادی، نظام شاہ لبیب تیموری، میر کاظم علی باغ اور دیگر شعراء نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اقبال کسی کو داد دیے بغیر خاموش بیٹھے رہے۔ صرف مولوی مسعود علی محوی کے اس شعر:

نگاہ کردن دزدیدہ ام بہ بزم بہ دید
میانِ چیدن گل باغباں گرفت مرا

(بزم کو اسی دز دیدہ نگاہی سے دیکھا تو پھول توڑتے ہوئے باغباں نے مجھے پکڑ لیا۔)

پر اتنا ارشاد کیا کہ پھر پڑھیے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ داد کے طور پر مکرّر پڑھنے کو کہا یا تنقیدی نقطۂ نگاہ سے۔ اقبال نے شروع ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ کوئی شعر یا نظم اس دعوت میں نہ پڑھیں گے۔ لیکن مہمانوں اور مہاراجہ سر کشن پرشاد کے اصرار پر مندرجہ ذیل فارسی اشعار پڑھے:

زندگی انجمن آراء و نگہدارِ خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو باہمہ رو
آں نگینے کہ تو با اہر مناں ساختہ
ہم بہ جبریل امیں نتواں کرد گرو

(زندگی انجمن آراستہ کرنے والی اور اپنی حفاظت خود کرنے والی ہے۔ اے وہ شخص جو اس کاروانِ زندگی میں شامل ہے۔ سب (کارواں) کے ساتھ چل، لیکن اپنی منفرد حیثیت بھی برقرار رکھ۔ اس نگیں (دل) کو جسے تو شیطانوں (دنیاوی خواہشات) کے پاس ہار چکا ہے۔ اسے تو جبریل امین کے پاس بھی گروی نہیں رکھا جا سکتا (تو نے اپنے دل کی قدر نہیں کی)۔

۱۶؍جنوری ۱۹۲۹ء کا دن گیسٹ ہاؤس ہی میں یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر ممتاز شخصیّات سے ملاقاتوں میں گزرا۔ ۱۷؍جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح اقبال نے دوسرا لیکچر زیرِ صدارت نواب اعظم جاہ ولی عہدِ سلطنت باغِ عامہ کے ہال میں دیا۔ دونوں مقالے وہی تھے جو مدراس

میں پڑھے جا چکے تھے۔ دوپہر کا کھانا سر اکبر حیدری کے ہاں تھا، جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ، محکمہ مالیات کے عہدے داروں اور بعض اہم شہریوں نے شرکت کی۔ اسی رات سرامین جنگ نے اقبال کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔

ابھی اقبال دعوت سے لوٹے نہ تھے کہ رات نو بجے کے قریب سرامین جنگ پرائیویٹ سیکرٹری نظام نے گیسٹ ہاؤس میں ایک پیغام بھجوایا کہ ۱۸؍جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح گیارہ بجے نظام اُن سے ملاقات کریں گے۔ جب وہ واپس آئے تو عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین نے انہیں خط کے موصول ہونے کی اطلاع دی اور بتایا کہ اب اُن کے لیے ۱۹؍جنوری ۱۹۲۹ء سے پہلے لاہور روانہ ہونا ممکن نہ ہو سکے گا۔

نظام حیدر آباد سے ملاقات

۱۸؍جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح گیارہ بجے اقبال نظام سے ملے۔ نظر حیدر آبادی تحریر کرتے ہیں کہ نظام کے دربار میں جانے والوں کے لیے لازمی ہوتا تھا کہ وہ آصف شاہی دستار اور بگلس لگائیں، لیکن اقبال پر یہ پابندی نہ لگائی گئی۔ اس ملاقات کے متعلق بعض غلط باتیں بھی مشہور ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ اقبال نے نظام کو اپنے فارسی اشعار سنائے اور ''رموزِ بے خودی'' کا ایک نسخہ پیش کیا۔ یا یہ کہ اقبال نے حکیم اجمل خان سے سُن رکھا تھا کہ نظام کے پاس ایک بیش بہا، نہایت چمکدار ہیرا ہے اور اقبال کے ہیرا دیکھنے کی خواہش پر نظام نے انہیں فوراً وہ ہیرا منگوا کر دکھایا۔ یا یہ کہ نظام نے انہیں شکایتاً کہا کہ ہم دہلی گئے ہوئے تھے، لاہور قریب ہی تھا، تم ہمیں ملنے کیوں نہ آئے اور اقبال نے جواب دیا کہ مَیں ان دنوں بیمار تھا، اب اسی سہو کی تلافی کے لیے ڈیڑھ ہزار میل کا سفر طے کر کے حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ اس پر نظام نے خوش ہو کر کہا کہ چلو ہم تمھیں ریاست کا وزیرِ قانون مقرر کرتے ہیں، لیکن اقبال نے جواب دیا کہ سرکار، اقبال کو آزاد ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ درحقیقت نظام سے اقبال کی ملاقات محض ایک رسمی ملاقات تھی۔ اقبال نے ملاقات کے دوران میں نظام کو انجمن حمایت اسلام کے آئندہ سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے پنجاب آنے کی دعوت دی جو نظام نے قبول کر لی۔ بعد میں اس سلسلے میں اقبال کی نظام کے ساتھ خط و کتابت بھی ہوئی، لیکن نظام اپنی بعض ناگزیر مجبوریوں کے سبب پنجاب نہ آ سکے۔

غالباً اقبال کی اسی آمد کے موقع پر حضور نظام کے توشہ خانہ کے خیرات و خیراتِ استصوابی صدر اعظم سے اقبال کو ایک ہزار روپے کے چیک کا عطیّہ دیا گیا جس کو انھوں نے اپنے وقار کے منافی سمجھا اور قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ چیک اقبال کو سر اکبر حیدری کے توّسط سے پیش کیا گیا۔ چیک واپس کرتے وقت اقبال نے سر اکبر حیدری کے نام ایک نظم بھی لکھ بھیجی۔ یہ نظم ارمغانِ حجاز میں شامل ہے یہ نظم اس طرح سے ہے۔

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے، اور شہنشاہی کر حُسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

مَیں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول

جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکوٰۃ

اب تو یہ نظم صرف ادبی دلچسپی کا سامان ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ نظم اُس زمانے میں حیدر آباد کے اخبارات میں چھپی جسے لوگوں نے ذوق وشوق سے پڑھا اور اس سے عوام کی نظروں میں اقبال کا مقام اور بلند ہو گیا۔ ۱۹؍جنوری ۱۹۲۹ء کو اقبال، حیدر آباد سے لاہور روانہ ہوئے اور یوں جنوبی ہند کا یہ دلچسپ علمی دورہ اختتام پذیر ہوا۔

ریلوے اسٹیشن پر جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ، طلبا اور سرکاری وغیر سرکاری شخصیات کے علاوہ مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی آپ کو الوداع کہا۔ مہاراجہ صاحب نے آپ کو تحفے بھی پیش کیے۔

☆☆☆

باب:۹

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے دعوتِ خطاب

اقبال کے خطبات کی شہرت برصغیر کے مسلم علمی حلقوں میں پھیل گئی۔ چنانچہ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ نے خواہش ظاہر کی کہ مدراس کے تینوں لیکچر علی گڑھ میں بھی پڑھے جائیں، مگر اقبال نے تین کی بجائے چھ مقالات علی گڑھ میں پڑھنا منظور فرما لیے۔ بقول ڈاکٹر محمد خالد مسعود اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے تمام خطبات کا مرکزی خیال تحرک ہے جو اول تا آخر نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> "He defines "thought" in the first lecture, "universe" in the second lecture, "prayer" in the third lecture, "self" in the fourth "Islamic culture" in the fifth and "Ijtehad" in the sixth as "dynamic concepts."

(علامہ اقبال پہلے خطبے میں ''غور و فکر'' دوسرے میں ''کائنات'' تیسرے میں ''عبادت'' چوتھے میں ''خودی'' پانچویں میں ''اسلامی ثقافت'' اور چھٹے میں ''اجتہاد'' کو حرکی تصورات کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں)۔

۱۷/نومبر ۱۹۲۹ء کو اقبال لاہور سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ پروفیسر محمد عبداللہ چغتائی اُن کے ہمراہ تھے۔ ۱۸/نومبر کی صبح علی گڑھ پہنچے۔ اسٹیشن پر اساتذہ، اکابرینِ شہر اور طلباء صفیں باندھے پھولوں کے ہار لیے کھڑے تھے۔ اقبال گاڑی سے اترتے ہی سب سے ملے لوگوں نے اتنے ہار ڈالے کہ علامہ کا چہرہ پھولوں میں چھپ گیا۔ سیّد راس مسعود وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی ایک دن کے لیے بھوپال گئے ہوئے تھے اس لیے لیکچر ۱۹/نومبر سے شروع کرنے کا پروگرام بنا شام ساڑھے چھ بجے سٹریچی ہال میں لیکچر کا وقت مقرر ہوا۔ علامہ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ہال بھر ہوا تھا۔ ڈاکٹر ظفر الحسن صدر شعبۂ فلسفہ علی گڑھ یونیورسٹی نے

صدارت کی۔انھوں نے صدارتی تقریر میں کہاتم سب ''اقبال اعظم'' کو مجھ سے بہتر جانتے ہو میں اُن کا کیا تعارف کراؤں میرا تعارف ''تعریف معروف بالمجہول'' کے سوا کچھ نہ ہوگا۔اس کے بعد سیّد راس مسعود نے علاّمہ کے متعلق چند باتیں کیں جن کا بیشتر حصہ انتہائی عقیدت سے لبریز تھاسید راس مسعود نے فرمایا کہ مَیں دورانِ سفر یورپ میں ایک موقع پر بیمار ہوکر ہسپتال پہنچ گیا تو وہاں میری تسکین کا سامان حضرت علاّمہ کے وہ ایک ہزار اشعار تھے جو مجھے زبانی یاد تھے۔(یاد رہے ایک دفعہ غالباً سفرِ افغانستان میں علاّمہ اقبال، سید راس مسعود اور علاّمہ سلیمان ندوی میں بیت بازی کا مقابلہ ہوا۔شرط یہ تھی کہ صرف اقبال کے اشعار ہی پڑھے جائیں گے اس مقابلے میں سیّد راس مسعود فاتح ثابت ہوئے۔آخری شعر 'ل' پر اقبال لاجواب ہو گئے تھے)۔علی گڑھ میں اقبال کا قیام ۳۰/نومبر تک رہا۔اس دوران انھوں نے اپنے چھ لیکچر سٹریچی ہال میں پڑھے۔چھٹے خطبہ کے آخر میں صدر شعبۂ فلسفہ علی گڑھ یونیورسٹی، ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن نے خطبۂ صدارت میں کہا:

''علم کلام کا کام یہ واضح کرنا ہے کہ حقائقِ دینی اور فلسفہ و سائنس میں کوئی عدمِ مطابقت نہیں ہے۔نیز بنابریں مذہب پر پختہ یقین رکھتے ہوئے اور اس سے کسبِ ہدایت کرتے ہوئے فلسفہ وسائنس کی تعلیمات سے کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔

''اپنے اصولِ تفسیر اور دیگر تحریروں میں سرسیّد نے کہا ہے کہ یہ مقصد دو طرح سے حاصل کیا جاسکتا ہے:

۱- یا تو یہ ''ثابت'' کیا جائے کہ مذہب جو کہتا ہے وہ حقیقت ہے اور فلسفہ وسائنس اصل میں اس سے متفق ہیں۔جن مقامات پر اختلاف و تناقص پیدا ہو، وہاں فلسفہ وسائنس کی تردید کی جائے۔

۲- یا یہ ''دکھایا'' جائے کہ مذہب کی اقلیم فلسفہ وسائنس کے میدان سے مختلف ہے۔جہاں جہاں مذہب ان امور پر کلام کرتا ہے جو فلسفہ وسائنس کا موضوع ہیں تو مذہب کا مقصودِ بیان وہ نہیں ہوتا جو فلسفہ وسائنس کا ہے یعنی وہ فلسفہ وسائنس کی طرح ہمیں یہ نہیں بتانا چاہتا کہ ان اشیاء کی ماہیت کیا ہے۔اس کا مقصود اخلاقی یا مذہبی نتائج ہیں یا وہ ہدایت جو اُن سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

''پہلا خطبہ سنتے ہوئے استدلال کا رُخ دیکھ کر چندے میرا یہ خیال تھا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال دوسرا طریقہ اپنائیں گے لیکن جلد ہی مَیں نے بھانپ لیا کہ ایسا نہیں ہے۔ڈاکٹر اقبال کو اسلام اور جدید فلسفہ وسائنس کے اصولوں کی جو گہری بصیرت حاصل ہے ان کے مالہ و ماعلیہ کے بارے میں انہیں جیسی تازہ ترین اور وسیع معلومات حاصل ہیں، ایک جدید نظامِ فکر تعمیر کرنے کی جیسی

مہارت اور لیاقت ان میں پائی جاتی ہے اس نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ اس کام کو دوبارہ انجام دیں جو صدیوں پہلے یونانی فلسفہ وسائنس کے روبرو ہمارے عظیم علماء مثلاً نظام اور (ابوالحسن) اشعری نے اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ اپنے ان خطبات میں انھوں نے ہمارے لیے ایک جدید علمِ کلام کی بُنیاد رکھ دی ہے۔ حضرات! یہ کام صرف وہی انجام دے سکتے تھے۔''

۲۳ رنومبر ۱۹۲۹ء کو علاّمہ اقبال کے اعزاز میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج یونین کی طرف سے ایک اجلاس ہوا اس موقع پر جو سپاس نامہ پیش کیا گیا اور جلسے کا جو پروگرام مرتب ہوا۔ اس کی کاروائی چونکہ انگریزی میں تھی وہ تو جناب بشیر احمد ڈار کی کتاب "Letters and writings of Iqbal" میں آ چکی ہے لیکن اردو ترجمہ یوں ہے:

بخدمت شریف

ڈاکٹر سر محمد اقبال

کے، ٹی ایم، اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لاء

جناب عالی!

آج ہم ارکان مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج یونین انتہائی خلوص اور احترام کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ آج کی شام ہمارے درمیان آپ کی موجودگی ہمارے لیے گہری مسرت اور ہمت افزائی کا باعث ہے۔ جنابِ والا! ہمیں پوری طرح احساس ہے کہ آج ہم اپنے قومی شاعر کے ساتھ ہیں وہی قومی شاعر جس نے ہمارے عہد کو جذبات قوم پرستی سے معمور کر دیا اور زمانہ کی رگ وپے میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ آج کی شام ہمارے لیے یوں بھی مسرت وانبساط کا باعث ہے کہ شیخ الجامعہ نواب مسعود جنگ بہادر کی ذاتِ گرامی بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔

جنابِ عالی! ہم یہ دیکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں کہ نہ صرف ایک منفرد فکر کی حیثیت سے آپ کی شہرت ملک کے باہر تک جا پہنچی ہے بلکہ زندگی کے جن اصولوں کی سرفرازی کے لیے آپ نے آواز بلند کی ہے وہ بھی عالمِ اسلام کے طول وعرض میں مقبول ہو گئے ہیں آپ کی آواز سے ان اصولوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے ان کا اثر قبول کیا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہمارے الفاظ اس ذاتِ گرامی کا شکریہ ہرگز ادا نہ کر سکیں گے جس نے مسلمانوں میں خود احترامی اور قوم پرستی کے احساسات پیدا کرنے میں اپنے عہد کے ہر شخص سے بڑا اور نمایاں حصہ لیا ہے۔ آپ ہمارے لیے وہ سب کچھ لے کر آگے بڑھے ہیں جو ہمارے شاندار ماضی کا خاصہ تھا آپ کا کلام فارسی شاعری کے شاندار افکار، عربوں کے بیش بہا تصورات اور رومی اور

عرفی کے پیغامات کا نادر مجموعہ ہے۔ آپ نے نہ صرف قدیم حقیقتوں کو از سرِ نو زندہ کیا ہے بلکہ ہمیں اس قابل کر دیا ہے کہ ہم اُن کی صحیح اہمیت کو سمجھ سکیں۔ آپ نے ہمارے دلوں کو ان پیغامات کی طرف ہمیشہ کے لیے اس طرح پھیر دیا ہے جس طرح سورج مکھی کا پھول ہمیشہ سورج کی طرف مائل رہتا ہے۔ آپ نے اپنے فلسفیانہ افکار کو اپنی شاعرانہ خصوصیات سے حیرت انگیز طور پر ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ انفرادیت آپ کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ آپ کی شاعری نے ہمیں متحیر کر دیا ہے ہمیں اس جیسی کوئی بات اساتذہ کے کلام میں تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ آپ نے اپنی شاعری کو مشرق و مغرب کے بہترین افکار سے آراستہ کیا ہے۔ آپ نے نطشے کے سپر مین کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ آپ کی شاعری میں گوئٹے کی گہرائی اور کانٹ کی گیرائی ملتی ہے۔ آپ نے مغرب کے ان مفکرین کے ان تصورات کو اس خوبصورتی کے ساتھ اسلامی روایات اور اردو شاعری کی موسیقی و نغمگی سے ہم آہنگ کیا ہے کہ آپ سے قبل برصغیر کا کوئی شاعر ایسا نہیں کر سکا تھا۔

ہم آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی میں آج آپ کی آمد ایک تاریخی واقعہ قرار پائے گی اور بعد میں آنے والی نسلیں آپ کو اپنے قابلِ تعظیم اسلاف میں شمار کریں گی۔

جنابِ عالی! ہم آپ کی اس عزت افزائی پر فخر محسوس کرتے ہیں جو آپ نے تازیست یونین کا اعزازی رکن بن کر ہمیں بخشی ہے۔ اب جب کہ آپ ہمارے ہو چکے ہیں ہمیں یقین ہے کہ آپ اکثر ہمارے ہاں آیا کریں گے تاکہ ہم اپنے دور کی ایک انتہائی عظیم شخصیت کے قرب سے مستفیض ہوں اور اسلامی نظریات کو جدید دور کے ایک انقلاب آفریں مفکر کے ذریعہ سمجھیں۔

ہم ہیں آپ کے فرنبردار خادم

ممبران ایم۔ یو انٹر میڈیٹ کالج یونین۔ علی گڑھ

پروگرام

انٹر میڈیٹ کالج یونین اجلاس

(مؤرخہ ۲۳/نومبر ۱۹۲۹ء)

۱۔ یونین کے ممبران انٹر میڈیٹ کالج یونین ہال میں آٹھ بجے شب اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں گے۔

۲-تمام مہمان سوا آٹھ بجے تک اپنی نشستوں پر موجود ہوں گے۔

۳-جلوس ڈرائنگ روم میں مرتب کیا جائے گا اور ساڑھے آٹھ بجے مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ ہال میں داخل ہوگا۔

ا- سب سے آگے مجلسِ منتظمہ کے ممبران بر بنائے عہدہ ہوں گے۔

ب- ان کے بعد صدر اور اعزازی معتمد ہوں گے۔

ج- ان کے بعد صدر یونین اور ڈاکٹر سر محمد اقبال ہوں گے۔

د- ان کے بعد اعزازی مہتمم کتب خانہ اور کابینہ کے ارکان ہوں گے۔

۴-ہال میں موجود تمام حضرات اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک کہ صدر یونین اپنی نشست پر بیٹھ نہ جائیں۔

۵-شیخ الجامعہ، نائب شیخ الجامعہ، ممبران منتخبہ کمیٹی اور کچھ مہمان شہ نشین پر بیٹھیں گے۔

۶-آگے کی نشستوں کی چھ قطاریں عملہ کے ارکان اور مہمانوں کے لیے مخصوص ہوں گی۔

۷-کاروائی تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوگی۔

۸-اعزازی معتمد ڈاکٹر سر محمد اقبال سے یونین کے اعزازی رکن بننے کی درخواست کریں گے۔

۹-وزارت کے ارکان ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ہاتھ ملائیں گے اور انھیں ہار پہنائیں گے۔

۱۰-نائب صدر سپاس نامہ پیش کریں گے۔

۱۱-ڈاکٹر سر محمد اقبال سپاس نامہ پیش کریں گے۔

۱۲-صدر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا شکریہ ادا کریں گے اور جلسہ کی کاروائی ختم ہونے کا اعلان کریں گے۔

۱۳- ہال میں موجود تمام حضرات اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک کہ جلوس مقررہ ترتیب کے ساتھ واپس نہ چلا جائے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے سپاس نامہ کا جواب

نومبر ۱۹۲۹ء میں جب علاّمہ سر محمد اقبال علی گڑھ تشریف لے گئے تو یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے آپ کی خدمت میں ۲۹/نومبر کو ایک سپاس نامہ پیش کیا اور آنریری لائف ممبر شپ

دی۔ استقبال کی گرمجوشی اور ممبر شپ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد، علاّمہ اقبال نے سپاسنامے کے جواب میں فرمایا:

ممکن ہے کہ آپ کو یہ اندیشہ ہو کہ مَیں آپ کے سپاسنامہ کے جواب میں ایک ناصح مشفق کی طرح آپ کو کوئی نصیحت کرنے یا بعض نکات حکمت پیش کرنے لگوں گا۔ لیکن مَیں آپ سے فوراً اور صاف کہہ دیتا ہوں کہ میرے پاس اس قسم کی پندونصیحت کچھ نہیں اور نہ میرے پاس کوئی نکتہ حکمت ایسا ہے جو دوسروں کے لیے بطور دستور العمل پیش کر سکوں۔ مگر پھر بھی میں ایک دو باتیں ایسی کہوں گا جو کتابوں پر نہیں، میرے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب سے ہمارے تعلقات یورپ، خصوصا انگلستان، سے قائم ہوئے ہیں، اس وقت سے بہت سی چیزیں ہم تک وہاں سے پہنچی ہیں۔ سب سے اول چیز انگریزی لٹریچر ہے جو ہمارے بہت سے نوجوان مصنّفین کے لیے تخلیق مضامین کا ذریعہ ہوا ہے۔ وہ مضامین جنھوں نے موجودہ نسل کی ذہنیت کی تشکیل و توضیح میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ دوسری بات جو ہم کو انگلستان سے ملی ہے وہ افکار کی عادت ہے۔ میرے نزدیک یہی عادت اس ملک کے لیے بہترین نعمت ہے جس سے واقعات کے خلاف اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور مسلسل طور پر محض خیال آرائیوں سے کام لیتا رہا ہے۔ الغرض فکر ثقیل کی عادت ہم کو انگلستان سے ملی ہے اور در حقیقت یہی وہ چیز ہے جس کی اس وقت تمام مشرق کو ضرورت ہے۔ تیسری چیز جو انگلستان نے ہم کو دی ہے وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے اور وہ 'ڈیموکریسی' ہے۔ جس صورت میں یہ ڈیموکریسی آ چکی ہے اور جو بمقدار کثیر آئندہ آنے والی ہے، وہ افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھاتی۔ ذاتی طور پر مَیں اس ڈیموکریسی کا معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کر لیتا ہوں کہ فی الحال اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ مگر خیر اب چونکہ یہ ڈیموکریسی انگلستان سے آ چکی ہے اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ موجودہ نسل نوجواناں کے لیے کس قدر مفید ہے۔ واضح ہو کہ ''ڈیموکریسی'' کے معنی صاف، علی رؤس الاشہاد اور آزادیٔ بحث و تمحیص ہیں...... حضرات مَیں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ کل تمام دنیا کو فتح کر لینا چاہتے ہیں تو آپ کو لازم ہے کہ آپ اچھے مقرر بن جائیں اور یہ مقصد اسی صورت حاصل ہو سکتا ہے کہ یونین کی روایت کو قائم رکھا جائے۔

ایک دوسری بات جس پہ مَیں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے۔ مَیں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ مَیں تو مستقبل کا معتقد

ہوں۔مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ مَیں حال کو سمجھوں۔اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سر چشمہ تہذیب وشائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مَیں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں۔کیونکہ ہم جدید تہذیب وشائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں اس لیے ہم علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے ہیں۔مَیں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔اِن میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی عائد کیا گیا ہے۔یہ وہ نعمت ہے جو قرآن کریم نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے۔اس طریقہ استقرائی کے نتائج اور ثمرات آج ہم کو نظر آ رہے ہیں۔مَیں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں، مگر مَیں ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو مَیں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلمبند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطمحِ حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔مَیں اُمید کرتا ہوں کہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کرے گی جو اپنی زندگیاں مطالعہ قرآن میں صرف کر دیں گے۔مَیں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔گذشتہ چند سال سے مَیں صرف اپنے جسدِ خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک مَیں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔‘‘

خطبات کی تدوین اور اہمیت

علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد اقبال اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود خطبات کو کتابی صورت میں مکمل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔خطبات کے عنوانات اور متن میں کچھ تبدیلیاں کیں اور بالآخر ۱۹۳۰ء کے وسط میں چھ خطبات پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی اور اس کا نام (Six lectures on the Reconstruction of Religious thoughts in Islam.) رکھا۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کا خاصا چرچا ہوا۔یہ خطبات اعلیٰ ترین حکیمانہ مباحث پر مشتمل ہیں جن کو عوام تو کُجا، خاص اصحاب بھی جنھیں فلسفہ اور کلامی مسائل سے دلچسپی نہ ہو شاید ہی سمجھ سکتے

ہوں۔خود اقبال نے ان کے بارے میں کہا۔

من بہ طبعِ عصرِ خود گفتم دو حرف
کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف!
حرفِ پیچا پیچ و حرفِ نیش دار
تا کنم عقل و دلِ مرداں شکار!

ترجمہ:

چھیڑا ہے دو حرف سے عصر رواں کے ذہن کو
بند مَیں نے دو پیالوں میں کیا بحرین کو
حرف پیچا پیچ میرے حرف میرے نیش دار
تا کہ یوں عقل و دلِ مرداں کو مَیں کر لوں شکار

اگست ۱۹۳۲ء میں انگلستان کی ارسطا طالیس سوسائٹی کی طرف سے اقبال کو فلسفیانہ موضوع پر لیکچر دینے کی درخواست کی گئی۔ یہ درخواست قبول کرتے ہوئے اقبال نے ''Is Religion Possible?'' کے عنوان سے ایک خطبہ تیار کیا۔ سال کے آخر میں جب اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو یہ مذکورہ خطبہ سوسائٹی کے ایک اجتماع میں دیا۔

انگلستان کے علمی حلقوں میں اس خطبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اقبال کے ایک مداح لارڈ لودین کے ایما پر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے خطبات کی مکرّر اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس اشاعت میں کتاب میں ساتویں خطبے کا اضافہ کیا گیا اور کتاب کے عنوان سے ''Six lectures on'' کے الفاظ حذف کردیے گئے۔ اس اشاعت کے لیے اقبال نے خطبات پر ایک بار پھر نظر ثانی کی اور متن میں کئی تبدیلیاں کیں۔

اقبال نے اِن خطبات کی تیاری میں بہت محنت اور عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ اُن کی شدید خواہش تھی کہ مسلمان اِن سے مستفیض ہُوں۔ انھوں نے ایک بار فرمایا ''اگر میری یہ کتاب خلیفہ مامون رشید کے دَور میں شائع ہوتی تو پورے عالمِ اسلام میں تہلکا مچ جاتا''۔ مسلمانوں کی اِن خطبات سے بے رُخی اور بے اعتنائی کی جھلک اقبال کی محفل میں اس ایک واقعہ سے دیکھی جا سکتی ہے کہ محمد محمود سابق جنرل منیجر سمال انڈسٹریز حکومتِ پاکستان ۱۹۳۳ء میں فلسفہ کے طالب

علم تھے۔ ایک دن اپنے احباب کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے پوچھ لیا بھئی آپ نے Reconstruction of Religious Thoughts in Islam کے موضوع پر میرے لیکچرز پڑھے ہیں۔ محمود صاحب نے ندامت کے ساتھ عرض کیا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ اگر تم ہاں کہتے تو مجھے تعجب ہوتا کیونکہ اب تک مَیں نے کئی مسلمان دوستوں سے یہ سوال کیا ہے لیکن سب نے یہی کہا کہ ہم نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا لیکن یہ کس قدر عجیب اتفاق ہے کہ ہندُو یونیورسٹی بنارس کے ہندوطلباء نے یہ لیکچرز نہ صرف پڑھے ہیں بلکہ ایک ملاقات میں انھوں نے مجھ سے ان تقریروں سے متعلق متعدد سوالات کیے اور بیان کیے ہوئے نکات پر مجھ سے طویل جرح اور بحث کرتے رہے۔ جناب محمد محمود اور اُن کے ساتھی ڈاکٹر صاحب کے اس انکشاف پر حیران رہ گئے۔

☆☆☆

باب:۱۰

خطبۂ الٰہ آباد

اشتیاق حسین قریشی نے اپنی انگریزی تصنیف ''پاکستان کے لیے جدوجہد'' میں اقبال سے پیشتر برصغیر میں مسلم ریاست کا تصوّر پیش کرنے والوں میں جمال الدین افغانی، چودھری رحمت علی، ڈاکٹر عبدالجبار خیری، پروفیسر عبدالستار خیری، محمد عبدالقادر بلگرامی، لووٹ فریزر، ساورکر، لالہ جپت رائے، سردار گل خان، مولانا محمد علی اور آغا خان کے ناموں کا ذکر کیا ہے، لیکن ان سب اور اقبال میں وہ یہ فرق روا رکھتے ہیں کہ اقبال نے ایک اہم عوامی شخصیت کے طور پر مسلم ریاست کا تصوّر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کیا۔ گویا وہ بھی اس سلسلے میں اقبال کے مسلم ریاست کے پیش کردہ تصوّر سے قبل اس کے لیے فکری یا نظریاتی اساس کے فراہم کرنے یا زندگی بھر اس کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے کے پہلوؤں کو نظر انداز کرنا مناسب خیال کرتے ہیں یا شاید حیاتِ اقبال کے یہ اہم پہلو ان کے علم یا تحقیق کی زد سے باہر رہے۔

خیری برادران* ۔ ڈاکٹر عبدالجبار خیری، پروفیسر عبدالستار خیری (عُمِ زاد سیّد ابوالاعلیٰ مودودی) نے ۱۹۱۷ء میں ''اسٹاک ہوم سوشلسٹ انٹرنیشنل'' کے ایک اجلاس میں تقسیمِ ہند (مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا) کی تجویز پیش کی تھی۔

پاکستان کے تصوّر کے متعلق محمد احمد خان تحریر کرتے ہیں:

''تصوّرِ پاکستان کو جن اشخاص سے منسوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان میں سے کسی کو بھی تصوّرِ پاکستان کا بانی اوّل قرار دینا درست نہیں ہے۔ ان میں سے بعض (جیسے سرسیّد، تھیوڈور ماریسن) نے صرف دو قومی نظریے کا اظہار کیا، بعض (جیسے بلنٹ، شرر بمبوق، خیری برادران، سردار گل خان، مولانا حسرت موہانی، لالہ جپت رائے، مرتضیٰ احمد خان) نے مسلم اضلاع یا مسلم صوبوں کے قیام کا خیال ظاہر کیا اور بعض (جیسے عبدالقادر بلگرامی اور نادر علی)

نے حلقۂ اثر یا تقسیم ہند کی مبہم تجویز پیش کی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سب تجاویز ۱۹۳۰ء سے قبل (یعنی علاّمہ اقبال کے تصوّر پاکستان پیش کرنے سے پہلے) کی ہیں، لیکن ان میں کسی تجویز کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ہم ان تجاویز کو پڑھتے ہیں تو ہمارے متخیلّہ میں پاکستان کا موہوم سا تصوّر یا ہلکی سی جھلک پیدا ہوتی ہے، لیکن اقبال کی پوری سیاسی فکر اور عملی جدوجہد کے پس منظر میں، جب ہم ان کے خطبۂ صدارت مسلم لیگ اور قائداعظم کے نام ان کے دونوں خطوط (مورخہ ۲۸رمئی ۱۹۳۷ء اور ۲۱رجون ۱۹۳۷ء) کو بنظرِ غائر دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے پاکستان کی نہایت واضح، بہت ہی صاف اور کاملاً جامع تصویر اجاگر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام تجاویز میں صرف ایک ہی قدرِ مشترک ہے اور وہ قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان میں ایک تاثر یا ایک احساس پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیٰحدگی کا تاثر یا مسلمانوں کی ہندووں سے مغائرت کا احساس، لیکن پاکستان کا تصوّر کسی مبہم احساس یا سرسری تاثر کا نام نہیں ہے۔ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنی نغمہ سرائی کے ذریعے اس احساس کو مسلمانانِ برصغیر کے لاشعور سے نکال کر ان کے شعور میں لے آئے۔ پھر اپنی صوتِ سرمدی سے اس شعور کو پختہ کیا اور اپنی سیاسی بصیرت سے اس کی عملی تجسیم و تشکیل کا خاکہ پیش کیا اور یہی اُن کی اوّلیت ہے''۔

الٰہ آباد آمد

۱۹۳۰ء میں سیاسی حالات کچھ ایسے تھے کہ قوم نہ تو کسی کو اپنا واحد لیڈر تسلیم کر سکتی تھی، نہ اسے اپنے قدیم لیڈروں پر اعتماد باقی رہا تھا۔ ان دنوں لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جس کا کانگریس نے تو بائیکاٹ کر رکھا تھا، لیکن مسلمانوں کے تمام سربرآوردہ لیڈر اس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ان حالات میں علاّمہ اقبال کا صدارت کے لیے منتخب کیا جانا بلاشبہ انتہائی دانش مندی پر مبنی تھا، کیونکہ اوّل تو وہ علمی طور پر مسلمانوں کی ان جماعتوں سے غیر متعلق تھے جو ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ دوسرے ہر جوان، بوڑھا، بچہ ان کو بحیثیتِ شاعر عزت کی نظر سے دیکھتا اور ان کی عظمت کا دل سے معترف تھا۔

ایک چیز جو ہمارے کسی حد تک ناقابلِ فہم تھی، وہ مقامِ اجلاس کا انتخاب تھا۔ کیونکہ اکبر مرحوم نے اس وقت الٰہ آباد کے مسلمانوں کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

اَب الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبُود کے
یاں دھرا کیا ہے بجُز اکبر کے اور امرُود کے

اور واقعی وہاں مسلمانوں کا کوئی قومی لیڈر تھا ہی نہیں۔ اس کے برخلاف گنگا اور جمنا کے سنگم کی وجہ سے یہ شہر ہندوؤں کا کعبہ سمجھا جاتا تھا اور ہندوستان کے ہر حصے سے زائرین لاکھوں کی تعداد میں اشنان کے لیے وہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ دوسری چیز آنند بھون تھی۔ یہ جواہر لال نہرو کے والد موتی لال نہرو کا شاندار محل تھا جسے انھوں نے گاندھی کے زیرِ اثر آنے کے بعد قوم کے لیے وقف کر دیا تھا اور اب ''سوراج بھون'' کہلاتا ہے۔ ہندوستان میں کانگریس کا یہی سب سے بڑا مرکز اور سب سے مضبوط گڑھ تھا...... گاندھی جی یہیں ٹھہرا کرتے تھے اور یہیں بیٹھ کر ہندو اقتدار کی چالیں سوچی جاتی تھیں۔ تیسرا مرکز یونیورسٹی تھی جس پر برہمن ابتدا ہی سے قابض تھے۔ صرف تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر شفاعت احمد خاں مسلمان تھے۔ ان کی مثال بتیس دانتوں میں زبان کی سی تھی، لیکن وہ چومکھی لڑتے تھے، نہ کبھی برہمن اقتدار کے آگے سر جھکاتے اور نہ آنند بھون کا طواف کرتے۔ اُردو کم جانتے ہوئے بھی اپنی مادری زبان کے حامی اور اسلامی تعلیم سے نابلد ہوتے ہوئے بھی الٰہ آباد میں مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر اور جُدا گانہ انتخاب کے مؤیّد تھے۔ مراد آباد کے حلقے سے صوبائی کونسل کے ممبر تھے اور آئینی مسائل کی گہرائیوں میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ سر تیج بہادر سپرو جیسے مقنّن بھی ان کی تعریف کرتے تھے۔ اپنے جیب خرچ سے ایک ہفتہ وار اخبار ''سٹار'' نکالتے تھے جس کے عملے میں صرف ایک ایڈیٹر رحم علی الہاشمی تھے، باقی مضامین وہ خود ہی لکھتے تھے۔

اقبال ۱۹؍دسمبر ۱۹۳۰ء کی صبح کو الٰہ آباد پہنچے۔ اسٹیشن پر ان کے میزبان نواب سر محمد یوسف اور چند دوسرے مسلم لیگی لیڈر موجود تھے۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم انہیں دیکھنے کی خاطر اکٹھا ہو گیا تھا، اور نہایت گرمجوشی سے اُن کا خیر مقدم کیا گیا۔ سیّد شمس الحسن تحریر کرتے ہیں کہ اقبال کے عظیم الشان استقبال کی اصل وجہ اُن کی منفرد شخصیت تھی اور لیگ کے اجلاس سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں ایک جلوس کی شکل میں اسٹیشن سے نواب سر محمد یوسف کی کوٹھی لے جایا گیا۔

۳۰؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو لیگ کا اجلاس کا لیون ہسپتال (اب موتی لعل نہرو ہسپتال) کے بالمقابل مسلمانوں کے محلّہ یا قوت گنج میں واقع دوازدہ منزل میں منعقد ہوا۔ اس زمانے میں

اس عمارت کے مالک ایک تاجر شیخ رحیم بخش تھے، جن کا تمباکو کا بہت وسیع کاروبار تھا اور شیخ رحیم بخش کا خاندان تمباکو والوں کا خاندان کہلاتا تھا۔ عمارت کے صحن یا ہال کے چاروں طرف بارہ دروازے برآمدوں میں کھلتے تھے، اسی لیے اس کا نام دوازدہ منزل رکھا گیا تھا۔ اجلاس میں لیگ کے صرف چند نمائندوں نے شرکت کی اور اس کا کورم بھی بڑی مشکل سے پورا ہوا۔ سیّد حسین امام، مولوی عبدالقادر قصوری، سر محمد یعقوب، مولانا عبدالماجد بدایونی، سیّد حبیب اور ذاکر علی اجلاس میں موجود تھے۔ مفتی فخر الاسلام وکیل کے مطابق، جو اس جلسے میں موجود تھے، حاضرین کی تعداد مشکل سے چار یا پانچ سو ہو گی یا شاید اس سے بھی کم۔ ان میں بہت سے اسکول کے لڑکے بھی شامل تھے، جو تفریحاً شریک ہو گئے۔ اقبال، نواب سر محمد یوسف کے ساتھ موٹر کار میں بیٹھ کر جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ نہایت خاموشی سے جلسے کی کاروائی شروع ہوئی تلاوتِ قرآن مجید کے بعد اقبال نے اپنا خطبہ پڑھنا شروع کیا۔

خطبۂ الٰہ آباد

''حضرات!

میں آپ کا دل کی گہرائی سے ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے ہند کے مسلم فکر و عمل کی تاریخ کے انتہائی نازک لمحے پر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی دعوت دے کر اعزاز سے نوازا۔ مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اس مہتم بالشان اجتماع میں ایسے افراد موجود ہیں جن کا سیاسی تجربہ میرے تجربے سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جن کے علمِ معاملات کا مَیں انتہائی احترام کرتا ہوں۔ لٰہذا میرے لیے ایسے افراد کی سیاسی فیصلوں کے ضمن میں جنھیں وہ آج کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، رہنمائی کرنے کا دعویٰ خودستائی کے مترادف ہوگا۔ میں کسی جماعت کی قیادت نہیں کرتا نہ ہی کسی قائد کا پیروکار ہوں۔ مَیں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام، اُس کے قوانین، اُس کے نظامِ سیاست، اس کی ثقافت، اس کی تاریخ اور اس کے ادب کے محتاط مطالعے میں صَرف کیا ہے۔ روح اسلام کے ساتھ اس پیہم رابطے نے جیسا کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے پرت پلٹتا رہتا ہے، مَیں سمجھتا ہوں کہ ایک عالمی حقیقت کے طور پر اس کی اہمیت کے بارے میں مجھے ایک طرح کی بصیرت عطا کر دی ہے۔ اس وجدان کی روشنی میں، جس کی قدر و قیمت خواہ کچھ بھی ہو، یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانانِ ہند روحِ اسلام سے مخلص رہنے کا

عزم رکھتے ہیں میرا ارادہ یہ ہے کہ آپ کے فیصلوں کے ضمن میں آپ کی رہنمائی کرنے کی بجائے اس سے کمتر درجہ کا کام سرانجام دوں اور وہ یہ کہ مَیں آپ کی توجّہ اس اہم اصول کی جانب مبذول کرا دوں جس کی بنا پر میری دانست میں اِن فیصلوں کی عام نوعیت کا تعین کرنا چاہیے۔ تاہم یہ دکھ کی بات ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ داخلی ہم آہنگی کے اصولوں کی دریافت کے ضمن میں ہماری مساعی اب تک بارآور ثابت نہیں ہوئیں۔ وہ ناکام کیوں ہوئیں؟ شاید ہم ایک دوسرے کی نیّتوں پر شک کرتے ہیں اور باطنی طور پر ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاید باہمی تعاون کے وسیع تر مفاد میں ہم ان اجارہ داریوں سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں جو حالات نے ہماری تحویل میں دے دی ہیں اور اپنی انا کو قوم پرستی کے لبادہ میں چھپانا چاہتے ہیں۔ بظاہر تو کشادہ دلی کے ساتھ حُبِّ وطن کرنے کے لیے آمادہ نہیں کہ ہر گروہ کو اپنی ثقافتی روایات کے مطابق آزادانہ طور سے ترقی کا حق ہے۔ مَیں دوسرے فرقوں کے رسم و رواج، قوانین اور مذہبی اور معاشرتی اداروں کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ قرآنی تعلیم کے عین مطابق یہ میرا فرض ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو مَیں ان کی عبادت گاہوں کا دفاع بھی کروں۔ تاہم اس فرقہ وارانہ گروہ سے محبت کرتا ہوں جو میری زندگی اور روّیے کا سرچشمہ ہے اور مجھے اپنا مذہب، اپنا ادب، اپنی فکر اور اپنی ثقافت عطا کر کے مجھے وہ کچھ بنا دیا جو آج مَیں ہوں اور اس طرح سے اپنے تمام ماضی کی از سرِ نو تخلیق کو میرے موجودہ شعور میں ایک زندہ اور فعال عنصر کے طور پر داخل کر دیا‘‘۔

علاّمہ خطبہ پڑھنے کے دوران اپنے مطالب کی وضاحت قرآنی آیات، احادیث کے حوالوں اور تشریحی جملوں سے کرتے رہے۔ جب اپنی تقریر کے اس مقام پر پہنچے جہاں وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے مغل بادشاہ اکبر اور کبیر بھگت کی طرف سے کی جانے والی ناکام کوششوں کا ذکر کر رہے تھے تو سامعین میں سے کسی نے بلا سبب و تحریک نعرۂ تکبیر بلند کیا جس سے علاّمہ کی تیوری پر بل پڑ گئے اور انھوں نے سلسلۂ کلام کچھ دیر کے لیے منقطع کر دیا، کیونکہ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ حاضرین کی بڑی تعداد اُن کے خیالات سے آگہی نہیں رکھتی۔

جب علاّمہ اس فقرے پر پہنچے کہ مسلم قوم کی طرف سے برصغیر میں ایک اسلامی مملکت قائم کرنے کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے تو اس کی وضاحت کے لیے انھوں نے ایک ثانیہ رُک کر تشریحاً ایک منفرد سیاسی اصطلاح استعمال کی جو سامعین کی اکثریت نے پہلے نہ سنی تھی۔ انھوں

نے کہا اس سے میری مراد ہے۔ An Imperium in Imperio (اقتدارِ اعلیٰ کے اندر کامل اختیار) تو مجمع میں موجود تعلیم یافتہ احباب کے مُنہ سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلا اور جلسہ گاہ صدائے تحسین سے گونج اٹھی۔ علاّمہ کا چہرہ دمک اٹھا اور گردن کے اشارے سے انھوں نے یہ داد قبول فرمائی۔ اس کے بعد انھوں نے قدرے بلند آواز میں اپنی وہ شہرۂ آفاق تجویز پیش کی جس میں مسلم اکثریتی صوبوں کو یکجا کر کے برطانوی سلطنت کے اندر یا باہر ایک مضبوط اسلامی مملکت کے قیام کا اشارہ پنہاں تھا۔ مگر حاضرین میں اُس وقت کوئی بھی اس کے دُوررَس نتائج نہ سمجھ سکا اور اس پر علاّمہ کو اتنی بھی تحسین نہ ملی جتنی انہیں اپنے کسی شعر پر مل سکتی تھی۔

خطبہ الٰہ آباد کے اختتامی کلمات

خطبۂ الٰہ آباد کو علاّمہ اقبال نے جس طرح ختم کیا وہ اندازِ بیان اور طرز اُن کی قرآن سے محبت، اسلام سے وابستگی اور مسلمانانِ برصغیر کے مسائل سے دردمندی و آگہی ظاہر کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''حضرات! میری تقریر ختم ہوئی۔ آخر میں مَیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انڈیا کی تاریخ کے موجودہ نازک دور میں مسلمانوں کو مکمل تنظیم، اتحاد، عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے یہ بحیثیتِ قوم مسلمانوں اور انڈیا کے اجتماعی مفاد کے لیے ضروری ہے۔ برصغیر کی سیاسی غلامی پورے ایشیاء کے لیے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ تھی اور اب بھی ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہارِ ذات کی مسرّت سے پوری طرح محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی ایک بڑا اور شاندار تمدّن پیدا ہوا تھا۔ ہم پر ہندوستان کی طرف سے بھی ایک فرض عائد ہوتا ہے، جہاں جینا اور مَرنا ہمارا مقدر ہے۔ ہم پر ایشیا بالخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی ایک فرض عائد ہے۔ ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی تمام مسلم ایشیا کے مسلمانوں کے مقابلے میں اسلام کے لیے انتہائی قیمتی سرمایہ ہے۔ ہمیں برصغیر کے مسئلہ پر صرف مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے ہی نہیں ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھنا چاہیے۔ ایشیا اور ہندوستان کی طرف سے عائد شدہ فرض ہم اس وقت وفاداری سے ادا نہیں کر سکتے جب تک ہم ایک مخصوص مقصد کے لیے منظّم عزم نہ کر لیں۔ اگر آپ انڈیا کی دوسری سیاسی جماعتوں میں اپنا ایک سیاسی وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لیے اس طرح کا بندوبست قطعی ضروری

ہے۔ ہماری منتشر حالت کے باعث ایسے سیاسی مصالح الجھ گئے ہیں جو کہ ہماری ملی زندگی کے لیے بہت ضروری ہیں۔

میں فرقہ وارانہ تصفیہ سے مایوس نہیں ہوں، لیکن آپ سے اپنا یہ احساس بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ بحران سے نبٹنے کے لیے ہماری ملّت کو مستقبل قریب میں ایک آزادانہ راہِ عمل اختیار کرنا پڑے گی اور آزادانہ سیاسی راہِ عمل ایسے نازک وقت میں صرف ان لوگوں کے لیے ہی ممکن ہے جو عزم کے مالک ہوں اور جن کی قوتِ ارادی ایک مقصد پر مرکوز ہو۔ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ متحدہ عزم کے لیے منظّم کاملیّت حاصل کرلیں؟ بے شک یہ ممکن ہے فرقہ بندی اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جایئے اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجیے خواہ وہ مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔ اس نصب العین کی روشنی میں، جس کی آپ نمائندگی کر رہے ہیں، مادہ سے گزر کر روحانیت کی طرف آیئے۔ مادہ کثرت ہے۔ روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے، مسلمانوں کی تاریخ سے مَیں نے ایک سبق سیکھا ہے کہ آڑے وقتوں میں مسلمانوں کو اسلام نے بچایا ہے، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نظریں اسلام پر جما دیں۔ اور اس کے زندگی بخش تخیّل سے متاثّر ہوں تو آپ اپنی پراگندہ قوتوں کو از سرِ نو جمع کرلیں گے اور اپنی صلابتِ کردار کو دوبارہ حاصل کرلیں گے۔ اس طرح آپ اپنے آپ کو مکمل تباہی سے بچا لیں گے۔

قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت (سورہ لقمان، آیت ۲۸) یہ ہے ''پوری انسانیت کی موت وحیات بھی فردِ واحد کی موت و حیات کی طرح ہے''۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ جو سب سے پہلے انسانیت کے ارفع و اعلیٰ تصوّر پر عمل پیرا ہوئے، اسی اصول پر جییں اور آگے بڑھیں اور اپنے آپ کو نفسِ واحد کی طرح رکھیں۔ مَیں جب یہ کہتا ہوں کہ انڈیا کی حالت وہ نہیں ہے جو بظاہر نظر آتی ہے تو میرا مقصد کسی کو پریشان کرنا نہیں ہے۔ بہر حال اس کے صحیح معنی آپ پر اس وقت ظاہر ہو جائیں گے جب آپ اِن کے مشاہدے کے لیے ایک صحیح اجتماعی خوداعتمادی پیدا کرلیں گے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

عَلَیکُم اَنفُسَکُم لَا یَضُرُّکُم مَّن ضَلَّ اِذَا اهتَدَیتُم۔ (سورہ المائدہ آیت ۱۰۵)

(تم پر لازم ہے اپنی جانوں کی حفاظت جب کہ تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا''۔)

علّامہ ابھی اپنا خطبہ ختم کر کے بیٹھے بھی نہ تھے کہ حاضرین نے یک زبان ہو کر علّامہ سے شعر خوانی کا مطالبہ کر دیا۔ علّامہ عموماً فرمائشی طور پر اشعار نہ سنایا کرتے تھے مگر مجمع کے پُرزور اصرار پر انھوں نے بے رغبتی سے مدھم آواز میں خودی سے متعلق چند اشعار سنائے۔ ہال میں مزید کی صدائیں بڑھیں تو علّامہ بہت دردمند لہجے میں حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگے اب مَیں آپ کو ایک حدیث مبارکہ سناؤں گا اگر آپ اس کے عامل ہو گئے تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے اس کے بعد انھوں نے مشہور حدیث پاک سنائی "من عرف نفسهٗ فقد عرف ربهٗ" (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے خدا کو پہچان لیا) اور یہ حدیث سُنا کر علّامہ اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

خطبہ الٰہ آباد پہ عمومی رائے اور لاہور واپسی

خطبہ انگریزی میں تھا اور غالبًا چند لوگ ہی اسے سمجھ سکے، باقیوں کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ فرانسیسی مفکر البرٹ کامیوں کا قول ہے کہ عظیم خیالات دنیا میں معصوم پرندوں کی طرح چپ چاپ آتے ہیں لیکن اگر ہم اپنی توجہ سے سننے کی کوشش کریں تو شاید قوموں اور سلطنتوں کے شور وغل میں ہمیں ان کے پروں کی ہلکی سی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دے جائے۔ گویا زندگی میں معمولی ہلچل کے ساتھ امید کا خاموش پیغام دیا جا رہا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبے میں جن امور کا ذکر کیا، اُن پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ خطبے میں پیش کردہ تجویز کی حمایت میں کوئی قرارداد منظور نہ ہوئی۔ مقامی اخباروں نے بھی خطبے کی تفصیل شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کسی کو بھی یہ احساس نہ ہوا کہ خطبے میں جو خیال پیش کیا جا رہا ہے، اس کے سبب ہزاروں انسان اپنی جانیں قربان کر دیں گے، لاکھوں انسانوں کی زندگیاں متاثر ہوں گی اور کروڑوں کی آبادی پر مشتمل ایک نیا ملک معرضِ وجود میں آ جائے گا۔ اقبال نے دو دن الٰہ آباد میں قیام کیا۔ ظہور احمد بیرسٹر کے ساتھ پیدل بازاروں میں گھومتے رہے۔ دکاندار اور لوگ بڑھ بڑھ کر اُن سے ملتے اور مصافحہ کرتے تھے۔ مفتی فخر الاسلام انہیں پرانا کالا ڈانڈا کے قبرستان میں لے گئے، جہاں انھوں نے اکبر الٰہ آبادی کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور واپسی تھی۔ اسٹیشن پر پہنچے، لیکن پنجاب میل لیٹ تھی۔ ریاض الٰہ آبادی کے بیان کے مطابق پلیٹ فارم پر دو چار اشخاص ان کے

ساتھ کھڑے تھے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:
جناب مَیں ایک معمولی طالب علم ہوں، اسکول میں مدرّس ہوں اور بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آیا، مہربانی کر کے اس کا مطلب واضح کر دیجیے۔ اقبال نے نہایت شفقت سے اُن کا ہاتھ پکڑا، انہیں درجہ اوّل کی انتظار گاہ میں لے گئے، بٹھایا اور پوچھا، کون سا شعر ہے؟ ریاض الٰہ آبادی نے عرض کیا۔

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

اقبال نے مطلب سمجھاتے ہوئے کہا، مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قومیں فنا نہیں ہوتیں، آئندہ نسلوں کی صورت میں اپنا قائم مقام پیش کر دیتی ہیں اور ان کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی ہے، جس طرح ستارے فنا نہیں ہوتے بلکہ اپنا قائم مقام آفتاب کی صورت میں پیش کر دیتے ہیں جو تابانی میں ستاروں سے کہیں زیادہ برتر ہے۔ اتنے میں پنجاب میل آ گئی اور وہ چلے گئے۔

خطبۂ الٰہ آباد میں شمال مغربی ہند میں مسلم ریاست کا تصوّر تو پیش کیا گیا، لیکن مسلم اکثریتی صوبہ بنگال کا ذکر موجود نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجوّزہ مسلم ریاست کا تصوّر ایک نصب العین کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور شمالی مغربی ہند میں مسلم ریاست کے قیام کے سلسلے میں بھی وہاں کی مسلم اکثریت کے بارے میں ''کم از کم'' کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے، جس سے ظاہر ہے کہ بنگال بھی اقبال کے پیشِ نظر تھا، مگر اس کا واضح ذکر اس لیے نہ کیا گیا کہ اگر شمال مغربی ہند میں مسلم اکثریت کی بنا پر مسلم ریاست کے قیام کا اصول قابلِ قبول ہوتا ہے تو منطقی طور پر اسی اصول کا اطلاق مشرقی ہند پر بھی کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک مسلم اقلیتی صوبوں کا تعلق ہے، ان کا خطبے میں ذکر کرنا اس لیے غیر ضروری تھا کہ وہاں مسلمانوں کو ویٹیج یا پاسنگ دینے پر ہندوؤں کو کوئی اعتراض نہ تھا، بلکہ شمال مغرب میں مسلم ریاست کے قیام کے نتیجے میں قوّت کے توازن کے سبب ان کی پوزیشن زیادہ مضبوط ہوتی تھی۔

خطبے میں پیش کردہ تجویز کی تائید میں کوئی قرارداد منظور نہ کیے جانے کا ایک سبب تو یہ تھا کہ لیگ کے سرکردہ لیڈر محمد علی جناح سمیت گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے ہوئے تھے، لیکن چند اور اہم وجوہ بھی تھیں۔ اس مرحلے پر ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کے لیے

مسلمانوں کی طرف سے محمد علی جناح نے چودہ نکات پیش کر رکھے تھے اور گول میز کانفرنس میں حکومتِ برطانیہ کے نمائندوں کے سامنے بھی یہی مطالبات تھے۔ گویا چودہ نکات ابھی زیرِغور تھے اور ان کے قبول یا کلّی طور پر رد کیے جانے کا حتمی فیصلہ ابھی ہونا تھا۔ اس صورتِ حال میں اقبال کی پیش کردہ تجویز کی تائید میں کوئی قراداد منظور کرنا نا مناسب یا قبل از وقت تھا۔ علاوہ ازیں اس کے باوجود کہ اقبال، لیگ کے ساتھ عرصہ سے وابستہ تھے، پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے سیکرٹری رہ چکے تھے اور اب مسلم لیگ کے منتخب صدر کے طور پر اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے، انھوں نے خطبے کے ابتدائی حصے میں واضح کیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے رہنما یا کسی سیاسی رہنما کے پیرو کار کی حیثیت سے مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش نہیں کر رہے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اقبال کی پیش کردہ تجویز ایک متبادل بلکہ ایک قدم آگے بڑھانے کی تجویز تھی، یعنی اگر چودہ نکات رد کر دیے گئے یا ہندوستان کے اندر مسلم انڈیا قائم کرنے کی تجویز منظور نہ ہوئی تو پھر یہ لائحۂ عمل اختیار کرنا پڑے گا۔ اقبال نے خطبے کے آخری حصے میں اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''مَیں کسی فرقہ وارانہ سمجھوتے کے امکان کے متعلق ناامید نہیں ہوں، لیکن مَیں اپنا یہ احساس بھی آپ سے مخفی رکھنا نہیں چاہتا کہ موجودہ سیاسی بحران سے نمٹنے کی خاطر ملّتِ اسلامیہ کو مستقبل قریب میں ایک آزادانہ راہ عمل اختیار کرنی پڑے گی اور ایسے نازک وقت میں آزادانہ سیاسی راہِ عمل اختیار کرنا صرف انھی لوگوں کے لیے ممکن ہے جو باعزم ہوں اور اپنی قوت ارادی ایک مخصوص مقصد پر مرتکز کر سکیں''۔ چنانچہ خطبے میں ایک مخصوص متبادل مقصد مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا گیا، لیکن اس کی تائید میں فوری طور پر کسی قرارداد کو ترتیب دینے یا منظور کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ حالات اس کے موافق نہ تھے۔''

ہند میں مسلم ہند

علّامہ نے مزید فرمایا: ''ہند جیسے ملک میں فرقہ واریت اپنے اعلیٰ وارفع پہلو کے ساتھ ایک ہم آہنگ کل کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہے۔ ہندی معاشرے میں وحدتیں اس طرح علاقائی نہیں ہیں جس طرح یورپی ممالک میں ہیں۔ ہند ایسے لسانی گروہوں کا برّ اعظم ہے جن کا تعلق مختلف نسلوں سے بنا جو مختلف زبانیں برتتے ہیں اور مختلف مذاہب کے پیرو کار ہیں۔ ان کا رویّہ ایک مشترکہ نسل کے شعور سے متعین نہیں ہوتا۔ ہندو بھی یک جنسی گروہ تشکیل نہیں دیتے۔

فرقہ وارانہ گروہوں کی حقیقت کو تسلیم کیے بنا یورپی جمہوریت کے اصول کا اطلاق ہند پر نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہند میں مسلم ہند قائم کر دیا جائے بالکل حق بجانب ہے۔ دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد، میرے خیال میں، کلیتاً اسی ارفع تخیل سے متاثر ہوئی کہ ایک ہم آہنگ کل اپنے اجزائے ترکیبی کی انفرادیتوں کا گلا گھوٹنے کی بجائے انہیں یہ مواقع عطا کرتا ہے کہ ان میں جو امکانات مضمر ہیں انہیں مکمل طور سے بروئے کار لے آئیں۔ اور مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں کہ یہ ایوان اس قرارداد میں موجود مسلمانوں کے مطالبات کی پُرزور انداز میں حمایت کرے گا۔ ذاتی طور پر تو مَیں اِن مطالبات سے کہیں آگے جاؤں گا۔ مَیں چاہوں گا کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ضم کر کے ایک واحد ریاست بنا دی جائے اور اسے خود مختاری دے دی جائے۔ برطانوی سلطنت کے اندر یا برطانوی سلطنت کے باہر شمال مغربی ہندی مسلمانوں کی ایک مستحکم ریاست کا قیام مسلمانوں کی حتمی تقدیر نظر آتی ہے''۔

ہندو اور انگریز کا واویلا

بہر کیف اقبال کی احتیاط کے باوجود، حکومتِ برطانیہ کے سرکردہ لیڈروں نے جو اپنی طرف سے ہندوستان کے آئندہ دستور کا پیچیدہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، اقبال کے خطبے کو پسند نہ کیا۔ بمبئی کے انگریزی اخبار ''انڈین ڈیلی میل'' نے اپنے لندن کے نامہ نگار کے حوالے سے لکھا کہ اقبال کے خطبے پر وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ سخت برہم ہوئے۔ الہ آباد کے انگریزی اخبار ''لیڈر'' کے نمائندے نے لندن سے تحریر کیا کہ وفاقی حکومت کے تصوّر اور اس کی حمایت میں ہندوستانی رہنماؤں کے نظریات پر اقبال نے جو حملہ کیا ہے اس کے ردعمل کے طور پر برطانوی اور ہندوستانی حلقے شدید غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے دو اینگلو انڈین اخباروں ''پائونیر'' اور ''ٹائمز آف انڈیا'' نے بھی اپنے اداریوں میں اقبال کی تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے رجعت پسند اور ناقابلِ عمل قرار دیا ہے۔

جہاں تک ہندو پریس کا تعلق ہے، وہ خطبے پر تبصرہ کرتے وقت گالی گلوچ اور بہتان تراشی پر اتر آیا۔ اخبار ''ٹرائیبیون'' لاہور نے لکھا کہ اقبال کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو

نہیں کیا۔اس لیے وہ انتقام پر اتر آئے۔ پہلے آغا خان کو تار بھیج کر مخلوط انتخاب قبول کرنے پر احتجاج کیا اور پھر خطبۂ الٰہ آباد کے ذریعے ہندو مسلم مفاہمت کے تمام امکانات ختم کردیے۔ ''پرتاپ'' نے ایک مضمون بعنوان ''شمالی ہند کا ایک خوفناک مسلمان، ڈاکٹر اقبال کی گستاخیوں پر چند خیالات'' شائع کیا، جس میں اقبال کو جنونی، شرانگیز، احمق، خوفناک، زہریلا، تنگ خیال، پست نظر، متعصّب، قابلِ نفرت، کمینہ اور نالائق کے القاب سے نوازا گیا۔ پھر بھی، بقول عبدالسلام خورشید، ہندوؤں میں کم از کم ایک شخص ایسا تھا جس نے خطبے پر مثبت انداز میں تبصرہ کیا۔اس نے اپنا اصل نام ظاہر نہ کیا، لیکن ''ایک روشن خیال ہندو'' کے قلمی نام سے ''ٹائمز آف انڈیا'' میں تحریر کیا کہ وفاقی ڈھانچے میں دیسی ریاستوں کی شمولیت کے سبب ہندوؤں کی پوزیشن مسلمانوں کے مقابلے میں بہت مضبوط ہو جائے گی۔ اگر اقبال کی تجویز کے مطابق سندھ، سرحد اور بلوچستان کو پنجاب کے ساتھ ملا کر ایک شمال مغربی مسلم ریاست قائم ہو جائے تو اس میں ہندوؤں کو اس تجویز پر تشویش کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں۔

خطبۂ الٰہ آباد کے دیے جانے کے چند ہی روز بعد اس کی دھوم لندن میں بھی پہنچی اور وہاں کے اخبارات نے اس کے بعض حصّے شائع کیے۔ پہلی گول میز کانفرنس کی اقلیتوں کی سب کمیٹی میں ڈاکٹر مونجے نے بھی اپنی تقریر کے دوران خطبۂ الٰہ آباد پر برہمی کا اظہار کیا۔ انھوں نے فرمایا:

''مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اس مرحلے پر جو کچھ کل کے پریس میں سر محمد اقبال کی تقریر کی رپورٹ کی صورت میں شائع ہوا ہے۔اس کا ذکر کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ وہ ہندوستان میں مسلم لیگ کے صدر ہیں اور مجھے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت کوفت ہوتی ہے، لیکن چونکہ انھی خطوط پر مطالبات متواتر پیش کیے جا رہے ہیں، اس لیے مجھے نہایت تکلیف دہ احساس کے ساتھ ان کی طرف رجوع کرنا پڑا ہے۔ مَیں اپنے مسلم دوستوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جذبات کی رَو میں نہ بہہ جائیں۔ ہم سب لوگ ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہمارے اور تمھارے خون اور ہڈیوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہم سب ایک ہی قوم کی اولاد ہیں اور ہم تمھارے مذہب، تمدّن اور نسل کی ترقی کے لیے ہر وہ تحفظ دینے کو تیار ہیں جس کا تم مطالبہ کرتے ہو۔ مَیں تم سے اپیل کرتا ہوں کہ جرأت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو ہندوستان کی متحدہ قومیت میں مستغرق کر دو اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم اگلے دس برس کے لیے یہ تجربہ کر دیکھو تو تمہیں کبھی کسی قسم کی کوئی شکایت نہ رہے گی''۔

اس کا جواب سر محمد شفیع نے سب کمیٹی کے اجلاس منعقدہ یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو دیا۔ آپ نے فرمایا:

''ڈاکٹر مونجے نے اس تقریر کا خصوصی طور پر حوالہ دیا ہے جو کہتے ہیں سر محمد اقبال نے مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے الہٰ آباد میں تین چار روز ہوئے کی تھی۔ اے کاش! ڈاکٹر مونجے اس امر کی طرف اشارہ کر کے مجھے ایسے مسئلے پر زبان کھولنے کے لیے مجبور نہ کرتے جس کے متعلق بحث کرنے کا میرا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا۔ مَیں کمیٹی کو یقین دلاتا ہوں کہ کل صبح جب مَیں یہاں آیا تو ایسی نیّت کے ساتھ نہ آیا تھا۔ اب سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ جب تک اس تقریر کا پورا متن میرے سامنے نہ ہو، مَیں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اگر سر محمد اقبال نے کہا ہے کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں ہندوؤں کی پائیدار اور غیر متغیر اکثریت کے سبب سارے ہندوستان میں ہندو ریاست قائم ہوگی، یا ایسی غیر متغیر اور پائدار اکثریت کے سبب آٹھ گورنری صوبوں میں سے چھ میں ہندو ریاستیں قائم ہوں گی، تو پھر ان چار مسلم صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، چار مسلم ریاستیں کیوں نہ قائم کی جائیں؟ مجھے تو اس تجویز میں کوئی بُری بات دکھائی نہیں دیتی اور مَیں بذاتِ خود اس کمیٹی کے سامنے یہی تجویز دہرانے کے لیے تیار ہوں...... ہر صوبائی وحدت ایک ریاست بنا دی جائے۔ اگر انھوں نے (اقبال نے) یہ کہا ہے تو اس میں کچھ بھی نہیں اور اس پر اعتراض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ اگر انھوں نے مروّجہ اصطلاح کے مطابق برٹش کامن ویلتھ سے باہر کسی آزاد مسلم ریاست کے قیام کا ذکر کیا ہے تو مَیں سارے مسلم ڈیلی گیشن کی طرف سے ایسی تجویز کو ردّ کرتا ہوں۔ جناب وزیر اعظم! میں ایک مسلمان کے پیمانۂ صبر کے لبریز ہو جانے کا بخوبی تصوّر کر سکتا ہوں، جبکہ میرے دوست ڈاکٹر مونجے ہندوستان کے مختلف حصوں میں، بغیر سوچے سمجھے مختلف قسم کے ایسے ہی متضاد اعلانات کرتے پھرتے ہیں۔''

مسلم پریس کی تحسین

مسلم پریس، اقبال کے خلاف چلائی گئی ہندو پریس کی ہمہ گیر مہم کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہا۔ اقبال اور مہر میں اس قدر اشتراکِ فکر و عمل تھا کہ مہر نے ۳۰؍دسمبر ۱۹۳۰ء کی خطبۂ الٰہ آباد کا ترجمہ اقبال کی الٰہ آباد روانگی سے قبل کر لیا تھا اور یہ ترجمہ ۲؍جنوری ۱۹۳۱ء کے ''انقلاب'' میں شائع ہُوا۔ اس کے بعد مہر نے اس خطبے کی حمایت میں کئی اداریئے لکھے اور دیگر مصنّفین کے مضامین انقلاب میں شائع کیے جبکہ ہندو اخبارات نے نہ صرف افکارِ اقبال کی شدید مخالفت کی

بلکہ بعض اخبار نویس تو گالیوں پر اُتر آئے۔ مہر نے ایک اداریے میں تحریر کیا ہے کہ ''اگر مسلمانوں کے تمام مطالبات جو امن کی دلیل ہیں مان لیے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ میں وہ اپنی اکثریت کی وجہ سے غالب رہیں گے اور ہندوستان بھر کی ہندو اکثریت اُن کے غلبہ و اقتدار میں دست اندازی نہیں کر سکے گی۔ علاّمہ اقبال بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہتے۔ مسلم پریس اقبال کا ہمنوا تھا۔ ''مسلم آوٹ لک''، ''سیاست''، ''ہمدم لکھنؤ'' وغیرہ سب نے اقبال کی تجویز کا خیر مقدم کیا اور ''انقلاب'' تو ان کی حمایت میں سرفہرست تھا۔ ''انقلاب'' کے دو شماروں میں خطبہ الٰہ آباد کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''انقلاب'' نے جنوری ۱۹۳۱ء میں خطبے کے حق میں تقریباً بارہ اداریے تحریر کیے۔ ایک اداریے میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا، کہ تقسیم ہند کی تجویز تو دراصل ہندوؤں ہی کی طرف سے پیش کی گئی تھی، جب لالہ لاجپت رائے نے کہا تھا کہ مسلمان شمالی ہند کو اپنا قومی وطن بنا لیں اور پھر خطبہٗ الٰہ آباد سے چند روز پیشتر پروفیسر جی۔ آر۔ ابھیانکر نے برصغیر کو تین حصوں میں بانٹنے کا تصور پیش کیا۔ یعنی ریاستی ہند، مسلم ہند اور ہندو ہند۔ پس اگر ہندو تقسیم ہند کے متعلق سوچ سکتے ہیں، تو پھر اقبال کو ایسی تجویز پیش کرنے کا حق کیوں نہیں دیا جاتا۔ لالہ لاجپت رائے کے تصور تقسیم ہند کا ذکر اقبال نے بھی اپنے خط بنام نذیر نیازی محررۃ ۱۱؍جنوری ۱۹۳۱ء میں کیا ہے، جس میں اپنی تجویز کی وضاحت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''مجوّزہ اسلامی ریاست ایک نصب العین ہے۔ اس میں آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال آبادیوں کے تبادلے کا مدّت ہوئی لالہ لاجپت رائے نے ظاہر کیا تھا۔ اس ایک یا متعدد اسلامی ریاستوں میں جو شمال مغربی ہند میں اس اسکیم کے مطابق ہوں گی، ہندو اقلیت کے حقوق کا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ ''انقلاب'' نے کسی اور اداریے میں لکھا کہ اگر ہندو مسلمانوں کو نظر انداز کر کے محض اکثریت کے بل بوتے پر سوراج کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں تو پھر مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ایسے علاقوں میں جہاں اُن کی اکثریت ہے مسلم ریاست کے قیام کو اپنا نصب العین بنائیں۔ اسی فیصد مسلم اکثریتی علاقے میں مسلمانوں کو مسلم ریاست قائم کرنے کا حق جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) بھی دیتی ہے، کیونکہ وہ حقِ خود ارادیت کے اصول کی قائل ہے، ایک اور اداریے میں کہا گیا کہ اگر اقبال کی تجویز کے مطابق شمال مغربی ہند

کے مسلم اکثریتی علاقوں کا حقِ آزادی تسلیم کرلیا گیا تو سارے برِصغیر میں امن وسکون کی کیفیت طاری ہوسکتی ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو ہندو اور مسلمان آپس میں ایک نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائیں گے۔''

''انقلاب'' نے ایک طویل اداریے کے آخر میں اقبال کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے لکھا:

''خدا اس مبارک ہستی کو زندہ رکھے جس نے پراگ (الہ آباد کا پرانا ہندو نام) میں سب سے پہلی مرتبہ راہ گم کردہ اور قومیت و جمہوریت کے فریب کارانہ دعاوی سے مسحور ملّت کے لیے ہدایت کی حقیقی روشنی کا بندوبست کیا۔ خدا کو منظور ہوا تو یہ روشنی زندگی کی صحیح منزل مقصود تک اسلامیانِ ہند کی رفیق رہے گی''۔

''ہمدم''، لکھنؤ نے تجویز کی حمایت میں تحریر کیا:

''اقبال کا یہ مطالبہ نہایت حق بجانب ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند کے قیام کا موقع ملنا چاہیے اور اس کی بہترین تشکیل اس صورت سے ہوسکتی ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد سلطنت قائم کر دی جائے۔ حق یہ ہے کہ ہندو مسلم تنازعات کا یہ بہترین حل ہے اور اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمان متحد ہو کر اس کے لیے جدوجہد کریں اور اپنی قوتِ عمل کا مظاہرہ کر کے اس کو حاصل کر کے چھوڑیں''۔

مشہور محقق اور عاشقِ اقبال ڈاکٹر سید عبداللہ اس قرارداد کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ ''تصورِ پاکستان کے لیے ہم علّامہ اقبال کے ممنونِ احسان ہیں کہ اُنھوں نے یہ تصوّر الہ آباد کانفرنس میں اپنے خطبے کے دوران پیش فرمایا تھا۔ وہ شروع ہی سے برصغیر کی سیاسیات کے متعلق غور فرما رہے تھے، جیسا کہ بانگِ درا کے ابتدائی حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی ملک میں یکجا رہتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان ایاّم میں اُنھوں نے اپنی نظم ''ہندی ترانہ'' بھی لکھی (۱۹۰۴ء)۔ لیکن بعد میں جب برِصغیر کی سیاسیات کے متعلق ان کی معلومات زیادہ گہری ہوتی چلی گئیں اور اُنھیں اچھی طرح محسوس ہو گیا کہ مسلمان ایک ایسی تہذیب کے وارث ہیں، جو ہندو تہذیب سے بالکل مغائرت رکھتی ہے، اور پھر یہ کہ مسلمان ایک ملّت کی حیثیت سے جس طرح اپنے مستقبل کی تعریف کرنا چاہتے ہیں، وہ بھی ہندوانہ نظریوں کے بالکل خلاف ہیں، تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندو اور مسلمان

ایک ہی وطن میں یکجا نہیں رہ سکتے، بلکہ اُن کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ جغرافیائی حدود چاہییں، جن میں وہ اپنے اپنے تہذیبی افکار کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، جب یہ خیال علاّمہ کے ذہن میں اچھی طرح اپنی پوری معنویت کے ساتھ واضح ہو گیا تو اُنھوں نے وہ نظم لکھی جو بانگِ درا میں ''ترانۂ ملی'' (۱۹۱۰ء) کے عنوان سے ہے۔ ''ترانۂ ہندی'' اور ''ترانۂ ملی'' میں واضح تضاد موجود ہے، اور ان دونوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ پاکستان کے متعلق تصور کس طرح اُن کے ذہن میں پیدا ہوا۔ جب علاّمہ یورپ میں تشریف رکھتے تھے، اور عالمی نظریات کے مطالعے کا، انھیں پہلے کی نسبت بہتر موقع ملا، اور اسلامی ممالک کی حیثیت اور اہمیت بھی بہتر طور پر اُن کے ذہن میں جاگزیں ہوئی۔

اُن کا یہ شعر کہ:

نکل کے صحرا سے جس نے رُوما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے مَیں نے، وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

''ترانۂ ہندی'' کے مقابلے میں اس شعر کو رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے خیالات میں ایک واضح انقلاب رُونما ہو چکا تھا۔ اپنے انھی خیالات کی بنا پر، وہ برصغیر میں بھی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن ضروری سمجھتے تھے تا کہ مسلمانانِ برصغیر باقی اسلامی ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ تعاون کر کے اپنے ماضی کی طرح ایک شاندار مستقبل کے مالک بن سکیں۔ اپنے انھی خیالات کو لے کر الہ آباد کانفرنس کے خطبے میں انھوں نے یہ تصوّر پیش کیا کہ یہاں جن جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ان کو یکجا کر کے ایک علیحدہ وطن کی صورت دے دی جائے۔''

☆☆☆

دوسری گول میز کانفرنس اور سفرِ یورپ
(یکم ستمبر ۱۹۳۱ء تا ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۱ء)

برصغیر کے سیاسی منظر نامہ پر بہت تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے امکانات معدوم ہو رہے تھے۔ انگریز نے برِصغیر سے واپسی کا تقریباً ارادہ کر لیا تھا۔ تمام محنت اور توجّہ اس بات پہ ہو رہی تھی کہ یہاں سے انگریز کے انخلاء کے بعد برّصغیر کی وحدت کو برقرار رکھا جائے تو اُس کے لیے قابلِ عمل اور قابلِ قبول سکیم کیا ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں پہلی گول میز کانفرنس (جنوری ۱۹۳۱ء) لندن میں ہوئی۔ یہ کانفرنس بے نتیجہ رہی تھی۔ مگر اُس میں اقبال مدعُو نہیں تھے۔

ستمبر-اکتوبر ۱۹۳۱ء میں ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے وائسرائے نے جن مختلف مندوبین کو دعوت نامے ۴ر اگست ۱۹۳۱ء کو جاری کیے تھے۔ اُن میں اقبال بھی شامل تھے۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو لندن پہنچنا لازمی تھا تا کہ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کا آغاز ہو سکے۔

بیگم کے نام وصیّتی خط

انگلستان روانہ ہونے سے پیشتر اقبال نے ۲۶ر اگست ۱۹۳۱ء کو ایک خط سردار بیگم کے نام تحریر کر کے میاں امیر الدین کے حوالے کیا۔ اس سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ اقبال گھریلو معاملات اور بچوں سے متعلق کس قدر متفکّر رہتے تھے۔ یہ خط اقبال کی وفات کے بعد میاں امیر الدین کے ریکارڈ سے اُن کے پوتے اور منیرہ بیگم (بنتِ اقبال) کے فرزند یوسف صلاح الدین نے دریافت کیا اور اُن ہی کی تحویل میں ہے۔ اقبال اس خط میں لکھتے ہیں:

والدۂ جاوید کو بعد سلام علیک کے واضح ہو کہ چونکہ مَیں گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ولایت

جانے والا ہوں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اس واسطے یہ تحریر لکھتا ہوں کہ صورتِ حال سے تم کو آگاہی رہے، اگرچہ پہلے بھی تم کو کل حالات معلوم ہیں۔

(۱) عرصہ دو تین سال کا ہوا جب مَیں دردِ گردہ کی وجہ سے بیمار ہو گیا تھا اور زندگی کی امید منقطع ہو گئی تھی، لیکن خدا تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے صحت عطا کی۔ اس بیماری کے بعد میرے خیالات میں بڑا تغیّر ہوا اور چند روزہ زندگی کی حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔ صحت یابی کے بعد مَیں نے مبلغ دس ہزار روپیہ جاوید کے نام ہبہ کر کے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں اس کے نام جمع کرا دیا۔ اور چند ماہ ہوئے اس ہبہ میں پانچ ہزار کا اور اضافہ کر دیا۔ یعنی پانچ ہزار روپیہ مزید ہبہ کر کے اس کے نام اسی بنک میں جمع کرا دیا۔ اس رقم کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ مَیں نے منیرہ بیگم کے نام ہبہ کر کے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں جمع کرا دیا۔ کل پندرہ ہزار روپیہ جاوید کے نام اور پانچ ہزار منیرہ بیگم کے نام بنک مذکورہ میں جمع ہے۔ جب تک مَیں زندہ ہوں میں ان کا گارڈین ہوں۔ میری زندگی کے بعد تم ان دونوں کی گارڈین ہوگی۔ بنک کی رسیدیں تمھارے پاس ہیں۔

(۲) مندرجہ بالا رقوم کے علاوہ مَیں نے دس ہزار روپیہ تمھارے نام ہبہ کر دیا تھا۔ یہ روپیہ سنٹرل کواپریٹو بنک لاہور میں میرے اور تمھارے نام جمع ہے۔ لیکن میرا نام محض اس لیے درج کیا گیا تھا کہ اگر تمھارے لیے کوئی جائداد خرید کرنے کی ضرورت پڑے تو بنک سے اس کے نکالنے میں آسانی ہو۔ حقیقت میں یہ روپیہ تمھارا ہے اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس دس ہزار کی رقم کے علاوہ مبلغ پندرہ سو روپیہ بھی اسی بنک میں میرے اور تمھارے نام سے جمع ہے۔ یہ روپیہ تمھارے بعض زیورات کی فروخت سے حاصل ہوا تھا۔ یہ بھی تمھاری ملکیت ہے اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا نام اس رقم کے سلسلے میں محض مذکورہ بالا سہولت کی غرض سے درج کیا گیا تھا۔

(۳) مبلغ آٹھ ہزار روپیہ خالصتاً میرے نام سنٹرل کوآپریٹو بنک لاہور میں جمع ہے اس روپیہ میں سے کچھ روپیہ مَیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

(۴) مبلغ دو ہزار روپیہ کے قریب منشی طاہرالدین کے پاس ہے کچھ اور روپیہ آنے والا ہے۔ جس کو وہی وصول کریں گے۔ اس روپے میں سے انکم ٹیکس ادا کرنا ہے اور بعض اور اخراجات جو میری عدم موجودگی میں لاحق ہوں۔ مثلاً کرایہ کوٹھی اور ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ، اس کے علاوہ گھر کے اخراجات کے لیے کچھ روپیہ تمھارے پاس بھی موجود ہے۔

(۵) ''جاوید نامہ''مَیں نے چھپنے کے لیے دے دیا ہے۔ اور اس کے متعلق ضروری ہدایات منشی طاہرالدین اور چودھری محمد حسین صاحب کو دے دی ہیں۔ چونکہ یہ کتاب جاوید کے نام پر لکھی گئی ہے اس واسطے وہی اس کا مالک ہے۔ اس کی تمام آمدنی، اخراجات اشاعت وطباعت نکال کر اسی کی ملکیت ہے۔

(۶) مَیں نے زبانی کہا تھا کہ تمھارا حقِ مہر مَیں نے پندرہ ہزار روپیہ باندھ دیا ہے۔ وقتِ نکاح کوئی رقم مقرر نہ کی گئی تھی، لیکن اب مَیں اپنی مرضی سے تمھارا حق مہر مبلغ پندرہ ہزار مقرر کرتا ہوں۔ اور اس تحریر میں یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ تمھارا اطمینان ہو جائے۔ شرعاً یہ روپیہ مجھ پر قرض ہے اور تم اس رقم کو میری ہر قسم کی جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ سے وصول کر سکتی ہو۔ شرع شریف کی رو سے تم کو میری ہر قسم کی جائداد پر قابض اور متصرف رہنے کا حق ہے۔ جب تک مذکورہ بالا رقم تم کو وصول نہ ہو جائے۔

(۷) باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں تم بچوں کی تربیّت سے غافل نہ رہو گی۔ اور بحثیت اُن کی ماں ہونے کے جو فرائض تم پر عائد ہوتے ہیں، اُن کو ادا کرو گی۔

(محمد اقبال بیرسٹر لاہور ۲۶ر اگست ۱۹۳۱ء)۔

یہ خط سردار بیگم کو اقبال کی ناگہانی موت کی صورت میں دیا جانا تھا، لیکن چونکہ ایسی صورت پیدا نہ ہوئی، یہ خط میاں امیرالدین کے پرانے ریکارڈ میں پڑا رہا اور کسی کا خیال اس کی طرف نہ گیا۔

اقبال کا ارادہ تھا کہ سفرِ یورپ کے لیے یکم ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور سے روانہ ہو کر ۵ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو بمبئ پہنچیں گے۔ اسی سفر کے دوران میں وہ ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کرنے کے بھی آرزو مند تھے۔ مفتیِ اعظم فلسطین سیّد امین الحسینی نے انھیں دسمبر ۱۹۳۱ء میں بیت المقدس (یروشلم) میں منعقد ہونے والی مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لیے دعوت نامہ بھیج رکھا تھا۔ اسی طرح مارکونی، صدر اکادمی دانشواران روم کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ روم آ کر تقریر کریں۔ چند روز بعد انگلستان سے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ، صدر ادبی انجمن انڈیا سوسائٹی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اقبال انڈیا سوسائٹی کی نائب صدارت قبول کر لیں۔

لاہور سے روانگی

لاہور سے چلنے سے چند گھنٹے قبل اقبال کو بخار ہو گیا اس لیے ۵ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو روانگی ملتوی

کرنا پڑی۔ آخر کار وہ ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور سے بذریعہ فرنٹیئر میل روانہ ہوئے۔ علی بخش بمبئی تک اُن کے ساتھ رہا۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر انہیں رخصت کرنے کے لیے احباب جمع تھے۔ اقبال کچھ دیر سر عبداللہ ہارون سے ملے جو چھ بجے کراچی سے لاہور اسی وقت آئے تھے اور دس بجے شملہ جانے والے تھے، سیاسی مسائل پر بات چیت کی۔ پھر عبدالمجید سالک کی فرمائش پر "انقلاب" کے لیے یہ پیغام دیا:

"کوئی ایسا دستورِ اساسی جو مسلمانوں کے لیے اجتماعی حیثیت سے موت کا پیغام ہو، ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی آزادی ہندوستان کی قوموں کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ ہندوستان کی آب و ہوا میں کوئی سمجھوتا ہندی اقوام کے درمیان نہیں ہو سکا حالانکہ کم ازکم مسلمانوں نے اپنے بعض ضروری اقتصادی اور اجتماعی مقاصد کو نظر انداز کر کے گذشتہ دس سال میں اس کے لیے کوشش بھی کی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ انگلستان کی فضا اور برطانوی مدّبرین کا "جینیئس" شاید اس گتھی کو سلجھا سکے جس کو ہندوستانی مدّبرین نہیں سلجھا سکے۔ آخر میں مَیں اپنے ہندو بھائیوں اور خصوصاً ہندو اخبار نویسوں سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ۔

سخن دُرشت مگو در طریقِ یاری کوش
کہ صحبتِ من و تو در جہاں خدا ساز است

((اے ہم نشین) سخت بات نہ کہہ بلکہ دوستانہ طرزِ روش کی کوشش کر کیونکہ میری اور تیری صحبت اس جہان میں خدا کی بنائی ہوئی ہے۔)

دہلی آمد

۹ ستمبر ۱۹۳۱ء کو صبح ساڑھے سات بجے وہ دہلی پہنچے۔ اسٹیشن پر تقریباً تین ہزار افراد جمع تھے۔ بعض تو صبح چھ بجے سے منتظر کھڑے تھے۔ مولانا سید احمد بخاری امام جامع مسجد دہلی، مولانا مظہر الدین مدیر سہ روزہ "الامان"، حاجی محمد یوسف، سیکرٹری خلافت کمیٹی، نواب ابوالحسن خان اور سیّد نذیر نیازی کے علاوہ صوبائی مسلم کانفرنس دہلی، سنٹرل مسلم یوتھ لیگ، انجمن رفیق المسلمین، انجمن اتحاد و ترقی و انجمن تیموریہ کے ارکان اور محمد علی اسکول کے طلبہ و اساتذہ موجود تھے۔ اقبال کو متعدد سپاس نامے پیش کیے گئے۔ لیکن وقت کی قلّت کے سبب انھوں نے تمام سپاسناموں کو سننے سے معذوری کا اظہار کیا۔ فرمایا کہ دورانِ سفر خود پڑھ لیں گے۔ صرف مولانا

سیّد احمد بخاری امام جامع مسجد دہلی نے صوبائی مسلم کانفرنس کی طرف سے سپاسنامہ پڑھ کر سنایا جس پر اراکین کانفرنس کے دستخط تھے۔ سپاسنامے کے جواب میں اقبال نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے مَیں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے، جو میرے لیے ضروری مواد فراہم کرے۔ نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر مَیں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں، بلکہ میرے پاس حق وصداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن مجید) ہے جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔ گذشتہ دس سال سے ہم اپنے اقتصادی وسیاسی فوائد کو پس پشت ڈال کر کانگرس اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس میں ہم کو برابر ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ لہٰذا اگر اب لندن میں بھی فرقہ وارانہ اتحاد کی کوئی قابلِ اطمینان صورت نہ نکلی اور مکمل پراونشنل اٹانومی نہ دی گئی اور مرکزی حکومت میں ان کا کافی خیال نہ کیا گیا تو مسلمانانِ ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی قربان کرنا پڑے گی۔ (نعرہ اللہ اکبر) اور مجھے یقین ہے کہ اگر بنگال اور پنجاب کی اکثریت اور مسلمانوں کے دیگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو جو دستورِ اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا، مسلمانانِ ہند اس کے پرخچے اڑادیں گے۔ (نعرہ اللہ اکبر) سن رسیدہ نسل نے نوجوانوں کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کرنے کا کام جیسا چاہیے تھا ہرگز نہیں کیا، لہٰذا میں نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھیں اور اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو وہ اُن قربانیوں کے لیے تیار رہیں جو ہمیشہ سے زیادہ اُن کو آئندہ دینی ہوں گی''۔ (نعرہ اللہ اکبر)

بمبئی آمد اور مصروفیات

اقبال ۱۰ رستمبر ۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچے اور خلافت ہاؤس میں قیام کیا۔ اسی روز سہ پہر کے وقت عطیّہ فیضی نے اُن کے اعزاز میں ایوانِ رفعت کے وسیع لان میں چائے پارٹی کا اہتمام کیا، جس میں بمبئی کے اہلِ علم وفن بھی مدعو تھے۔ چائے سے فراغت کے بعد انہیں مہمانوں کے لیے کوئی پیغام کی فرمائش کی گئی۔ اقبال نے کھڑے ہو کر چھوٹی سی تقریر کی اور اپنا یہ شعر پڑھ کر بیٹھ گئے:

چناں بزی کہ اگر مرگ تُست مرگ دوام
خدا زکردۂ خود شرمسار تر گر دو!

(تم اتنے اچھے طریقے سے جیو کہ اگر تمھاری موت مرگِ دوام ہو تو خدا ایسا کرنے سے شرم سار ہو جائے۔)

لوگوں نے اصرار کیا کہ ترجمہ کیا جائے۔ اس پر انھوں نے وہیں شعر کا انگریزی ترجمہ تحریر کروا دیا کہ زندگی ایسی خوبصورتی سے گزارو کہ اگر موت ہی سب کا انجام ہے تو خدا کو تمھاری زندگی ختم کرنے پر بجائے خود شرمندگی اُٹھانی پڑے۔

ایوانِ رفعت پہنچنے سے پیشتر وہ اپنے دوست اور مُحبی سردار صلاح الدین سلجوقی، قونصل افغانستان مقیم بمبئی کے ہاں کھانے پر گئے تھے اور اُن کے اور مرزا طلعت یزدی کے ساتھ شعر و سخن کی پرُ لطف محفل میں شریک ہوئے تھے۔ بمبئی پہنچتے ہی سردار صلاح الدین سلجوقی، قونصل افغانستان مقیم بمبئی نے دعوت دی۔ اُن کے ہاں پُر لطف محفل رہی۔ سردار موصوف فارسی اور عربی ادبیات پر پورا عبور رکھتے تھے۔ عربی کی جدید شاعری سے بھی باخبر۔ فارسی میں خاقانی کے بڑے معترف۔ دینی علوم میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ ہرات کے قاضی رہ چکے تھے۔ ان کے دولت کدہ پر مرزا طلعت یزدی نے، جو بمبئی میں دس سال سے مقیم تھے، ایرانی لہجے میں اپنے اشعار سنائے۔

انگلستان روانگی سے چند گھنٹے قبل ''بمبئی کرانیکل'' کے نمائندہ خصوصی نے اُن کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو خاصا دلچسپ ہے۔ اقبال نے گفتگو کی ابتداء میں واضح کیا کہ وہ کسی فرقے یا قوم کے متعلق تعصّب نہیں رکھتے بلکہ صرف یہی چاہتے ہیں کہ ہندوستانی پرامن رہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر فرد کو اپنی تہذیب اور انفرادیت برقرار رکھنے کا موقع دیا جائے۔ انہیں سوال کیا گیا کہ پان اسلامزم سے متعلق ان کا تصوّر کیا ہے، جواب دیا کہ یہ اصطلاح ایک فرانسیسی صحافی کی اختراع ہے۔ اور اس نے جن معانی میں اسے استعمال کیا ہے، ایسا پان اسلامزم سوائے اس کے تخیل کے اور کہیں بھی موجود نہیں۔ فرانسیسی صحافی اس اصطلاح کے ذریعے ایک ایسا ہوّا کھڑا کرنا چاہتا تھا جو اس کے خیال کے مطابق دنیائے اسلام میں موجود تھا۔ یہ اصطلاح وضع کی گئی جیسے چینیوں یا جاپانیوں کے لیے خوف یا نفرت پیدا کرنے کی خاطر اصطلاح ''زرد خطرہ'' بنائی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اسلامی ممالک میں یورپی جارحیّت کو جائز قرار دیا جا سکے۔ بعد میں اس اصطلاح کو ایک قسم کی سازش کے طور پر ظاہر کیا گیا جو قسطنطنیہ میں تیار

کی جا رہی تھی یعنی یہ کہ مسلمانانِ عالم تمام مسلم ریاستوں کے اتحاد کا ایک ایسا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ جو یورپ کے خلاف ہوگا۔ بہر حال اس اصطلاح کے استعمال کا ایک اور طریقہ بھی ہے جو قرآنی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے پان اسلامزم کا کوئی سیاسی مقصد نہیں بلکہ اتحادِ انسانی کے لیے ایک معاشرتی تجربہ ہے۔ ان معانی میں پان اسلامزم سے مراد دراصل اتحادِ انسانی ہے اور اس کے لیے لفظ ''پان'' استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ اصطلاح اسلام بجائے خود کافی ہے۔ سوال کیا گیا کہ وہ برطانوی استعمار کو مذہبی سمجھتے ہیں۔ جواب دیا کہ تمام ریاستیں جو استحصال کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، غیر مذہبی ہیں۔ سوال کیا گیا سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک خط میں انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ بالشوزم میں اگر خدا کے تصوّر کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ اسلام ہوگا۔ کیا وہ اب بھی اس نظریے کے حامی ہیں۔ جواب دیا کہ اسلام ایک سوشلسٹ مذہب ہے۔ قرآنِ مجید انفرادی ملکیت اور مکمل اشتراکیت کے بین بین نظام قائم کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کی ذاتی رائے میں جدید انسان کا ضمیر ایسے نظاموں میں جنہیں امپریلزم اور بالشوزم کہا جاتا ہے، بنیادی تبدیلیاں لائے گا۔ علاقائی سلطنتوں کے دن اب گزر چکے ہیں۔ اسی طرح بالشوزم بھی مکمل اشتراکیت کی ہیئت میں زیرِ ترمیم ہے۔ سوال کیا گیا۔ کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاعر اقبال پر سیاستدان اقبال سبقت لے گیا، اس لیے اس کا روّیہ اس کی شاعری کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں رہا۔ جواب دیا گیا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے تصورِ قومیّت میں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ کٹر نیشنلسٹ تھے، لیکن اب نہیں رہے۔ یہ تبدیلی پختگیِ فکر کے سبب آئی۔ سوال کیا گیا کہ کیا وہ شاہی نظام کے حق میں ہیں۔ جواب دیا کہ وہ شاہی نظام قائم رکھنے کے حق میں نہیں ہیں، مگر جمہوریت کے بھی دل سے قائل نہیں۔ وہ جمہوریت کو محض اس لیے برداشت کرتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ سوال کیا گیا کہ ان کے خیال میں سیاست دان بننے کی بجائے اگر وہ شاعر ہی رہتے تو ملک کے لیے زیادہ فائدہ مند نہ ہوتے۔ جواب دیا کہ وہ اب بھی ادبیات میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں اور ان کا بیشتر وقت اسی میں صرف ہوتا ہے۔ سوال کیا گیا کہ وہ نیشنلزم کے مخالف کیوں ہیں۔ جواب دیا گیا کہ وہ اسے اسلام کے ارفع اصولوں کے خلاف سمجھتے ہیں، کیونکہ اسلام نے دنیا میں پہلی بار نسلِ انسانی کو اتحاد اور روحانی ہم آہنگی کا سبق دیا تھا۔ سوال کیا

گیا کہ عرب ممالک کے وفاق کے وجود میں آنے کے کیا امکانات ہیں۔ جواب دیا کہ وہ عرب ریاستوں کے وفاق پر یقین رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس کی راہ میں بعض بہت بڑی مشکلات حائل ہیں۔ لہٰذا وہ مستقبل میں ایسے وفاق کے وجود میں آنے کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ فرمایا کہ ان کی نظر میں موجودہ زمانے میں اسلام ہی ایک مثبت نظامِ حیات ہے، جسے مسلمان غور و فکر کے بعد عہدِ حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق نافذ کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہندی مسلمان نے مستقبل میں اسلام کی سربلندی کے لیے ایک نہایت اہم کردار ادا کرنا ہے پس اسلام کے احیاء کا انحصار زیادہ تر نئی نسل پر ہے، جس نے اسلام کے بنیادی اصولوں پر قائم رہ کر زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کی ہے۔ علماء کو چاہیے کہ ان سیاسی اور معاشی مسائل کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کریں جو اسلام کو درپیش ہیں۔ کیونکہ ماضی کے متعلق ان کا علم مسلمانوں کی تعمیرِ نو کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ سوال کیا گیا کہ کیا وہ اسلامی ممالک کی سیّاحت کریں گے؟ جواب دیا کہ انگلستان سے واپسی پر مصر جائیں گے اور جتنے مسلم ممالک کی سیاحت ممکن ہو سکی کریں گے تاکہ ان کے حالات کا مطالعہ کر کے ایک کتاب بعنوان ''جدید دنیائے اسلام'' تحریر کی جا سکے۔

بمبئی سے روانگی اور بحری سفر کی رُوداد

۱۲ ستمبر کو ایک بجے کے قریب بمبئی سے ''ملوجا'' جہاز میں انگلستان کے لیے روانہ ہوئے۔ ۱۶ ستمبر کی شام کو عدن پہنچے۔ عدن اسی سرزمین کا ٹکڑا ہے جس کی نسبت حالی مرحوم فرما گئے ہیں۔

عرب کچھ نہ تھا اک جزیرہ نما تھا

۲۱ ستمبر ۱۹۳۱ء کو اقبال نے حکیم طاہر الدین کے نام ''ملوجا'' جہاز سے ایک خط تحریر کیا جس میں سفر کے تمام حالات بڑی وضاحت سے بیان کیے۔ فرمایا: میرا مقصد ساحل پر جانے کا نہ تھا، مگر ہمارے شہر کے ایک نوجوان شیخ عبداللہ نامی یہاں وکالت کرتے ہیں۔ وہ جہاز پر آئے اور اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ کشتی پر سوار ہو کر ساحل پر اترے اور وہاں سے موٹر پر سوار ہو کر شیخ صاحب موصوف کے مکان پر پہنچے۔ وہاں مرغ پلاؤ، کباب، قورمہ سب کچھ حاضر تھا۔ کھانے کے بعد یمن کی سیاہ تلخ و خوشگوار کافی کا دور چلا۔ آغا فکری ایرانی اور ایک اور ایرانی

سوداگر سے ملاقات ہوئی۔ آغا فکری نہایت ہوشیار اور مستعد نوجوان ہیں۔ یمنی کافی کی تجارت کرتے ہیں۔ بے انتہالسّان ہیں۔ رخصت کے وقت انھوں نے مجھے ایک دانہ عقیقِ یمنی کا بطور یادگار کے عنایت فرمایا۔ ۲۲ سال ہوئے، جب میں نے عدن دیکھا تھا، اس وقت کچھ نہ تھا۔ اب ایک بارونق شہر ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ حضر موت کے عرب یہاں ساہوکار ہیں۔ پنجابی بھی بہت سے ہیں۔ خاص کر سندھ کے دکاندار۔ مسلمانوں میں صومالی قوم نہایت ہوشیار اور محنتی ہے۔ شیخ عبداللہ سے معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض آٹھ آٹھ دس دس زبانیں بلاتکلّف بولتے ہیں۔ عدن میں عرب نوجوانوں کا ایک کلب بھی ہے، مگر چونکہ رات کا وقت تھا۔ کلب مذکور کے ممبروں سے ملاقات نہ ہوسکی۔ غرضیکہ رات کے ساڑھے دس بجے شیخ عبداللہ کے مکان سے رخصت ہوکر تقریباً گیارہ بجے اپنے جہاز پر پہنچے۔ جہاز ساڑھے گیارہ بجے رات روانہ ہوا۔

۲۰ر ستمبر کو تقریباً ۳ بجے شب پورٹ سعید قیام ہوا۔ یہ جگہ بھی بے انتہا ترقی کرگئی ہے۔ مَیں تو سوچکا تھا مگر ایک مصری ڈاکٹر سلیمان نے آجگایا۔ مَیں اُٹھا اور اُن سے ملاقات کی۔ اتنے میں اور مصری نوجوان جو وہاں کے شبان المسلمین کے ممبر تھے، ملاقات کو آئے۔ ان نوجوانوں سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ ایک مصری کرنل کی لڑکی بھی ملنے کے لیے آئی۔ یہ ہمارے جہاز میں انگلستان جارہی ہے تاکہ علمِ نباتات کے مطالعے کی تکمیل کرے۔ پہلے چار برس وہاں رہ آئی ہے۔ انگریزی خوب بولتی ہے۔ عام طور پر اہلِ مصر فرانسیسی لہجے میں انگریزی بولتے ہیں۔ اس لڑکی کا لہجہ بالکل انگریزی تھا۔ لطفی بے نے، جو قاہرہ کے ایک مشہور بیرسٹر ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان کی زبانی سلام بھیجا اور واپسی پر قاہرہ آنے کی دعوت دی۔ ''رنپورہ'' جہاز پر جس میں میرا سفر پہلے قرار پایا تھا۔ لطفی بے تشریف لائے تھے۔ مگر افسوس کہ مَیں حالات کی وجہ سے سفر نہ کر سکا۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ مصر کے مسلمان عام طور پر یہ سمجھتے ہیں۔ کہ مسلمانانِ ہند ہندوستان کی آزادی کی راہ میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔ یہ پراپیگنڈا دیگر ممالک میں بھی کیا گیا ہے۔ پورٹ سعید پر تقریباً ہر مسلمان نوجوان نے مجھ سے سوال کیا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کی آنکھوں سے رفتہ رفتہ حجاب اٹھ رہا ہے۔ مَیں نے ان کو ایک طویل لیکچر دیا اور بتایا کہ ہندوستان کا پولٹیکل پرابلم کس طرح مسلمانانِ ہند پر مؤثر ہوتا ہے۔ میری گفتگو سننے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ تقریر کے بعض حصے

انھوں نے نوٹ بھی کر لیے تھے۔ جہاز تقریباً ساڑھے چھ بجے صبح روانہ ہوا اور مصری جوان صبح تک میرے کیبن میں بیٹھے رہے۔ واپسی پر انھوں نے ساحل سے مصری سگرٹوں کے دوڈبے ہدیۃً ارسال کیے۔ بمبئی سے لے کر اس وقت تک جہاز ''ملوجا'' بحرِ روم کی موجوں کو چیرتا ہوا چل رہا ہے۔ سمندر بالکل خاموش ہے۔ طوفان کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار رہا۔ البتہ بحرِ احمر میں گرمی تھی۔ یہ سمندر عصائے کلیم کا ضرب خوردہ ہے، گرم مزاج کیوں نہ ہو، چاروں طرف جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے، سمندر ہے، گویا قدرتِ الٰہی نے آسمان کے نیلگوں خیمے کو الٹ کر زمین پر بچھا دیا ہے۔ سفر کی مختصر روئیداد تو مَیں نے لکھ دی ہے۔ سویز کنال کے متعلق لکھنا بھول گیا۔ شاید ۱۹/ستمبر کو ہم سویز کینال میں داخل ہوئے۔ فراعنۂ مصر، قدیم ایرانیوں، مسلمانوں اور اہلِ فرنگ نے اپنے اپنے عروج وقوت کے زمانے میں اس نہر کے مٹے ہوئے نقوش کو ابھار کر اس سے فائدہ اٹھایا، لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس حیرت انگیز کینال کی اہمیّت یعنی تجارتی اہمیت کا خاتمہ قریب ہے۔ سیاسی اعتبار سے صلح وجنگ کے زمانے میں ہر قوم کے جہاز اس میں سے گزر سکتے ہیں۔

سویز کینال کے بیشتر حصص انگریزی تصّرف میں ہیں اور یہ غالباً اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی عیش پرستی کا نتیجہ ہے، کیونکہ اس نے اپنے تمام حصص انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیے تھے۔ قریباً ڈھائی کروڑ پونڈ کی لاگت سے ایشیا اور یورپ کے سمندروں کو ملانے والی یہ آبی گزرگاہ تیار ہوئی تھی۔ لیکن اب جیسا کہ مَیں نے اوپر لکھا ہے، شاید اس کی وہ اہمیت نہ رہے، جو اسے پہلے حاصل تھی۔ پرواز کی وسعت وترقی اور وسط ایشیا اور وسط یورپ میں ریلوے کی تعمیر سے دنیا کے دو بڑے حصوں میں جدید تجارتی رستوں کا کھل جانا، ایک نئی مگر خشک کینال کو معرضِ وجود میں لانے والا ہے۔ جس سے تجارتی اور سیاسی دنیا میں بھی ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگا۔ اگر آئندہ بیس پچیس سال میں ایسا ہو گیا تو طاقتور کمزور اور کمزور طاقت ور ہو جائیں گے۔ جہاز کی روزمرّہ کی زندگی کی داستان نہایت مختصر ہے۔ مَیں اپنی قدیم عادت کے مطابق آفتاب نکلنے سے پہلے ہی تلاوت سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ اس کے بعد دیگر حوائج سے فراغت پاتے پاتے ناشتے کا وقت آ جاتا ہے۔ ناشتہ کے بعد عرشۂ جہاز پر ہم سفروں سے گفتگو گول میز کانفرنس پر جس کی خبریں لاسلکی کے ذریعے سے ہر روز جہاز پر پہنچ جاتی ہیں۔ بحث ومباحثہ یا گزشتہ سال کی

رپورٹوں کا مطالعہ۔ ہاں کبھی شعر و شاعری بھی ہو جاتی ہے۔ سیّد علی امام کو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ اُن کے والد ماجد مولانا نواب امداد امام ادبیاتِ اردو میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے۔ جہاز پر مَیں نے گوشت کھانا بالکل ترک کر دیا ہے۔ وطن میں بھی کم کھاتا تھا۔ مگر یہاں تو صرف سبزی، ترکاری، مچھلی اور انڈے پر گزران ہے۔ ایک تو گوشت کی طرف رغبت بہت کم ہے، دوسرے ذبیحہ بھی مشتبہ ہے، البتہ غیر مشتبہ ذبیحہ بھی کبھی کبھی مل جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ سر علی امام کی بیگم صاحبہ، کہ نیک نفسی اور شرافت کا مجسّمہ ہیں۔ اپنے شوہر کے ہمراہ ہیں۔ ذبیحہ کے متعلق خاص طور پر محتاط ہیں۔ اپنا باورچی ساتھ لائی ہیں۔ اُن کی عنایت سے غیر مشتبہ ذبیحہ اور مغلئی کھانا قریباً ہر روز ہماری میز تک پہنچ جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں میرا حصہّ بالعموم سبزی اور چاول تک محدود رہتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ میں سب کچھ لکھ گیا مگر ہم سفروں کے متعلق اب تک خاموش ہوں۔ ہمارے جہاز میں کچھ زیادہ مسافر نہیں۔ گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلمان نمائندے شاید سات، آٹھ ہیں۔ راجہ نرندر ناتھ صاحب بھی اسی جہاز پر ہیں، چار مسلمان نمائندے ہیں اور چاروں ''مغرب زدہ''۔ مغرب زدہ مسلمان کی اصطلاح جو شاید ''معارف'' نے وضع کی تھی، نہایت پُر لطف ہے۔ لیکن مسلمانوں کے اس مغرب زدہ قافلے کی کیفیّت یہ ہے کہ اس میں دو حافظِ قرآن ہیں، یعنی نواب سعید احمد صاحب چھتاری اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین، مقدم الذکر ہر روز ورد کرتے ہیں اور سنا ہے کہ ہر سال تراویح بھی پڑھاتے ہیں۔

سیّد علی امام صاحب کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے۔ میں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ میل وفرنگ کا حساب کر کے کہنے لگے: دیکھو بھائی اقبال اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور پر اُن کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی۔ اُن کی آنکھ نمناک ہوگئی اور بے اختیار ہو کر بولے **بلغ سلامی روضة فیھا النبی المحترم**۔ اُن کے قلب کی اس کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ باقی رہا مَیں۔ مغرب زدہ بھی ہوں اور مشرق زدہ بھی۔ البتہ مشرقی ضرب میرے لیے زیادہ کاری ثابت ہوئی۔ باقی ہم سفروں میں مسٹر جسٹس سہروردی، شیخ مشیر حسین قدوائی اور اودھ کے دو نوجوان تعلقدار ہیں۔ قدوائی صاحب نہایت پُر جوش پان

اسلامسٹ ہیں۔ تبلیغی فرائض سے کبھی غافل نہیں رہتے اور اودھ کے دو تعلقداروں میں سے ایک عربی خوب بولتے ہیں۔ دوسرے سمجھ لیتے ہیں مگر بول نہیں سکتے۔ ان دونوں نوجوانوں کے والد مدتوں کربلائے معلّٰی میں مقیم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ہے اس مغرب زدہ قافلے کی مختصر کیفیت۔

پورٹ سعید میں چند گھنٹے قیام کے دوران میں حکیم محمد صدیق ناڑو نے رائٹر کے نمائندے کی حیثیّت سے اقبال سے ملاقات کی۔ انھوں نے مصری نوجوانوں کی موجودگی میں فرمایا:

''ہندوؤں کو فکر لگی رہتی ہے کہ مسلمان افغان، بلوچ اور سرحد کے مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اگر مصر آزاد ہو جائے تو مصری اپنا ملک ترکوں کو اس وجہ سے حوالے کر دیں گے کہ ترک مسلمان ہیں؟ نیز کانگرس کا عدم تشدّد محض انگریزی سنگینوں کے سامنے ہے۔ ورنہ مرزا پور، کانپور اور سری نگر وغیرہ کے حالات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تشدّد ہے۔ مصری لوگوں کو شبہ ہے کہ ہندی مسلمان آزادی کے راستے میں کانٹا ہیں۔ اس میں ذرا صداقت نہیں۔ اگر مصری اصحاب کے دلوں میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے تو اس لیے کہ ان اصحاب نے ہندوستان کی سیاست سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مصری اخبارات کے مندوبین ہندوستان آ کر مطالعہ کریں۔ ہندوستان مَیں مصری مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مصری مسلمانوں نے قرآن، اللہ اور اسلام کو خیر باد کہہ دیا۔ حالانکہ یہ ایک شرارت ہے۔''

لندن آمد اور مصروفیات

اقبال ۲۷ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو لندن پہنچ گئے۔ اور جاوید کے نام تار بھیجا۔ مَیں بخیریت لندن پہنچ گیا ہوں۔ ''جاوید نامہ'' چھپوانے میں عجلت سے کام لیا جائے۔ لندن میں اُن کا قیام اے سینٹ جیمز کورٹ بکنگھم گیٹ ایس ڈبلیو نمبر ا میں رہا۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو غلام رسول مہر بھی اُن سے آ ملے۔ گول میز کانفرنس کے اجلاس سینٹ جیمز پیلس میں ہوتے تھے۔ جو قریب ہی تھا۔ اقبال تقریباً تیئس (۲۳) سال بعد یورپ آئے تھے۔ اور اس دوران میں مغربی دنیا میں خاصا تغیر آ چکا تھا۔ یورپ میں بالخصوص اٹلی اور جرمنی نئی قوتوں کی صورت میں ابھر رہے تھے۔ چین میں انقلاب کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور جمعیتِ اقوام ایک قطعی غیر مؤثر ادارہ بن کر رہ گئی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جمعیّتِ اقوام اس غرض سے وجود میں لائی گئی تھی کہ اقوامِ عالم کے قضیوں کا فیصلہ کرے۔ اِن میں مفاہمت اور امن کی فضا پیدا کرے اور مستقبل میں جنگوں کو روکے۔ اس کا پہلا اجلاس جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ امریکہ اس کا رکن بننے پر رضامند نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ جمعیّتِ اقوام نے نوآبادیاتی قوتوں کی ایک ایسی کلب کی صورت اختیار کر لی جو مغلوب اقوام کے استحصال کو جاری رکھنے کے لیے استعمال کی جانے لگی۔ علاّمہ نے اس سے متعلق ''پیامِ مشرق'' میں کیا خوبصورت بات کی ہے:

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن
دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

(تاکہ اس دنیا سے جنگ کی رِیت اُٹھ جائے، جہاں کا دکھ درد رکھنے والوں نے نئی بنیاد ڈالی ہے، مَیں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ کچھ کفن چوروں نے قبروں کو آپس میں بانٹنے کے لیے ایک انجمن بنالی ہے۔)

۱۹۳۰ء میں عالمی معاشی بحران کے سبب امریکہ اور یورپ کی اقوام اپنے اپنے معاشی مسائل سلجھانے میں مصروف ہوگئیں اور جمعیتِ اقوام میں بین الاقوامی مسائل کے حل کی طرف توجہ دینے والا کوئی نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمعیتِ اقوام جنگوں کی روک تھام کرنے میں ناکام ہوگئی۔ ۱۹۳۱ء میں مشرق کی اہم ترین صنعتی طاقت جاپان نے مانچوریہ پر حملہ کر دیا۔ اور جب چین نے مداخلت کی استدعا کی تو جمعیت اقوام کچھ نہ کرسکی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ایبے سینیا پر قبضہ جمالیا تو تب بھی جمعیتِ اقوام بیکار ثابت ہوئی۔ بالآخر ۱۹۳۹ء میں جرمنی اور جاپان کے ہاتھوں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا، لیکن اس سے قبل جمعیت اقوام نزع کے عالم میں پہنچ چکی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر مسولینی نے اٹلی میں فاشسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی اور رفتہ رفتہ اس کے قائدِاعلیٰ کے طور پر اس نے پارلیمانی جمہوریت کو کالعدم قرار دے کر اقتدار خود سنبھال لیا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ایک فاتح کی طرح روم میں مارچ کرتا ہوا داخل ہوا اور اٹلی کا وزیراعظم بن گیا۔ ۱۹۲۵ء میں اس نے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور اٹھارہ برس تک اٹلی پر

ایک آمر کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے نو آبادیاتی طاقتوں کی نقل کرتے ہوئے اٹلی کے لیے ایک ایمپائر تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس مقصد کی تکمیل کی خاطر کمزور ممالک پر غاصبانہ قبضے کا عمل شروع ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں البانیہ پر قبضہ ہوا اور ٹیونس، مالٹا اور کارسیکا پر اٹلی کی حکمرانی کے حق میں دعویٰ کیا گیا۔ بالآخر ۱۹۳۹ء ہی میں مسولینی' جرمنی کے آمر ہٹلر سے معاہدہ کر کے دوسری جنگِ عظیم میں کود پڑا۔

ہٹلر کے دماغ میں اس خیال نے کہ جرمن قوم دنیا کی تمام اقوام میں غالب قوم کی حیثیت سے افضلیّت کی حامل ہے، ایک خبط کی صورت اختیار کر لی۔ اس نے جرمنی میں نیشنل ، سوشلسٹ جرمن ورکرز یا نازی پارٹی قائم کر کے پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، مگر گرفتار ہوا۔ جیل سے رہائی کے بعد اس نے نازی پارٹی میں نئی روح پھونکی۔ ۱۹۳۲ء تک نازی پارٹی جرمنی میں سب سے زیادہ طاقتور پارٹی بن چکی تھی۔ نازی پارٹی کی مضبوطی کے سبب ہٹلر ۳۰ر جنوری ۱۹۳۳ء کو جرمنی کا چانسلر مقرر ہوا۔ چانسلر بنتے ہی اس نے جرمن ری پبلک کا خاتمہ کر دیا اور اپنے سیاسی مخالفین کو یا تو جیلوں میں ٹھونس دیا یا قتل کروا دیا۔ ہٹلر نے بارہ سال تک جرمنی میں ایک آمر کی حیثیت سے حکومت کی۔ اس دوران میں اس نے فیکٹریوں میں جنگی ساز و سامان کی پیداوار پر زور دے کر جرمن افواج کی تشکیلِ نو کی اور رفتہ رفتہ جرمنی کو ایک بے مثال عسکری قوت بنا دیا۔ اس مرحلے پر یورپی اقوام جنگ کی خواہشمند نہ تھیں، اس لیے ۱۹۳۶ء میں جرمنی نے جب رائین لینڈ پر قبضہ کر لیا تو فرانس خاموش رہا۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں جرمن فوجیں آسٹریا میں داخل ہو گئیں اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سوڈیٹن لینڈ اور پھر چیکو سلواکیہ پر قبضہ کر لیا گیا۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر حملہ ہوا۔ بالآخر ہٹلر کے ہاتھوں یورپ میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا، جو آج تک کی انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ ہولناک جنگ قرار دی گئی ہے۔ اسی دور میں چین میں مأوزے تنگ کی زیرِ قیادت چینی کمیونسٹوں کی طاقت میں اضافہ ہوا۔ چین ۱۹۱۲ء سے چیانگ کائی شیک کی کاؤمن ٹینگ نیشنلسٹ پارٹی کے زیرِ اثر ری پبلک بن چکا تھا۔ چیانگ کائی شیک کی افواج نے نان کنگ میں اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں چیانگ کائی شیک اور اس کی افواج نے چینی کمیونسٹوں کو پیچھے دھکیلا اور وہ پہاڑوں کی طرف

بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

ماؤزے تنگ نے منتشر چینی کمیونسٹوں کو اکٹھا کیا اور پھر اس کی قیادت میں چینی کمیونسٹوں کے دَل کے دَل پہاڑوں کے نہایت دشوار گزار اور انتہائی خطرناک رستوں سے گزرتے ہوئے شمال مغربی چین کے علاقے میں جا پہنچے۔ ماؤزے تنگ کی زیرِ قیادت لاکھوں چینی کمیونسٹوں کے اس طویل سفر یا معجزے کو ''لانگ مارچ'' کا نام دیا گیا۔ اسی لانگ مارچ کی بدولت ماؤزے تنگ چینیوں کے ایک عظیم قائد کی حیثیت سے ابھرا اور دنیا توقع کرنے لگی کہ عنقریب سرمایہ داری کے خلاف ایک اور جنگ ہونے والی ہے یا پرانے چین کی کوکھ سے ایک نیا چین جنم لینے والا ہے (آج کے چین کو دیکھتے ہوئے یہ خواب حقیقت کا رُوپ دھار گیا ہے)۔

اقبال کی دور بین نگاہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ نظامِ عالم کسی نئی تشکیل کا محتاج ہے، مگر اس جدید تشکیل میں اسلام نے کیا کردار ادا کرنا ہے؟ یہ سوال ان کے ذہن میں بار بار ابھرتا تھا۔ اور غالباً اسی سوال کے جواب کی خاطر انھوں نے چند سال بعد اپنے ایک خط محرّرہ ۱۵/جنوری ۱۹۳۴ء بنام سید سلیمان ندوی میں تحریر کیا:

''دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب وتمدّن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالتِ نزع میں ہے۔ غرض کہ نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہوسکتا ہے''۔

تئیس سال بعد یورپ کے سفر نے کئی پرانی یادیں بھی تازہ کر دی تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں جب اقبال واپس لاہور آئے تو شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ پہلی بیوی سے کشیدگی کی ناگوار صورتِ حال، والد اور بھائی کی مفاہمت کے لیے کوششوں کے باوجود، بدستور قائم تھی۔ مالی مشکلات یا فراہمیٔ روزگار کا مسئلہ بھی تھا۔ سو ازدواجی بے سکونی اور مالی مشکلات کے سبب اضطراب کی اس کیفیت میں ہندوستان میں تو عطیّہ فیضی جیسی حاضر دماغ خاتون نے اپنی ہمدردانہ توجہ کے ذریعے انہیں جذباتی سہارا فراہم کیا لیکن اس دور میں ان کی خط وکتابت جرمنی میں ایماویگے ناست سے بھی جاری تھی جو بعد میں منقطع ہوگئی۔ (غالباً پہلی جنگ عظیم کے

حالات کی وجہ سے نہ صرف ڈاک کا نظام درہم برہم ہوا بلکہ ایماء ویگے ناست بھی ملازمت کے سلسلہ میں رہائش بدلتی رہیں) ۱۹۳۱ء میں لندن پہنچنے پر اقبال نے اپنے کسی پرانے جرمن دوست مسٹر مٹز وتھ سے ایما ویگے ناست کا پتہ معلوم کیا اور انہیں اپنے ایک خط مورّخہ ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۱ء میں تحریر کیا:

''براہ کرم مجھے خط لکھیے اور ان سارے برسوں کے دوران میں اپنی مصروفیات اور حالات سے مطلع کیجیے۔ مجھے آپ کا جواب پا کر مسرت ہوگی۔ فی الحال ہمیں کافی عرصہ لندن میں رکنا پڑے گا اور جب لندن گول میز کانفرنس ختم ہو جائے گی۔ تو اس کے بعد میرا ارادہ برلن کے رستے روم جانے کا ہے۔ جہاں مجھے کچھ روز ٹھہرنے اور چند پرانے دوستوں سے ملاقات کرنے کا موقع ملے گا۔ اتنے سال کے بعد آپ سے مل کر مجھے بے اندازہ خوشی ہوگی۔ مجھے اطلاع دیجیے کہ کیا ابھی کچھ دیر آپ ہائیڈل برگ ہی میں قیام رکھیں گی''۔

ایما ویگے ناست کا جواب آنے پر انہیں اپنے خط مورخہ ۲۰/اکتوبر ۱۹۳۱ء میں تحریر کیا:

''مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرّت ہوئی کہ کئی مصائب کا سامنا کرنے کے باوجود آپ اپنی زندگی خندہ پیشانی سے بسر کر رہی ہیں۔ مَیں ہائیڈل برگ میں اُن ایّام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب آپ نے مجھے گوئٹے کا فاؤسٹ پڑھایا تھا۔ اور ہر طرح سے میری امداد کی تھی۔ وہ واقعی بڑے خوشگوار دن تھے۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے وقت پر اختیار حاصل نہیں۔ اس لیے مَیں پوری کوشش کروں گا کہ ہائیڈل برگ پہنچوں اور آپ کو ایک بار پھر اسی جگہ ملوں۔ مجھے دریائے نیکر اب تک یاد ہے جس کے کنارے پر ہم اکثر ٹہلا کرتے تھے، لیکن مَیں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال ہے مَیں کچھ مدت تک آپ کو بتا سکوں گا۔ کہ روم جاتے ہوئے جرمنی آنا میرے لیے ممکن ہے یا نہیں۔ مجھے روم سے دعوت نامہ موصول ہوا ہے اور مَیں ہندوستان جانے سے بیشتر وہاں پہنچنے کا خواہشمند ہوں۔ میرے لیے یہ بتا دینا ضروری نہیں کہ میرے دل میں آپ سے ملنے اور ان بیتے ہوئے خوشگوار ایّام کی یاد کو تازہ کرنے کی کس قدر تمنا ہے، جو افسوس ہے ہمیشہ کے لیے گزر گئے''۔ لیکن اقبال اپنے پروگرام میں تبدیلی کے سبب ہائیڈل برگ نہ جا سکے۔ چنانچہ انھوں نے ایما ویگے ناست کو اپنے خط ۱۹/نومبر ۱۹۳۱ء میں اطلاع دی:

''میں ہائیڈل برگ میں آپ سے ملنے کے لیے چشم براہ تھا، لیکن نہایت افسوس سے بتانا چاہتا ہوں کہ میرے پروگرام میں اچانک ردّو بدل کی مجبوری کے سبب اب میرے لیے جرمنی میں سے گزر کر جانا ممکن نہ ہو سکے گا۔ بلکہ سیدھا روم پہنچنا پڑے گا، جہاں سائنیور مارکونی نے مجھے مدعو

کر رکھا ہے اور وہاں سے ۷؍دسمبر کو بین الاقوامی مسلم کانفرنس میں شرکت کے لیے یروشلم جاؤں گا۔ مجھے زندگی میں آپ سے ایک بار پھر مل کر اور پرانی وابستگیوں کی یاد تازہ کر کے بے حد مسرّت ہوتی، مگر بدقسمتی سے فی الحال ایسا ممکن نہیں۔ بہرحال امکان ہے کہ مَیں اگلے سال پھر یورپ آؤں گا۔ اگر ایسا ہوسکا تو مَیں ہائیڈل برگ میں ضرور آپ سے ملنے کے لیے آؤں گا''۔

اقبال لندن میں دوسری گول میز کانفرنس کے لیے گئے تھے، لیکن وہاں پہنچتے ہی مرجع علم و ادب بھی بن گئے۔ سو انگلستان میں ان کے مشاغل کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ان کی مصروفیات اور علم و ادب کی محفلوں یا ان کے اعزاز میں دی گئی دعوتوں میں اُن کی شمولیّت۔

گول میز کانفرنس کی رُوداد

جہاں تک دوسری گول میز کانفرنس کا تعلق ہے، اقبال چونکہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب برقرار رکھنے کے حامی تھے، اس لیے زیادہ تر اقلیتی سب کمیٹی کی کارروائیوں میں حصّہ لیتے رہے۔ اس سب کمیٹی کا پہلا اجلاس ۲۸؍ستمبر ۱۹۳۱ء کو ہوا۔ اجلاس میں مہاتما گاندھی کا اصرار تھا کہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر انصاری کو بلوایا جائے اور اگر انصاری نے مسلم مطالبات کی حمایت نہ کی تو اس کا ساتھ دیں گے۔ مسلم نمائندوں کا موقف یہ تھا کہ مہاتما گاندھی اگر چاہیں تو ڈاکٹر انصاری کو اپنے طور پر بلا لیں، جو انہیں قابلِ قبول نہ تھا۔ لہٰذا اس اعتبار سے پہلا اجلاس بے فائدہ رہا اور اسے دو دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا تاکہ مختلف فرقوں کے نمائندے آپس میں غیر رسمی بات چیت کر کے معاملہ طے کر سکیں۔ ۳۰؍ستمبر کو اقلیتی سب کمیٹی کا دوسرا اجلاس ہوا، لیکن گاندھی کی تجویز پر مزید گفت و شنید کی خاطر وہ بھی آٹھ دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اس وقفے میں پرائیویٹ طور پر مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں یا دیگر فرقوں کے مابین مصالحت کی بات چیت ہوتی رہی، مگر ایسی تمام کوششیں بارآور ثابت نہ ہوئیں۔ بالآخر ۸؍اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاس میں مہاتما گاندھی نے افسوس کا اظہار کیا مصالحتی گفتگو ناکام رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ تجویز پیش کی گئی کہ اقلیتی سب کمیٹی کو غیر معین عرصے کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ بعد ازاں سر محمد شفیع نے اپنی تقریر میں مہاتما گاندھی کی تجویز کی مخالفت کی، کیونکہ

ان کی رائے میں فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے بغیر کسی قسم کے دستور کا بننا ممکن نہ تھا۔ آخر میں وزیرِ اعظم برطانیہ نے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ اقلیتی سب کمیٹی کا اجلاس جاری رہے گا، لیکن اس کی تاریخ اور وقت کو اُن کی فرصت پر چھوڑ دیا جائے۔ اقبال نے مسلم مطالبات کے متعلق اپنی تقریر لکھ تو رکھی تھی، لیکن اسے اجلاس میں پڑھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس مدت میں مختلف قسم کی تجاویز پیش کی گئیں اور ان میں سے بعض کی تفصیل لندن کے اخبارات میں بھی شائع ہوئی۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلے کے کسی قابلِ قبول حل کے متعلق فریقین میں کوئی خاطر خواہ تصفیہ نہ ہو سکا اور اجلاس کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخاست ہوا۔ اس سلسلے میں اقبال کا خط محررہ ۳ رنومبر ۱۹۳۱ء بنام عبداللہ چغتائی قابلِ توجہ ہے، فرماتے ہیں:

''یہ دن بہت مصروفیت کے گزرے۔ اقلیتی کمیٹی کی میٹنگ تین دفعہ ہوئی اور تینوں دفعہ پرائیویٹ گفتگوئے مصالحت کے لیے ملتوی ہوگئی۔ پرائیویٹ گفتگو بہت ہوئی مگر اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب اقلیتی کمیٹی کی میٹنگ جس کا مَیں ممبر ہوں، شاید ۱۱ رنومبر کو ہو۔ اس میں بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی کمیٹی کا کام محض مصالحت کی کوشش ہے۔ یہ کوشش کی گئی، جس کا نتیجہ اس وقت تک کچھ نہیں ہوا''۔

۱۶ رنومبر ۱۹۳۱ء کو فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی کے اجلاس کے متعلق مسلم نمائندوں کا خیال تھا کہ چونکہ کوئی فرقہ وارانہ تصفیہ نہیں ہو سکا اور مسلم مندوبین فرقہ وارانہ تصفیے کے بغیر دستور پر بحث میں شرکت کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے حکومتِ برطانیہ اس معاملے میں اپنے مسلک کا اعلان کر دے گی۔

مگر اس اجلاس میں انھوں نے محسوس کیا کہ حکومتِ برطانیہ مباحث کو آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اجلاس کی کاروائی میں حصّہ لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ اس مرحلے پر مسلم نمائندوں کا آپس میں اختلاف ہوگیا۔ اقبال کا موقف تھا کہ مسلم وفد آئندہ دستور کے متعلق بحث سے قطعی لاتعلق رہے، بلکہ اجلاس سے علیٰحدگی کا اعلان کر دے۔ اصولی طور پر سر محمد شفیع اور محمد علی جناح نے ان کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن وہ کانفرنس کو ختم کرنے کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم وفد کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے کہ مرکز کی ذمہ داری کے معاملات کے متعلق بحث جاری رکھی جائے مگر مسلمان ایسے کسی دستور کو قبول نہیں کریں گے جس میں ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے ہوں۔ اقبال اس فیصلے کے خلاف تھے۔ مسلم وفد

میں کسی نے بھی اقبال کا ساتھ نہ دیا۔ اس لیے وہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور ۱۶ر نومبر ۱۹۳۱ء کو مسلم وفد کے رسمی سربراہ آغا خان کو ایک خط کے ذریعے مطلع کر دیا کہ وہ وفد سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ چند دنوں بعد انھوں نے سیکرٹری آف اسٹیٹ کو بھی اطلاع دی کہ ان کا لندن میں ٹھہرنا بے کار ہے اور وہ ۲۱ر نومبر ۱۹۳۱ء کو چلے جائیں گے۔

دوسری گول میز کانفرنس کے ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے مباحث میں کوئی عملی حصّہ نہ لیا بلکہ اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاسوں میں خاموش بیٹھے رہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ خاموش نہ بیٹھتے تو کیا کرتے، کیونکہ اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاس تو ہر دفعہ ملتوی ہوتے رہے، یہاں تک کہ انہیں اپنی لکھی ہوئی تقریر بھی پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ فرقہ وارانہ مصالحت کے لیے پرائیویٹ گفت وشنید میں انھوں نے کچھ حد تک حصّہ لیا، مگر یہ ایک بیکار مشق سے زیادہ نہ تھا۔ اور اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ برطانوی حکام سے غیر رسمی طور پر انھوں نے ریاست حیدرآباد کو ڈومینین اسٹیٹس دلوانے کی بات چیت کی، مگر سر اکبر حیدری نے ان کی تجویز کی مخالفت کی جس کے سبب، بقول عظیم حسین، اقبال سر اکبر حیدری سے جھگڑ پڑے۔ کانفرنس کے آخری مراحل میں اقبال کا دیگر مسلم مندوبین سے اختلاف ہو گیا، کیونکہ وہ فرقہ وارانہ مصالحت کی عدم موجودگی میں مرکزی ذمہ داریوں کے مسئلے پر بحث میں حصّہ لینے کے خلاف تھے۔ دیگر مسلم مندوبین نے گو اصولی طور پر اُن کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن جب اجلاس میں پہنچے تو ایسا اعلان کرنے کی بجائے مصلحتاً خاموش رہے جس کا اقبال نے بُرا منایا اور دل برداشتگی کے عالم میں وفد سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ بحیثیت مجموعی اقبال دوسری گول میز کانفرنس کی کاروائی سے مایوس تھے۔

کشمیر کی صورتِ حال پر بات چیت

لندن میں انتہائی مصروفیات کے باوجود علّامہ محمد اقبال کشمیر کو نہ بھولے۔ گو کشمیر کا مسئلہ گول میز کانفرنس میں زیرِ بحث نہ آیا لیکن اس کا ذکر جب بھی کسی نہ کسی حوالے سے ہوا تو گاندھی جی نے چپ سادھ لی۔ بہر حال ۹ر نومبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستانی مسلمانوں کا وفد حکومتِ ہند کے انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ سے ملا اور اُن سے کشمیر کے بارے میں گفتگو کی۔ یہ گفتگو اب تک صیغہ راز میں تھی جسے پہلی بار پاکستان کے ممتاز دانشور ڈاکٹر رشید احمد جالندھری صفحہ قرطاس پر لائے۔

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، عہد حاضر میں جدیدیت کے حوالے سے ایک معتبر محقق ہیں۔ جب وہ لندن انڈیا آفس لائبریری میں بعض فائلیں دیکھ رہے تھے تو انھیں ڈاکٹر اقبال اور کشمیر سے متعلق ایک فائل مل گئی جس میں علاّمہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح اور دوسرے شرکاء کی بات چیت درج ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری کارروائی انگریزی زبان میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''......۹/نومبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستانی وفد کے مسلم ارکان نے، جو گول میز کانفرنس میں یہاں لندن آئے تھے، حکومت ہند کے انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ کے ساتھ ایک ملاقات کی جس میں انھوں نے مسئلہ کشمیر پر گفتگو کی۔ سر محمد شفیع نے کشمیر کی افسوس ناک صورتِ حال تفصیل سے بیان کی۔ انھوں نے بتایا کہ کشمیری مسلمان ہر قسم کے جبر و استبداد کا شکار بن رہے ہیں۔ پولیس ان کی مقدس کتاب، عبادت گاہوں اور عورتوں کی بے حرمتی کرتی ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے ہونے والے مظاہرے مہاراجہ کے خلاف نہیں ہیں۔ یہ صورت ۲۵ برس سے قائم ہے لیکن اس کے باوجود برطانوی حکومت نے کشمیر میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔ اس نکتے پر ڈاکٹر محمد اقبال نے فرمایا:

''اگر مہاراجہ نے اس (افسوس ناک) صورت حال کو برابر جاری رکھنے کی اجازت دی تو وہ اس کا ذمہ دار ہے۔ آپ (سر میاں محمد شفیع) یہ بات کھل کر کیوں نہیں کہتے؟

اس پر چودھری ظفر اللہ خان نے کہا: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں، مہاراجہ کو اس کا علم نہیں ہے تاہم یہ فیصلہ کیا گیا کہ اقبال اور ذوالفقار علی، مہاراجہ سے ملاقات کریں، لیکن موخر الذکر اس ملاقات پر آمادہ نہ تھے۔ وائسرائے کی دوبارہ ہدایت پر ہم نے مہاراجہ سے ملاقات کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ وہاں کے سرکاری حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ حکومت کشمیر کے معاملات میں مداخلت کرنا چاہتی ہے۔ لیکن انڈیا آفس کے کہنے پر حکومت نے کشمیر میں مداخلت کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ اب یہ حکومت برطانیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ کشمیر کے معاملات پر غور کرے کیونکہ اس نے کشمیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تھا''

یہ تقریر سننے کے بعد ڈاکٹر اقبال نے کشمیر کے متعلق اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''اب سب حقائق آپ کے سامنے ہیں۔ مَیں اپنی طرف سے ان میں کوئی اضافہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سری نگر میں بچوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا جا رہا ہے۔ سری نگر کی تقریباً ہر گلی میں اُن پر گولی چلائی جا رہی ہے، اور ڈوگرہ پولیس کے ہاتھوں عورتوں کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس یورپ کی تین مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کی شہادتیں موجود ہیں جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب اس معاملہ میں انکوائری

کے لیے نہ صرف پنجاب اور کشمیر کے مسلمان، بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمان کشمیر میں ڈوگرہ فوج کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کی تحقیقات کی شدید خواہش رکھتے ہیں، چنانچہ مَیں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہماری اس خواہش کو سیکرٹری آف سٹیٹ (برائے ہندوستان) تک پہنچا دیں کہ وہ کشمیری فوج کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کی فوری تحقیقات کے احکام صادر کریں- ان تحقیقات کے نتیجے میں اگر لوگوں کا قصور ثابت ہو تو لوگوں کو سزا دی جائے یا ان کی مذمت کی جائے-لیکن اگر مہاراجہ یا اس کی انتظامیہ قصوروار ہو تو مہاراجہ کو معزول کیا جائے۔ مَیں مہاراجہ اور اس کی انتظامیہ کے قصوروار ثابت ہونے پر مہاراجہ کی معزولی کا مطالبہ کرتا ہوں۔ہمیں اس بات کی قطعاً پروا نہیں ہے کہ کشمیری مسلمانوں پر وہاں کی سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہیں یا ان کے لیے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع موجود نہیں ہیں۔ہمیں اس کی بھی کوئی پروا نہیں کہ انھیں فوری تعلیم و تربیت سے دور رکھا جاتا ہے نہ ہمیں اس بات کی پروا ہے کہ ان پر بھاری ٹیکس لگائے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ پچھلے ساٹھ برس سے ۲ روپے ۷ آنے سالانہ ادا کر رہے ہیں جبکہ ہندو شہری صرف ۳ آنے سالانہ ادا کرتے ہیں۔ہمیں ان باتوں کی کوئی فکر نہیں۔ہمیں فکر صرف اس بات کی ہے کہ کشمیری عوام کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ان کی عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے ساتھ انصاف کیا جائے جو کشمیری فوج کے ہاتھوں بے رحمی سے قتل ہو رہے ہیں۔ ہم آپ سے چاہتے ہیں کہ آپ معاملہ کی تحقیقات کرائیں۔اور اگر ضروری ہو تو مہاراجہ کو معزول کر دیں یہی ہمارا مطالبہ ہے جو مَیں بالکل سیدھے سادھے انداز میں آپ،سیکرٹری آف سٹیٹ اور برطانوی عوام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے مستقبل قریب میں مجھے (یہاں) اس موضوع پر بات کرنے کے مواقع ملیں گے۔ اور مَیں یہ تمام معاملات برطانوی عوام تک پہنچانا چاہتا ہوں کیونکہ ان تمام امور قتل و غارت کو کم از کم ایک سو برس تک جاری رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔شاید برطانوی عوام کشمیر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انھوں (برطانوی حکومت) نے کشمیر کو ۷۵ لاکھ روپے (تقریباً ۵۰ ہزار پونڈ) میں فروخت کیا ہے۔ یہ ایک ایسا سودا ہے جسے نہ تو جدید فلسفہ قانون تسلیم کرتا ہے اور نہ جدید اخلاقیات۔اس سودے کے دو سال بعد ہندوستان میں اس وقت کے گورنر جنرل نے اعلان کیا تھا کہ اس سودے کو بے انصافی کا ذریعہ بننے نہیں دیا جائے گا،لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہی سودا پچھلے سو برس سے ایک بہت بڑے ظلم وستم کی وجہ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ مَیں آپ کے انصاف اور مساوات کی بلند روایات سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ غور کریں کہ آیا کشمیری عوام سے انصاف ہو

رہا ہے یا نہیں۔ اور اگر اس انصاف میں مہاراجہ ملوث ہے تو آیا اس کی حکومت ختم ہو گئی ہے یا نہیں۔ ہم کسی صورت میں مہاراجہ کی حکومت کے جاری رہنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اگر کشمیری عوام غلطی پر ہیں...... جو بھی صورت ہو...... ان کے عورتوں، مردوں اور بچوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر قتل کیا گیا ہے۔ اور اگر تحقیقات کے نتیجے میں مہاراجہ کا اس جرم میں شریک ہونا ثابت ہو جائے تو اسے یقیناً معزول کیا جانا چاہیے۔ ہم اس جرم میں مہاراجہ کا کم از کم اس حد تک ملوث ہونا سمجھتے ہیں کہ آخر کار وہ انتظامیہ کا سربراہ ہے۔ اگر آپ ہمارا یہ مطالبہ پورا نہیں کریں گے تو مَیں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس وفد میں ایسے ارکان بھی موجود ہیں جو محسوس کرتے ہیں کہ اگر آپ کشمیری عوام کا مطالبہ پورا نہیں کرتے اور ڈوگرہ فوج کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کی تحقیقات نہیں کرتے تو وہ (ارکان) آپ کے ساتھ پرخلوص تعاون نہیں کر سکتے۔

شوکت علی: مَیں عزت مآب مہاراجہ کے ذاتی دوستوں میں شامل ہوں، اور میرا خیال ہے کہ مہاراجہ ایک اچھے انسان ہیں۔

اقبال: وہ اچھا انسان نہیں ہے۔ آپ اپنے ذاتی تعلقات کو بیچ میں نہ لائیں۔ آپ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے آئے ہیں۔

شوکت علی: سر محمد اقبال نے جو کچھ کہا، مَیں اس میں مداخلت نہیں کرتا اور امید کرتا ہوں کہ وہ بھی میری بات میں مداخلت نہیں کریں گے۔

اقبال: یہ مداخلت کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ یہاں اپنی ذات کی نمائندگی کرنے نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے آئے ہیں۔

شوکت علی: مَیں سر محمد اقبال کا بہت احترام کرتا ہوں۔ جب یہ سب باتیں وقوع پذیر ہو رہی تھیں تو وہ وہاں موجود تھے جبکہ مَیں وہاں موجود نہیں تھا۔ اُن کا تعلق کشمیر ہی سے ہے اور مَیں ان کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ وہ مجھے اپنی بات اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کی اجازت دیں گے۔ مجھے ہندوستان کی ریاستوں پر پورا بھروسا ہے، اور ہم وہاں مستقبل کے لیے دستور سازی کر رہے ہیں۔ لیکن مَیں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر ان معاملات کا تدارک نہ کیا گیا اور ان معاملات میں حکومتِ برطانیہ کا نام بار بار لیا جاتا رہا تو ہم جو بڑے سکون سے کام کر رہے ہیں، سکون سے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے اپنے ملک میں کچھ مفسد لوگ ہیں جو مسلمانوں اور آپ (انگریزوں) کے درمیان مزید اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ لوگ آپ میں اور مسلمانوں میں جھگڑا پیدا کرنے

کی کوشش کریں گے۔ ہمیں مقدور بھراس پریشانی سے بچنا چاہیے- اورمَیں سیکرٹری آف سٹیٹ اورانگریزعوام سے پرزوراپیل کرتا ہوں کہ آپ فوری طور پر کچھ کریں تاکہ یہ شکایات ختم ہو جائیں۔

محمد علی جناح: جناب! کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ موجودہ دور میں کشمیر میں برطانیہ کی آئینی حیثیت کیا ہے؟

سٹیورٹ: اِس وقت میرے پاس کشمیر کے ساتھ ہونے والا معاہدہ موجود نہیں ہے۔ لہٰذا میرے لیے فوری طور پر اس کا جواب دینا مشکل ہوگا۔

محمد علی جناح: مَیں معاہدے کا نہیں پوچھ رہا۔ مَیں جانتا ہوں کہ ایک طرح سے مہاراجہ کی درخواست پر حکومت نے کشمیر کو (اپنے) کنٹرول میں لیا ہے۔

پیٹرک: مہاراجہ نے انگریز فوجی دستوں کی امداد کی درخواست کی تھی۔

محمد علی جناح: لیکن اب وہاں پر اختیار کس کے پاس ہے؟

آغاخان: نظم ونسق کا؟

محمد علی جناح: ہر بات کا -مَیں اپنے سوال کا مستند جواب چاہتا ہوں کیونکہ ہم اخبارات میں اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھتے ہیں لیکن ہم اخبارات کی ان خبروں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جنکنز ہی وہ شخص ہیں جس کے ہاتھ میں مکمل طور پر جموں کے سول اختیارات ہیں۔

پیٹرک: وہ جموں میں فوجی کمانڈر کے ساتھ سیاسی مشیر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔

محمد علی جناح: لیکن اب انھوں نے وہاں کلی اختیارات حاصل کر لیے ہیں، سول بھی اور فوجی بھی۔

پیٹرک: مسٹر جناح! میرے پاس یہی معلومات تھیں۔

ڈاکٹر شفاعت: مہاراجہ تو بس برائے نام ہے!

محمد علی جناح: مَیں اس بات کا جواب اپنے رفقاء سے نہیں سننا چاہتا۔ مجھے سرکاری معلومات درکار ہیں، اوراسی لیے مَیں جاننا چاہتا ہوں کہ کہ وہاں کی آئینی حیثیت کے بارے میں سرکاری اطلاعات کیا ہیں؟ مَیں آپ کو بتاؤں گا کہ مَیں یہ بات جاننے کے لیے اتنا بے چین کیوں ہوں۔ اگر ہمیں حتمی طور پر معلوم ہو جائے کہ کشمیر میں داخلی اختیارات کس کے پاس ہیں تو ہم آپ کے لیے اور بھی مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میرے یہ سوال پوچھنے کی صرف یہی وجہ ہے۔ مَیں یہ سوال پریشانیاں پیدا کرنے کے لیے نہیں پوچھ رہا بلکہ مَیں یہ جاننے کے لیے واقعی سخت بے چین ہوں - اگر آپ مجھے بتا سکیں کہ اس وقت کشمیر میں کلی اختیار کس کے پاس ہے؟'' آیا

یہ اختیار انگریزی حکومت کے پاس ہے یا نہیں؟''
(انڈر سیکرٹری (برائے امورِ ہند) کے ساتھ مسلم وفد کا یہ اجتماع ۹ر نومبر ۱۹۳۱ء بروز پیر سہ پہر چار بجے منعقد ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو۔ ایل۔ پی۔ او ۱۹۴۹ء/ ۶۔II ۳)

غرضیکہ علاّمہ محمد اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح نے دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر مسئلہ کشمیر اُٹھایا۔ متذکرہ صدر بات چیت میں جن چند باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُن میں سے بعض کی وضاحت ضروری ہے:

اول: مسلم وفد اور برطانوی حکومت کی بات چیت کا پسِ منظر۔
دوم: جموں میں برطانوی فوج کی موجودگی۔
سوم: مولانا شوکت علی مرحوم کا مہاراجہ ہری سنگھ کا دفاع کرنا۔

۱۹۳۱ء میں جموں میں عید الاضحیٰ کے موقع پر ڈوگرہ پولیس کے ایک کارندے نے جس کا نام کھیم چند تھا، مفتی محمد اسحاق کو خطبۂ عید دینے سے منع کر دیا۔ مسلمانوں نے اس پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا اور اسے مداخلت فی الدین قرار دیا۔ اس واقع کے چند روز بعد جموں جیل میں ایک غیر مسلم ملازم نے ایک مسلمان قیدی (جو تلاوت کلامِ پاک کر رہا تھا) سے قرآن پاک (پنج سورہ) لے کر زمین پر پھینک دینے کی سفاکانہ جسارت کی اور توہینِ قرآن کا مرتکب ہوا۔ ان واقعات نے مسلمانانِ ریاست کو تڑپا دیا۔ اس سلسلہ میں صوبہ کشمیر میں اجتماعات شروع ہو گئے۔ جون ۱۹۳۱ء کو ایک غیر ریاستی باشندے عبدالقدیر خان نے مسلمانانِ ریاست کشمیر کے اجتماع سے خطاب کیا جس پر اسے بغاوت پر اکسانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ کشمیری مسلمانوں نے اس کی حمایت میں جلوس نکالے، جلسے کیے اور مظاہرے بھی کیے۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کو سنٹرل جیل سری نگر کے باہر جمع شدہ کشمیری عوام پر، جو عبدالقدیر خان کے مقدمے کی سماعت کے لیے آئے تھے، حکومت جموں و کشمیر نے گولی چلا دی جس سے بائیس (۲۲) مسلمان شہید ہو گئے۔

اِس وقت ریاست کا وزیر اعظم ایک انگریز مسٹر ویک فیلڈ تھا جس نے ان حالات کو اپنی کتاب یادداشتیں (Recollections) میں لکھا ہے، اور کہا کہ ہر شہید ہونے والے کے بدن پر سینے پر گولی لگی تھی۔

اس واقعے کا پورے ملک میں چرچا ہوا۔ مسلمانوں نے علاّمہ محمد اقبال کی سرکردگی میں

کام شروع کر دیا۔ مولانا عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کے انقلاب، مولانا ظفر علی خان کے زمیندار اور شیر جنگ کے اخبار سیاست نے اس مسئلے کو اولیت دی۔ چونکہ جماعت احمدیہ نے بھی کشمیریوں کی حمایت کی تھی، اس لیے چودھری ظفر اللہ خان بھی پیش پیش تھے۔ پھر آل انڈیا کشمیر کمیٹی بھی قائم ہو چکی تھی جس کے روح رواں علاّمہ محمد اقبال تھے، اور یہ جماعت مسائل و مصائب کشمیر میں دلچسپی لے رہی تھی۔ ازاں بعد جب جماعتِ احمدیہ نے اس تنظیم کے حوالے سے اپنی مذہبی سرگرمیاں شروع کیں تو علاّمہ محمد اقبال اس سے الگ ہو گئے۔

۲۔ جن ایام میں دوسری گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ ان دنوں ریاست جموں و کشمیر میں تحریکِ حریتِ کشمیر زوروں پر تھی اور ڈوگرہ حکومت نے برطانوی ہند کی حکومت سے نہ صرف فوجی امداد لی تھی بلکہ ریاست میں مارشل لاء بھی لگا دیا تھا۔ خاص طور پر جموں میں، جہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ۱۷ کاتک (بکرمی) مطابق نومبر ۱۹۳۱ء کو پانچ مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا تھا۔ اور جموں میدان کارزار بنا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے برطانوی حکومت کے نمائندے سے بار بار یہ استفسار کیا کہ ریاست میں کس کی حکومت ہے؟

(علاّمہ محمد اقبال لندن میں بھی کشمیر کے حالات سے باخبر رہے)

۳۔ حقیقت یہی ہے کہ مولانا شوکت علی، مہاراجہ کشمیر کے دوست تھے۔ وجہ یہی تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ بباطن انگریزی حکومت کے خلاف تھا۔ جس نے اس کی تخت نشینی سے قبل مسٹر "اے" کے نام سے بلیک میلنگ کا مقدمہ بنوا دیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے پہلی گول میز کانفرنس، جس کے دوران مولانا محمد علی جوہر خالق حقیقی سے جا ملے، کے سلسلے میں جو خط لکھا ہے اور اپنے بھائی کی وفات اور میت کی فلسطین روانگی کی روداد قلم بند کی ہے اس میں تحریر ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کی وفات کی خبر سن کر جو چند لوگ فوری طور پر آئے ان میں مہاراجہ ہری سنگھ آف کشمیر بھی تھا۔

لندن میں دیگر اہلِ علم سے ملاقاتیں

انگلستان میں قیام کے دوران میں اقبال کی دیگر مصروفیات کی تفصیل کچھ یوں رہی۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سر سیموئل ہور (Sameoul Hover) وزیرِ ہند اُن سے اُن کی رہائش گاہ پر ملنے

آئے اور ہندوستان کے دستور میں مسلمانوں کی پوزیشن کے متعلق گفتگو کی۔ ۷/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو وہ ایران کے سابق وزیر اعظم سیّد ضیاء الدین طباطبائی کی دعوت میں شریک ہوئے۔ اور دوپہر کا کھانا اُن کے ساتھ کھایا۔ سید ضیاء الدین طباطبائی ۱۹۲۱ء میں احمد شاہ قاچار کے عہد میں ایران کے وزیر اعظم رہ چکے تھے۔ جب رضا خان، (بعد میں رضا شاہ پہلوی) وزیرِ جنگ تھے، لیکن رضا خان سے اختلاف کے سبب انھوں نے وزارت عظمیٰ سے استعفا دے دیا اور سوئٹزرلینڈ میں آباد ہو گئے۔ سید ضیاء الدین طباطبائی نو (۹) زبانیں بول سکتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کے حامی اور اتحادِ عالمِ اسلامیہ کے پر جوش مبلغ تھے۔ وہ بھی اقبال کی طرح بیت المقدس میں منعقدہ مؤتمر اسلامی میں شریک ہوئے۔ لندن میں صرف چند دن کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اقبال نے انہیں ''جاوید نامہ'' کے بعض حصّے پڑھ کر سنائے، جنہیں سُن کر'' سیّد صاحب تڑپ اُٹھے اور اپنے رفقاء سے کہنے لگے کہ ایسے اشعار نہ آج تک پڑھے اور نہ سُنے، ضروری ہے اس کلام کو بکثرت ایران میں شائع کیا جائے''۔ ۸/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اقبال نے عراق کے سفارت خانے میں دعوتِ طعام میں شرکت کی۔ ۹/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو البانیہ کے سفیر کی دعوت میں شریک ہوئے۔ اسی روز ''سیٹر ڈے ریویو'' کے مدیر پنکھر ڈ نے انہیں چائے پر بلایا۔ اس موقع پر برطانوی پریس کے لوگوں سے انھوں نے مختصر تقریر میں فرمایا:

> ''انگریزوں کو بحرِ مردار کے مالی ذخائر اور دوسرے معاملات کا خیال ترک کر کے اخلاقی حیثیت سے اہلِ فلسطین کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اعلانِ بالفور منسوخ کیا جائے''۔

۱۰/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سر ظفر اللہ خان نے انہیں اور دیگر مسلم مندوبین کو شفیع ریستوران میں ایک پُر تکلف دعوت دی۔ یہ ریستوران امرتسر کے ایک باشندے محمد شفیع کی ملکیت تھا اور یہاں عمدہ دیسی کھانے کھلائے گئے۔ اگلے روز مولانا فرزند علی، امام لندن مسجد نے اقبال اور ان کے رفقا کو مسجد فضل میں بلوایا اور ان کا تعارف چند انگریز نومسلموں سے کرایا گیا۔ ۱۳/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سر ڈینی سن راس انہیں ملنے کے لیے آئے اور اقبال کے ساتھ دنیائے اسلام میں مذہبی تحریکوں بالخصوص بہائیت کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ وہ اگلے روز دوبارہ ملاقات کے لیے آئے کیونکہ اس موضوع پر لیکچر دینے کے لیے انھوں نے دو ایک روز میں امریکہ جانا تھا۔

۱۴؍اکتوبر۱۹۳۱ء کو اقبال کے اعزاز میں نومسلم بیرونٹ مادام فاطمہ العابد نے رٹز ہوٹل میں ایک دعوت دی جس میں وہ شریک ہوئے۔ ۱۶؍اکتوبر۱۹۳۱ء کو غازی رؤف بے انہیں ملنے کے لیے آئے اور تین گھنٹے تک اُن کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ رؤف بے نے ترکی کی آزادی کی جنگ میں حصہّ لیا تھا، لیکن مصطفٰے کمال سے اختلاف کی بنا پر۱۹۲۴ء میں جلاوطن کر دیے گئے۔ اسی دن اقبال نے افغان قونصل خانے میں سردار احمد علی خان، وزیرِ مختار کی عظیم الشان دعوت میں شرکت کی جو محمد نادرشاہ کی تاجپوشی کی سالگرہ کے موقع پر دی گئی تھی۔ انھی دنوں میں سے کسی دن کیمبرج سے چودھری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم اور دیگر مسلم طلبہ انہیں ملنے کے لیے آئے۔ بقول خواجہ عبدالرحیم، انھوں نے اقبال کو بتایا کہ شمال مغربی ہند میں ان کی تجویز کردہ مسلم ریاست کا نام ''پاکستان'' رکھا گیا ہے اور یہ لفظ مرکب ہے۔ کشمیر سمیت تین مسلم اکثریتی صوبوں کے ناموں کے پہلے حروف کا اور بلوچستان کے ''تان'' کا۔ اقبال اس روز کچھ علیل تھے اور بستر پر دراز تھے۔ انھوں نے طلبہ سے کہا کہ ''پاکستان'' کے مختلف حروف کو علیٰحدہ علیٰحدہ گتے کے ٹکڑوں پر تحریر کر کے ان کے بستر کے اردگرد رکھ جائیں تاکہ وہ اس نام پر غور کر سکیں۔ طلبہ نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی اور چلے آئے۔ ۲۰؍اکتوبر۱۹۳۱ء کو سروجنی نائیڈو کی وساطت سے اسلامی ممالک کی سیاّح خاتون روزیٹہ فاربیز نے انہیں گھر بلوایا اور قرآنی تعلیمات کے متعلق اُن سے سوال پوچھے۔ اس کے بعد وہ لیڈی ہاٹوگ کی دعوت میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ ۲۱؍اکتوبر۱۹۳۱ء کو کرنل فیرا ور دو ایک روز بعد پروفیسر گب انہیں ملنے کے لیے آئے اور انھوں نے اقبال کو لندن یونیورسٹی میں لیکچر دینے کی دعوت دی، لیکن مصروفیّت کے سبب دعوت قبول نہ کی گئی۔ کرنل فیرر سے ہندوستان میں اسلامی تحریکات اور پروفیسر گب سے افریقہ میں اسلامی تحریکات کے موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ۲۳؍اکتوبر۱۹۳۱ء کو سعید شامل، اقبال سے ملنے کے لیے آئے۔ سعید شامل شمالی قفقاز میں روسی کمیونسٹوں کے خلاف اپنے علاقوں کی آزادی کے لیے لڑ چکے تھے۔ وہ ان مسلم علاقوں پر روس کے مظالم کا ذکر کرتے رہے۔ ان کا مستقل قیام وارسا (پولینڈ) میں تھا اور وہ اشتراکیوں کے سخت مخالف تھے۔ اقبال نے انہیں بتایا کہ روسی اشتراکیت یورپی امپیریلزم کے خاتمے کے لیے ایک کارآمد عنصر ثابت ہوسکتی ہے، اس لیے مسلمانوں کو ایسی حکمتِ عملی اختیار کرنی چاہیے کہ اس کی مخالفت نہ کی جائے، لیکن سعید شامل نے ان سے

اتفاق نہ کیا اور کہا کہ روسی اشتراکیت بظاہر یورپی امپیریلزم سے بہتر معلوم ہوتی ہے مگر در حقیقت وہ بجائے خود ایک قسم کا امپیریلزم ہے۔ اقبال ان سے یہی کہتے رہے کہ مسلمانوں کی روسی اشتراکیت کی مخالفت سے یورپی امپیریلزم فائدہ اٹھائے گا۔ اس لیے یورپ کی اقتصادی برتری اور دیگر امراض کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے اس کا وجود ضروری ہے۔ اسی شام انھوں نے نواب احمد سعید خان چھتاری کی مسلم مندوبین کے لیے دعوتِ چائے میں شرکت کی۔ لندن میں اقبال کا تعارف نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی صدر مس مارگریٹ فارقوہرسن سے ہو چکا تھا۔ مس فارقوہرسن مسلمانوں کی ہمدرد تھیں اور ان کی نیشنل لیگ کا مقصد سلطنتِ برطانیہ کا مسلمانانِ عالم سے خوشگوار تعلقات قائم کرنا اور ان کے ساتھ زیادتیوں کے مداوا کی کوشش کرنا تھا۔ ۲۷/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انھوں نے اقبال اور مولانا شوکت علی کی دعوت کی جس میں اپنے ہم خیال لوگوں کو مدعو کیا۔ دعوت سے فراغت کے بعد اقبال چند ساتھیوں کے ساتھ قواکرز ہال پہنچے اور قواکر مرد اور عورتوں سے ملاقات کی۔ (قواکر قبیلہ غالباً عیسائیت کی شاخ ہے یہ بہت ہی محدود تعداد میں ہے اِن کے افراد زیادہ تر برطانیہ اور آئر لینڈ میں ہیں۔ کسی حد تک تسمانیہ میں بھی اِن کی تھوڑی سی آبادی ہے)۔

۴/نومبر ۱۹۳۱ء کو پانچ بجے شام اقبال نے لندن میں انڈیا سوسائٹی کے علمی اجتماع سے خطاب کیا۔ انڈیا سوسائٹی کے صدر سر فرانسس ینگ ہسبنڈ نے حاضرین سے اُن کا تعارف کرایا۔ اقبال نے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ اُن کی شاعری میں بعض فلسفیانہ خیالات ہیں، لیکن اُن کا کوئی منظّم فلسفہ نہیں ہے۔ وہ انسان کے درخشاں مستقبل پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ اور اُن کے عقیدے کے مطابق انسان نظام کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیّتیں رکھتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے اشعار میں سے بعض کی تشریح کی اور اپنی شاعری کے اسلوب کی وضاحت کی۔ پھر فارسی کی چند تصانیف کا ذکر کیا اور آخر میں اپنی تازہ تصنیف ''جاوید نامہ'' (جو ان دنوں زیر طباعت تھی) کے موضوع کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ تقریر کے اختتام پر انھوں نے انسانی خودی یا انا کے بارے میں چند سوالات کے جواب دیے۔ رات کے کھانے کے لیے لارڈ اور لیڈی ارون کے ہاں گئے۔ ۱۸/نومبر ۱۹۳۱ء کو اقبال ایک دن کے لیے کیمبرج گئے۔ غلام رسول مہر اور مولانا شفیع داوَدی اُن کے ساتھ تھے۔ اسٹیشن

پر چودھری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم اور متعدد دیگر اصحاب استقبال کے لیے موجود تھے۔ پانچ بجے شام اُن کے اعزاز میں یونیورسٹی آمرز ہوٹل میں دعوتِ چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں پروفیسر نکلسن اور پروفیسر لیوی سمیت یونیورسٹی کے کئی اساتذہ موجود تھے۔ مصر کے ڈاکٹر سلیمان نے، جو انٹرنیشنل مسلم ایسوسی ایشن کیمبرج کے صدر تھے، اقبال کا تعارف دیگر مہمانوں سے کرایا۔ مجمع سے پروفیسر سورلے، پروفیسر نکلسن اور پروفیسر لیوی نے خطاب کیا۔ آخر میں اقبال نے تقریر کی۔ انھوں نے اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا کہ محفل میں پروفیسر براؤن اور پروفیسر میک ٹیگرٹ موجود نہیں۔ پھر فرمایا:

''کانفرنس کے کام میں میری شرکت بلاواسطہ نہیں بالواسطہ ہے۔ یہاں ہندوستان کی مختلف قوموں کی تقدیروں کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ مَیں نے ضروری سمجھا کہ اس کام میں شریک ہو کر میں بھی اپنے رفقائے کار کا ہاتھ بٹاؤں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ باہمی گفتگو میں ہم کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے اور ہم میں اتحاد نہیں ہو سکا۔ مَیں ان نوجوانوں کو جو کیمبرج میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں۔ چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیمبرج وہ سرچشمۂ علم وفضل ہے جس نے یورپی تہذیب و تمدّن کی ترکیب میں سب سے زیادہ حصّہ لیا ہے۔ مَیں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ دہریّت اور مادیّت سے بچیں۔ اہلِ یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مذہب و حکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا اور اس سے ان کی تہذیب روحِ اخلاق سے محروم ہوگئی۔ اور اس کا رُخ دہریانہ مادیّت کی طرف پھر گیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسانی اَنا کائنات کا مرکز ہے۔ یہ اولین نقطۂ نظر ہے۔ فلسفی کثرت سے وحدت کی طرف آئے۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ وحدت سے کثرت کی طرف جائیں۔ مَیں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق بعض پیش گوئیاں کی تھیں۔ اگرچہ مَیں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے۔ اس سے چھ سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں میری پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ یورپ دراصل اہل یورپ کی اسی غلطی کا نتیجہ تھی، جس کا مَیں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی مذہب وحکومت کی علیٰحدگی اور دہریانہ مادیّت کا ظہور۔ بالشوزم مذہب و حکومت کی علیٰحدگی کا طبعی نتیجہ ہے۔ مَیں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مادیّت سے بچیں۔ چند روز قبل انگریز خواتین کے ایک بہت بڑے مجمع میں مجھ سے کہا گیا کہ میں عورتوں کو کوئی نصیحت کروں۔ مَیں نے انہیں کہا تھا کہ انگریز خواتین کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم

فرض یہ ہے کہ وہ آئندہ نسل کو دہریانہ مادیّت کے چنگل سے بچائیں۔ مذہب بے حد ضروری چیز ہے۔ مذہب عرفان وایقان کا نام ہے''۔

لندن میں الوداعی خطاب

اقبال کے لندن کو الوداع کہنے سے قبل ۶ رنومبر ۱۹۳۱ء کو ہوٹل والڈورف میں اقبال ادبی تنظیم نے اقبال کے اعزاز میں ایک عظیم الشان چائے پارٹی کا اہتمام کیا۔ جس میں تقریباً چار سو شخصیات کو مدعو کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس کے تمام اراکین اس دعوت میں موجود تھے۔ مہاتما گاندھی، سرتیج بہادر سپرو، سروجنی نائیڈو، آغا خان، محمد علی جناح، سر عمر حیات ٹوانہ، سر محمد شفیع، سر ظفر اللہ خان، مولانا شوکت علی، سر اکبر حیدری، سر میرزا اسماعیل، سردار اجل سنگھ وغیرہ سب آئے تھے۔ بہت سے انگریز مہمان بھی تھے۔ خواتین کی خاصی تعداد تھی۔ اکابرِ علم وفضل بھی مدعو تھے لندن، کیمبرج اور آکسفورڈ میں زیرِ تعلیم ہندو مسلم طلبہ، نیز غیر ہندوستانی طلبہ بھی شریک تھے۔ مسلم طلبہ میں چودھری رحمت علی اور خواجہ عبدالرحیم پیش پیش تھے۔ مہمانوں کا استقبال ایک بڑے کمرے میں کیا گیا تھا۔ جہاں ہر آنے والے مہمان سے اقبال کا تعارف سر عمر حیات ٹوانہ کراتے تھے۔ چائے کا انتظام دو بڑے ہال کمروں میں کیا گیا تھا۔ چائے سے فراغت کے بعد جلسے کی کاروائی شروع ہوئی۔ سر عبدالقادر نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں پروفیسر نکلسن نے تقریر کی، انھوں نے واضح کیا کہ'' اقبال اپنے کلام کے ذریعے ایک خاص پیغام دینا چاہتے ہیں۔ جس میں روحانیت کا پہلو غالب ہے اور یہ پیغام دہریانہ مادیّت کے خلاف ہے۔ ابتداء میں لوگوں نے گمان کیا کہ اقبال نطشے کے افکار کو فارسی جامہ پہنا کر پیش کر رہے ہیں، مگر جس کسی نے بھی اُن کے اشعار کا بغور مطالعہ کیا ہے اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اُن کی تعلیمات مختلف ہیں''۔

پروفیسر نکلسن کی تقریر کے بعد نیاز محمد خان سیکرٹری اقبال ادبی تنظیم نے اقبال کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ایڈریس کے خاتمے پر اقبال نے میز بانوں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بتایا کہ طالب علمی کے زمانے میں جب وہ انگلستان آئے تھے تو انھوں نے کیا محسوس کیا تھا؟ وہ کس قسم کے خیالات لے کر وطن واپس گئے۔ (انہیں مشرقی ادبیات میں روح پیدا کرنے

کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنے کا خیال کیونکر آیا اور انھوں نے فارسی زبان میں اشعار کہنے کیوں شروع کیے)۔

مَیں نے جو خیالات ظاہر کیے تھے، اُن پر ابتدا میں بہت سے اعتراض ہوئے۔ حتیٰ کہ میری نسبت کہا گیا کہ مَیں دہریّت کی تبلیغ کرتا ہوں۔ اور یہ اعتراض مسیحی کلیسا کے ایک رئیس کی طرف سے کیا گیا۔ سائنس کے مقابلے میں یورپی ادبیات کی کمزوری اور انحطاط کا مجھے جو احساس ہوا، اسے مَیں نے مختلف اشعار کے روپ میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:

عشق ناپید و خرد مے گزدش صورتِ مار
گرچہ در کاسۂ زر لعل ِروانے دارد

(اہل یورپ میں جذبۂ عشق کا فقدان ہے اور اُن کی عقل انہیں سانپ کی طرح ڈس رہی ہے (وہ عقل سے کائنات کے اسرار تو سمجھ سکتے ہیں مگر خدا کی معرفت سے دور ہیں) اگر چہ وہ سونے کے جام میں لعل و جواہر کی طرح قیمتی اور چمکتی شراب رکھتے ہیں۔ (عیش وعشرت کی سبھی لوازمات موجود ہیں) لیکن اُن کے دل معرفتِ الٰہی سے خالی ہیں۔)

مَیں مکرّر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ اگر چہ میرے ساتھ رفقاء کی کوئی فوج نہیں ہے، تاہم رفقاء کی ایک کثیر جماعت میرے سامنے ہے۔ آپ اپنی تعداد بڑھائیے۔ مَیں آپ کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو مَیں نے اپنے فرزند (جاوید اقبال) کو کی ہے۔ یعنی

کم خور کم خواب و کم گفتار باش
گرِد خود گردندہ چوں پرکار باش

(کم کھا، کم سو اور کم باتیں کر۔ پرکار کی طرح اپنے گرد گھومتا رہ یعنی اپنی خودی کی حفاظت کر، کوئی ایسی بات نہ کر جس سے خودی ضعیف ہو جائے۔)

اس کے ساتھ ہی آپ کے سامنے وہی بات دہراتا ہوں جو مَیں نے صوفیوں سے کہی ہے۔

زِمن گو صوفیانِ با صفارا
خدا جویانِ معنی آشنا را
غلامِ ہمتِ آں خود پرستم
کہ بانورِ خودی بیند خدارا

(میری طرف سے پاک باطن صوفیوں سے کہنا (خدا کو ڈھونڈنے والے عارفوں سے)، مَیں تو اُس خود پرست ہمت کا بندہ ہوں۔ جو خدا کو خودی کے نور سے دیکھتا ہے مراد ہے خود بینی سے خدا بینی تک پہنچو۔ یعنی جس نے خود کو پالیا اُس نے خدا کو پالیا۔)

بعد میں شیخ نور محمد اور عبداللہ یوسف علی نے بھی اقبال کی شاعری و فکر کے متعلق تقاریر کیں۔ آخر میں سروجنی نائیڈو نے ایک نہایت دلکش تقریر کی۔ مسز سروجنی نائیڈو نے کہا، علاّمہ اقبال ایشیاء کے ملک الشعرا ہیں انھوں نے مزید کہا ''میرے نزدیک علاّمہ اقبال اس وقت متحدہ ہندوستان کا نشان ہیں جس پر دنیا کی امید اور امنِ عالم کا قیام ہے'' پھر آغا خان کی تقریر کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

لندن سے روم کے لیے روانگی

۲۱؍نومبر ۱۹۳۱ء کو نو بجے صبح اقبال مع غلام رسول مہر وکٹوریہ اسٹیشن لندن سے روم روانہ ہوئے۔ انہیں رخصت کرنے کے لیے چند اصحاب آئے ہوئے تھے۔ دو بجے کے قریب فرانس کی بندرگاہ بولون سے وہ پلمین ریل کار میں سوار ہوئے اور چار بجے پیرس کے اسٹیشن گاردی نورد پہنچے۔ یہاں اقبال کے تار کی وجہ سے امراؤ سنگھ شیر گل استقبال کے لیے موجود تھے۔ پھر گاڑی گاردی لیاں اسٹیشن پر رکی۔ اس مقام پر اقبال کے شیدائی انہیں ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سو کچھ وقت ان کی معیّت میں گزارنے کے بعد تقریباً پانچ بجے شام اقبال اور غلام رسول مہر کی ٹرین پیرس سے روانہ ہوئی۔ شب اور ۲۲؍نومبر ۱۹۳۱ء کا پورا دن سفر میں گزرا۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے گاڑی روم پہنچی۔ اسٹیشن پر اقبال کے دوست ڈاکٹر سکارپا (قونصل جنرل اٹلی مقیم بمبئی) اور اٹلی کے رائل اکادمی کی طرف سے روم یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ایرسٹا کو استقبال کے لیے موجود تھے۔ انھوں نے اقبال اور غلام رسول مہر کو موٹر کار میں لے جا کر ایک اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرایا۔ رات کا کھانا ڈاکٹر سکارپا کے ساتھ کھایا گیا۔

رُوم میں مصروفیات

۲۳؍نومبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو ڈاکٹر سکارپا آئے اور اقبال کو بعض اہلِ علم سے ملوانے کے لیے ساتھ لے گئے۔ واپسی پر تقریباً ایک بجے رائل اکادمی کے نائب صدر فالمیکی انہیں ملنے کے لیے

ہوٹل میں آئے اور دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ تین بجے ایک فاضل اطالوی خاتون اقبال سے ملاقات کے لیے آئیں۔ شام کو ایک اطالوی بینکر کی بیوی آئیں جو ہندوستان کے علاوہ وسط ایشیا کے مختلف حصّوں کی سیاحت کر چکی تھیں۔ پھر وزارتِ خارجہ کا ایک اہم رکن ملاقات کے لیے آیا۔

۲۴ر نومبر ۱۹۳۱ء کی صبح تاریخی مقامات کی سیر کے لیے مخصوص تھی۔ سو اطالوی محکمہ آثارِ قدیمہ کا ایک افسر اور ایک جرمن خاتون جو انگریزی جانتی تھی، اقبال اور غلام رسول مہر کو ہوٹل سے لے کر کولسیزیم ایلفی تھیٹر پہنچے۔ آثار قدیمہ کے ماہر نے بتایا کہ اس تماشا گاہ میں جہاں انسانوں اور درندوں کی لڑائی کرائی جاتی تھی، پچاس ہزار افراد کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اقبال نے غلام رسول مہر سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''دیکھو ایک طرف قدیم رومی بادشاہ تھے، جنھوں نے ایک عظیم الشان عمارت اس غرض سے بنوائی کہ پچاس ہزار آدمی اس میں بیٹھ کر انسانوں اور درندوں کی لڑائی کا تماشا دیکھیں اور دوسری طرف لاہور کی شاہی مسجد اس غرض کے لیے تعمیر کی گئی تھی کہ ایک لاکھ بندگانِ خدا جمع ہو کر مساوات، اخوت اور محبت کے سچے اور مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کریں۔ اسی ایک مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ اسلام کیسی برکات وحسنات کا سرچشمہ ہے''۔ یہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد قیصر اگسٹن کے بابِ فتح سے گزرتے ہوئے وہ فورم میں داخل ہوئے۔ پھر پیلیٹین کے حصے دیکھے اور تقریباً اڑھائی گھنٹوں کے بعد لوٹے۔ کچھ دیر ہوٹل میں آرام کر کے کٹیا کومب دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ یہ زمین دوز پُر پیچ رستے میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ان غاروں یا کئی منزلوں کے تہ خانوں میں رومی دور کے عیسائی ولیوں یا راہبوں کے جسمانی پنجر اور کھوپڑیاں ترتیب سے رکھی ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر اقبال کے دل پر بہت اثر ہوا۔ فرمایا:

''مذہب بھی کیا عجیب چیز ہے۔ کوئی دوسری قوت، عقیدے اور ایمان کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ جو کچھ ہوا مذہبی عقائد کے جوش میں ہوا۔ عقیدہ اصلاً غلط بھی ہو، لیکن مذہب کے رنگ میں دل پر قبضہ کر لیتا ہے تو انسان کے قوائے عمل میں عجیب وغریب حرارت پیدا کر دیتا ہے''۔

کٹیا کومب کی زمین دوزی اور تاریکی پر بھی اقبال نے اظہارِ رائے کرتے ہوئے کہا:

''اسلام سے قبل ہر مذہب کا رجحان تیرگی، ظلمت، اخفا اور اسرار کی طرف تھا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے سورج کی روشنی میں خدائے واحد وقہار کی پرستش کی اور مذہب کو مستوری اور اخفا

سے باہر نکالا۔ اور یہ حقیقت اسلام کی عبادت گاہوں اور ماقبل اسلام کی عبادت گاہوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی آشکارا ہو جاتی ہے''۔

شام کو پانچ بجے اٹلی کے معروف عالم پروفیسر جنیٹلی انہیں ملنے کے لیے آئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ مترجم کے فرائض ڈاکٹر سکارپا نے انجام دیے۔ زیر بحث مسائل تھے، کسی قوم کی تعمیر و تربیت میں شعر و موسیقی کا حصّہ، روم کے آثارِ قدیمہ کے متعلق اقبال کے تاثرات اور یورپی تہذیب کا مستقبل۔ ڈاکٹر سکارپا نے اطالوی اخباروں اور رسالوں میں اشاعت کے لیے اقبال پر اپنے مضمون میں اُن کے بعض اشعار کے علاوہ نظم سسلی کا ترجمہ بھی اطالوی زبان میں کر رکھا تھا۔ پروفیسر جنیٹلی چونکہ خود سسلی کے رہنے والے تھے، اس لیے انھوں نے ڈاکٹر سکارپا سے ترجمے کی ایک نقل حاصل کی۔ بعدازاں اقبال نے اُن کے ساتھ جا کر اس محکمے کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا جہاں پروفیسر جنیٹلی کی زیرِ نگرانی انسائیکلوپیڈیا اطالیہ ترتیب دی جا رہی تھی۔

۱۱رجون ۱۹۳۳ء کو ایک جلسہ باغ بیرون موچی دروازہ زیرِ اہتمام مسلم انسٹی ٹیوٹ منعقد ہوا۔ علّامہ اقبال نے خطبۂ صدارت میں اسلامی تاریخ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے سفرِ اٹلی کا تذکرہ کیا اور فرمایا:

> ''جب مَیں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کیتانی ملا۔ وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ ہے۔ اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ صرف کیا ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے تاریخی مواد جمع کیا ہے۔ جب مَیں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ سے دلچسپی کیوں ہے تو انھوں نے کہا کہ اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے۔''

شاہ امان اللہ سے ملاقات

۲۵رنومبر ۱۹۳۱ء کو تین بجے اقبال اور غلام رسول مہر افغانستان کے سابق شاہ امان اللہ خان کے مکان پر انہیں ملنے کے لیے گئے۔ یہ ملاقات تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی اور اس میں امان اللہ خان نے بتایا کہ کن حالات کے تحت انہیں افغانستان چھوڑنا پڑا۔ پھر افغانستان کے مستقبل کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ ۲۷رنومبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو شاہ امان اللہ اقبال سے ملاقات کے لیے اُن کے ہوٹل میں آئے اور تقریباً دو گھنٹے تک اُن کے ساتھ مختلف موضوعات پر

باتیں کرتے رہے۔ اقبال نے انہیں رخصت کرتے وقت فرمایا:

پیرِ ما گفت جہاں بر روشے محکم نیست
از خوش و ناخوشِ او قطع نظر باید کرد

(ہمارے پیر نے فرمایا کہ دنیا مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ اس لیے اس کی خوشی اور ناخوشی سے قطع نظر کر لینی چاہیے۔ یعنی پروا نہ کریں کہ دنیا تم سے خوش رہتی ہے یا نہیں۔)

رائل اکادمی اٹلی میں لیکچر

۲۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو اقبال نے اٹلی کی رائل اکادمی میں لیکچر دیا۔ اس جلسے میں روم کے تمام اہلِ علم، دانشور اور یونیورسٹی کے پروفیسر مدعو تھے۔ نیز روم کی بعض اہم شخصیات اور کئی خواتین و حضرات نے شرکت کی۔

۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء ہی کے دن روم کے بعض اخباروں میں اقبال کی تصاویر اور ان کی شاعری و فکر پر مضامین شائع ہوئے۔ نظم سسلی کے چند حصوں کا اطالوی ترجمہ بھی اقبال کے رائل اکادمی میں لیکچر کے اقتباسات کے ساتھ چھپا۔ سسلی کی ایک متمول خاتون اقبال کو کئی مرتبہ ملنے کے لیے آئیں اور انہیں سسلی میں اپنے محل میں ایک ماہ کے لیے قیام کرنے پر مجبور کرتی رہیں تا کہ وہ انہیں اسلامی تمدّن کے آثار دکھا سکیں، لیکن اقبال نے وقت کی قلت کے سبب یہ دعوت قبول نہ کی۔ اقبال کو لندن میں طالب علمی کے زمانے سے جاننے والی نیپلز کی بیرونس یا کاؤنٹس کارنیوالے بھی روم میں انہیں بار ہا ملنے کے لیے آئیں۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ کاؤنٹس کارنیوالے ہی نے مسولینی سے اقبال کی ملاقات کرائی تھی۔ کاؤنٹس کارنیوالے اقبال کے اعزاز میں دعوت دینا چاہتی تھیں۔ اقبال نے یہ دعوت قبول کر لی۔ یہ عظیم الشان دعوت نومبر ۱۹۳۱ء کی شب کو انھوں نے روم میں اپنے وِلا میں دی۔ اس سے پیشتر شام کو نیپلز سے اٹلی کی اسمبلی کے ایک رکن بیرن روبرٹو ریکاڈی اقبال سے ملاقات کے لیے ہوٹل میں آئے۔ اور انہیں نیپلز آنے کی دعوت دی تا کہ وہ پمپئی کے کھنڈر اور آتش فشاں ماؤنٹ ویسوویس دکھا سکیں۔ اقبال نے اُن کے اصرار پر دعوت قبول کر لی۔

مسولینی سے ملاقات

اسی سفر میں انہیں مسولینی سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ ساری کیفیت انھوں نے خود اپنے دوست فقیر سید وحیدالدین کو بتائی۔ جن دنوں ڈاکٹر صاحب رُوما میں مقیم تھے۔ مسولینی نے اپنے سٹاف کے آدمی کے ذریعہ انہیں کہلا بھیجا کہ مَیں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے دعوت قبول کر لی۔ اور مسولینی سے ملنے تشریف لے گئے وہ ایک بڑے وسیع کمرے میں میز کے قریب بیٹھا تھا۔ میز پر کاغذوں کا انبار تھا۔ ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو وہ پیشوائی کے لیے آگے بڑھا۔ اس کا قد زیادہ نہیں تھا لیکن بازو بھرے ہوئے تھے۔ سینہ کشادہ اور آنکھیں شکرے کی آنکھوں کی طرح چمکیلی تھیں۔ رسمی مزاج پُرسی کے بعد اُس نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظامِ حیات کے لیئے بہت ضروری سمجھتا ہے لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہو گا لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی کہ مسولینی کے ذہن میں آسانی سے آجاتی۔ ڈاکٹر صاحب نے مسولینی کو یہ مشورہ بھی دیا Turn Your Back Towards Europe (یعنی یورپ جس معاشرہ کی ترقی کا داعی ہے تم اس کی تقلید سے اجتناب کرو) مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ مَیں مسلمانوں کے دل کیسے جیت سکتا ہُوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ مُفت تعلیم اور رہائش کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ مُسلمان طلباء کو اٹلی بلا یئے۔

مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے کوئی اچھوتا مشورہ بھی طلب کیا انھوں نے کہا ’’ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اسے حد سے نہ بڑھنے دو۔ اس سے زیادہ بسنے والوں کو نئی بستیاں مہّیا کی جائیں‘‘۔ مسولینی نے حیران ہو کر پوچھا اس میں کیا مصلحت ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ’’شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے اُس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور ثقافتی توانائی (Cultural Forces) کی جگہ محرکاتِ شر (Evil Forces) لے لیتے ہیں ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ میرے پیغمبر ﷺ نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی۔ کہ جب مدینہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو

مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے"۔ یہ حدیث سنتے ہی مسولینی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مار کر کہا۔

"What an excellent idea" یعنی کتنا حسین نظریہ ہے۔

(دانشور حضرات اس نکتہ پر غور و تجسّس کر سکتے ہیں کہ ایٹمی توانائی اور جنگی تباہی کے اس ہولناک دور میں یہ نظریہ کس قدر مصلحت اور افادیت لیے ہوئے ہے) ڈاکٹر صاحب مسولینی سے دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ جب وہ اس سے رخصت ہوئے تو لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ اور کہا کہ ہمارے لیڈر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس پہ کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے لیکن لوگ راستہ روکے کھڑے تھے اور ہجوم سے موٹر نکالنا ناممکن ہو رہا تھا۔ آخر سیکورٹی سٹاف نے کہا کہ کچھ کہہ دیجیے تاکہ ان لوگوں سے جان چھڑالی جائے۔ یہ سُن کر ڈاکٹر صاحب نے ہجوم کو مخاطب کر کے فرمایا آپ کا ڈوچے "(مسولینی) بغیر بائبل کے لُوتھر ہے" یہ فقرہ اطالوی زبان میں ترجمہ ہوا اور ہجوم میں بار بار دُہرایا گیا۔ لوگ سن کے خوشی سے ناچنے لگے اور اُسی وقت بڑے بڑے پوسٹر جن پر یہ فقرہ درج تھا، چھاپ کے در و دیوار پر چسپاں کر دیے گئے۔

مسولینی سے اقبال کی ملاقات کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ ایک اوپر بیان ہو چکی ہے دوسری روایت غلام رسول مہر کی ہے۔ اِن کے بیان کے مطابق ڈاکٹر سکارپا مترجم کی حیثیت سے اقبال کے ساتھ گئے۔ مسولینی نہایت تپاک سے ملا، مگر ملاقات زیادہ طویل نہ تھی۔ اقبال کی تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی۔ مسولینی نے پیشکش کی کہ اقبال حکومتِ اطالیہ کے خرچ پر لیبیا جائیں اور دیکھیں کہ عربوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اس مشاہدے کے بعد مشورہ دیں۔ کہ حکومتِ اطالیہ کو مزید کیا کچھ کرنا چاہیے لیکن اقبال نے فرصت نہ ہونے کا عذر کر کے اس پیشکش سے معذرت کر لی۔

ایک اور روایت سر مالکم ڈارلنگ کی ہے جس نے ۱۹۳۴ء میں اقبال سے لاہور میں ملاقات کی تھی اور بقول اس کے اقبال نے مسولینی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ مسولینی سے اُن کی ملاقات ایک وسیع و عریض ہال میں ہوئی جو اس کا دفتر تھا۔ ہال کے ایک سرے پر اونچے پلیٹ فارم پر رکھے ہوئے بڑے سے بینر کے پیچھے ایک شاندار کرسی پر مسولینی بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ اقبال کو اس حد تک پہنچنے کے لیے خاصہ فاصلہ طے کرنا پڑا، لیکن اس نے آنکھ اٹھا کر نہیں

دیکھا کہ کون آ رہا ہے۔ جب وہ پلیٹ فارم کے قریب پہنچے تو اس نے نظریں اٹھائیں اور ان کی طرف بڑھ کر پُر تپاک طریقے سے مصافحہ کیا۔ یہ ملاقات تقریباً چالیس منٹ تک جاری رہی۔ مسولینی نے اقبال سے اٹلی کے متعلق ان کے تاثرات معلوم کرنے چاہے۔ اقبال نے کچھ پس و پیش کرتے ہوئے کہا کہ میری رائے میں اطالوی لوگ ایرانیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ بڑے خوب رُو، فن پرست اور ذہین وفطین ہیں اوران کا عظیم الشان ماضی تہذیب وتمدن کی کئی صدیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مگران میں خون نہیں ہے، اس پر مسولینی نے انتہائی تعجب کا اظہار کیا۔ اقبال نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ایرانیوں کوایک فائدہ حاصل ہے جو بدقسمتی سے اطالویوں کوحاصل نہیں اور وہ یہ ہے کہ ایرانیوں کے اردگرد توانا قومیں ترک، افغان اور کُرد آباد ہیں، جن سے تازہ خون حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن اطالویوں کے لیے ایسی صورت موجود نہیں۔ مسولینی نے پوچھا کہ پھر اطالویوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اقبال نے جواب دیا کہ یورپ سے مُنہ موڑ کر مشرق کا رُخ کرو۔ یورپ کا اخلاق روبہ تنزل ہے، لیکن مشرق کی ہوا تازہ ہے اوراس میں سانس لینا چاہیے۔ مسولینی سے ملاقات کے اختتام پر جب اقبال قصرِ وینس سے باہر نکلے تو انہیں صحافیوں نے گھیر لیا اور پوچھا کہ ڈوچے (مسولینی) کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ اس پر اقبال نے جواب دیا کہ وہ اس خوف سے اپنی رائے کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتے کہ کہیں پوپ اسے ناپسند نہ کرے، لیکن صحافیوں نے انہیں نہ چھوڑا۔ بالآخر اقبال نے بہ عالمِ مجبوری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ کا ڈوچے ایک لُوتھر ہے مگر بغیر انجیل کے''۔

ان روایات میں کون سی درست ہے۔ یہ بتانا تو ممکن نہیں مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ اقبال ملاقات کے وقت واقعی مسولینی کی شخصیت سے متاثر ہوئے تھے۔ آلِ احمد سرور کے نام اپنے ایک خط محررہ ۱۲/مارچ ۱۹۳۷ء میں فرماتے ہیں:

> ''مسولینی کے متعلق جو کچھ مَیں نے لکھا ہے، اس میں آپ کو تناقص نظر آتا ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ لیکن اگر اس بندۂ خدا میں ڈیول (شیطان) اور سینٹ (ولی) دونوں کی خصوصیات جمع ہوں تو اس کا مَیں کیا علاج کروں۔ مسولینی سے اگر کبھی آپ کی ملاقات ہو تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے، جس کو شعاعِ آفتاب سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کم از کم مجھے اس قسم کا احساس ہوا''۔

مسولینی سے ڈاکٹر صاحب کی اس ملاقات اور اُن کی ایک نظم سے جو اُنہوں نے مسولینی سے متعلق لکھی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کا رُجحان بھی فاشزم کی طرف ہے۔ حالانکہ مسولینی نے اپنے لوگوں میں جو تنظیم پیدا کر دی تھی اسے وہ پسند کرتے تھے کیونکہ اسلام کی حقیقی رُوح بھی تنظیم ہے ورنہ یہ سب کو معلوم ہے کہ جب مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کر لیا تو انہیں سخت صدمہ ہوا چنانچہ انھوں نے اپنی مشہور نظم ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' ''میں امتِ عربیہ سے چند باتیں'' لکھی۔ جس میں یورپ والوں کی ہوسِ ملک گیری پر تنقید کی گئی ہے۔

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر   فتنہ ہا در آستینِ او نگر
از فریبِ اُو اگر خواہی اماں   اشترانش رازِ حوضِ خود براں
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد   وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب در حلقۂ دامش فتاد
آسماں یک دم اماں او را نداد

(تو افرنگیوں کے سحر سے بے خبر ہے۔ اس کی آستیں کے اندر جو فتنے پوشیدہ ہیں انہیں دیکھنے کی کوشش کر۔ اگر تو اس کے فریب سے بچنا چاہتا ہے تو اس کے اونٹوں کو اپنے حوض سے بھگا دے۔ اس کی ڈپلومیسی نے ہر قوم کو لاچار اور عربوں کو سو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جب سے عرب اس کے حلقۂ دام میں گرفتار ہوئے ہیں آسمان نے ایک لمحے کو بھی انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔)

اقبال نے مسولینی کی نگاہ کی جس ناممکن البیان تیزی کا ذکر کیا ہے، وہ دراصل ذہنی طور پر بیمار مجرموں یا قاتلوں کی نگاہوں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایسی تیزی انتہائی بے چینی کی علامت ہوتی ہے۔ اور اس ناممکن البیان بے چینی ہی کے عالم میں کسی بڑے جرم یا قتل کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ بہر حال جب اقبال، مسولینی سے ملے تو وہ اپنے عُروج پر تھا اور اپنی قوم کا نجات دہندہ سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اطالوی قوم میں زندگی کی نئی روح پھونکی تھی اور اس کے جوشِ خطابت کے سبب نوجوانوں کے سینے آرزوؤں سے تنے ہوئے تھے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی تعمیری کام میں مصروف تھا اور ملک تیزی سے ترقی کی طرف رواں تھا۔ اقبال کو یقین تھا کہ اطالوی نوجوانوں کی گرم جوشی ان کے عمل کی شگفتگی اور جذبات کی بلندی مسولینی ہی کے فیضِ نظر یا کرامت کا نتیجہ ہے، مگر ۱۹۳۵ء میں جب مسولینی نے ایبے سینیا پر حملہ کر کے اس چھوٹے سے

نادار ملک پر قبضہ کر لیا تو ان کی نگاہوں میں گر گیا اور اقبال اسے بھیڑیئے کی قسم کا درندہ تصوّر کرنے لگے۔ مسولینی کے قتل کے بعد جس کسی نے بھی شہر میلان میں اس کی لاش کو الٹا لٹکتے دیکھا ہے وہ نہیں جان سکتا کہ یہی مسولینی جو بالآخر اطالوی قوم کی تباہی و بربادی کا باعث بنا، چند سال قبل اس قوم کے نجات دہندہ کی حیثیت سے پرستش کیا جاتا تھا۔ اقبال اپنی زندگی میں بعض سیاسی شخصیات سے ایسے ہی متاثر ہوئے تھے۔ گو بعد میں انہیں کسی نہ کسی بنا پر مایوس ہونا پڑا۔ مثلاً شاہ امان اللہ خان سے توقعات وابستہ کیں کہ وہ افغانستان میں نئی روح پھونکیں گے، لیکن امان اللہ کو اپنے ملک سے فرار ہونا پڑا۔ اسی طرح محمد نادر شاہ سے توقعات وابستہ کیں کہ وہ افغانستان کے اسلامی تشخص کو اُجاگر کریں گے، مگر نادر شاہ کو کابل میں قتل کر دیا گیا۔ ترکی کے مصطفٰے کمال اور ایران کے رضا شاہ پہلوی سے بھی اقبال وقتی طور پر متاثر ہوئے، لیکن بالآخر وہ ان دونوں سے نا امید اور مایوس ہوئے اور اسی نا امیدی اور مایوسی کے عالم میں فرمایا:

نہ مصطفٰے نہ رضا شاہ میں ہے نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دارورسن کی تلاش میں ہے ابھی

نیپلز آمد

۲۸ر نومبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو اقبال اور غلام رسول مہر نیپلز پہنچے۔ بیرن ریکارڈی کے بیٹے نے ان کا استقبال کیا۔ وہاں سے پمپئی گئے اور دو گھنٹے تک کھنڈروں کی سیر کرتے رہے۔ تیز بارش کے باعث ماؤنٹ ویسودیس کی چوٹی پر نہ جا سکے۔ شام کو نیپلز میوزیم دیکھا۔ پھر بیرن ریکارڈی کے مکان پر پہنچے جو اقبال کے استقبال کی خاطر روم سے نیپلز آ گئے تھے۔ رات کا کھانا بیرن ریکارڈی کے ساتھ کھایا۔ بعد ازاں ریکارڈی انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے آئے اور ۲۸ر نومبر ۱۹۳۱ء کو ساڑھے گیارہ بجے رات اقبال اور غلام رسول مہر نیپلز سے روانہ ہو کر اگلے روز برنڈزی پہنچے۔

مصر آمد اور مصروفیات

۲۹ر نومبر ۱۹۳۱ء کو سہ پہر کے وقت بارش اور تند و تیز ہوا میں اقبال، غلام رسول مہر اور مولانا شفیع داؤدی (جو انہیں برنڈزی آ ملے تھے) ''وکٹوریہ'' نامی جہاز کے ذریعے برنڈزی سے

اسکندریہ (مصر) روانہ ہوئے اور دو دن کے سمندری سفر کے بعد یکم دسمبر۱۹۳۱ء کو صبح نو بجے اسکندریہ پہنچے۔ بندرگاہ پر پرنس عمر طوسون کے خاص آدمی، جمیعۃ الشبان المسلمین کے چند ارکان، صدیق محمد ناڑو، مولانا شوکت علی، اور دیگر اصحاب جو اُن کی آمد سے قبل روم سے سیدھے یہاں پہنچ چکے تھے، اُن کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ شبان المسلمین کے ارکان کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے۔ انھوں نے استقبال میں نعرے بلند کیے اور اخباری نمائندوں نے اقبال اور اُن کے رفقاء کی تصویریں کھینچیں۔ وہاں سے سب پرنس عمر طوسون کی موٹروں میں سوار ہو کر پہلے تو شاہی محل گئے، جہاں انھوں نے شاہ فواد کے ملاقاتیوں کی کتاب پر دستخط کیے اور پھر پرنس عمر طوسون کی رہائش گاہ پر پہنچ کر کچھ دیر آرام کیا۔ پرنس عمر طوسون خود اسکندریہ میں موجود نہ تھے۔ لیکن مہمانوں کی دیکھ بھال کا سارا انتظام انھی کا تھا۔ آرام کرنے کے بعد اقبال نے اسکندریہ شہر کی سیر کی۔ شبان المسلمین کے دفتر میں گئے۔ بعض اہل علم سے ملے اور اخباروں کے لیے انٹرویو دیا۔ پھر تین بجے بذریعہ ریل قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے اور چھ بجے شام قاہرہ پہنچے۔ اسٹیشن پر شبان المسلمین کے ارکان، چند ممبر پارلیمنٹ، اخبارات ورسائل کے مدیر، قاہرہ میں مقیم ہندوستانی مسلمان اور جامعہ ازہر کے ہندوستانی طلبہ ان کے استقبال کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ قاہرہ میں اقبال کا قیام میٹروپولیٹن ہوٹل میں تھا۔ لیکن اس رات کا کھانا انھوں نے ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے ممبر پارلیمنٹ کے ہاں کھایا، جہاں شیخ الازہر مفتیٔ ازہر محمد علی پاشا، سابق وزیر اوقاف اور دیگر اکابرین سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اخباری نمائندوں نے اقبال کو شبانِ مصر کے لیے کوئی پیغام دینے کو کہا، فرمایا کہ نوجوانانِ مصر سے میری آرزو ہے کہ پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وفادار رہیں۔ رات کے گیارہ بجے واپس ہوٹل آئے۔

اقبال نے محسوس کیا کہ مصر میں عام تاثّر یہی ہے کہ ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی میں مسلمان روڑے اٹکا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے قیام کے دوران اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور مصری صحافیوں کو ہندی مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت یا ان کے سیاسی مؤقف سے آگاہ کیا۔ مصر کی کئی اہم علمی شخصیتیں اقبال کی آمد کی منتظر تھیں۔ چنانچہ ان میں سے مشہور وکیل اور فلسفے پر متعدد کتب کے مصنف لطفی بے جمعہ نے قاہرہ میں اپنا بیشتر وقت اقبال کے ساتھ گزارا۔

۲؍دسمبر۱۹۳۱ء کی صبح کو محمد صدیق ناڑو، محمود احمد عرفانی اور ماسٹر امام دین کار میں اقبال کو آثارِ قدیمہ کی سیر کرانے لے گئے۔ انھوں نے قاہرہ سے دس میل کے فاصلے پر اہرامِ مصر کی سیر کی، دریائے نیل کے کنارے خوبصورت باغات میں گھومے۔ یہاں کئی نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ جنہیں دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ اہرامِ اکبر، اہرامِ اوسط اور اہرامِ اصغر دیکھے۔ اہرام سے کچھ فاصلے پر ابوالہول دیکھا۔ واپسی پر قصر العینی گئے۔ یہ ایک بہت بڑا ہسپتال ہے جو علاّمہ بدرالدین عینی کے نام سے موسوم ہے اس علاقے کے بازاروں میں پھرے۔ دوپہر کا کھانا شام کے تاجر محی الدین الحصنی کے مکان پر کھایا جہاں وہ شام میں فرانسیسی استعمار کے خلاف برسوں جہاد کرنے والے شامی مجاہد ڈاکٹر عبدالرحمٰن شہبندر سے ملے۔ ڈاکٹر شہبندر کو اقبال نے ہندوستان کے صحیح حالات سے روشناس کرایا۔ بعد ازاں عرب ممالک کے حالات اور عربوں کے مستقبل کے مسائل زیرِ بحث آئے۔ ساڑھے تین بجے واپس ہوٹل پہنچے جہاں کئی حضرات کو منتظر پایا اور اُن سے ملاقات کی گئی۔

سیّد ابوالعزائم اور دیگر اہلِ علم سے ملاقاتیں

اسی دوران اقبال سے ملاقات کے لیے مصر کے مشہور صاحبِ طریقت بزرگ سیّد محمد ماضی ابوالعزائم اپنے دو صاحبزادوں کے ساتھ تشریف لائے۔ اقبال انہیں یوں ہوٹل میں دیکھ کر سخت پریشان ہوئے۔ کہا کہ حضرت آپ نے تکلیف کیوں کی، مَیں خود زیارت کے لیے حاضر ہو جاتا۔ انھوں نے فرمایا:

خواجۂ دوجہاں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک کیا ہو اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ لہٰذا میں اس ارشاد کی تعمیل میں چلا آیا ہوں تاکہ میرے آقا مجھ سے خوش ہوں۔ اقبال اُن کی بات سُن کر بیتاب ہو گئے اور انہیں چپ سی لگ گئی۔ سید ابوالعزائم دیر تک بیٹھے نصیحتیں کرتے رہے اور اقبال خاموشی سے سنتے رہے۔ جب وہ چلے گئے تو اقبال سے نہ رہا گیا آنسوؤں کا سیلاب بے اختیار آنکھوں سے بہہ نکلا۔ غلام رسول مہر سے فرمایا:

> ''ایسا زمانہ بھی آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گناہ گار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجۂ دو جہاں ﷺ کے ارشاد کے اتباع میں آپ ﷺ کی خوشنودی کے لیے ملنے آتے ہیں''۔

۳رد سمبر ۱۹۳۱ء کو دوپہر کے کھانے کی دعوت مرزا مہدی بے ایرانی کے ہاں تھی۔ مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی، شیخ از ہر اور دیگر اصحاب بھی مدعو تھے۔ چار بجے انھوں نے احمد ذکی پاشا کے گھر چائے پارٹی میں شرکت کی۔ پانچ بجے محمود پاشا عبدلرزاق کے یہاں تشریف لے گئے جہاں محمود پاشا رئیس حزب الاحرار، محمد علی پاشا، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مدیر ''السیاستہ'' اور دیگر اہل علم سے ملاقات ہوئی۔ اُسی شام سیّد ابوالعزائم کے فرزند کار لے کر پہنچ گئے اور بتایا کہ ان کے والد نے یاد فرمایا ہے۔ سو اقبال وہاں سے سید ابوالعزائم کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہاں اُن کے مریدوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سید ابوالعزائم نے معمول کے مطابق اپنے ناصحانہ انداز میں کہا کہ جب سب مسلمانوں کی تعداد صرف چند لاکھ تھی تو دنیا کی عظیم سلطنتیں ان کے قدم چومتی تھیں اور آج جب وہ چالیس کروڑ ہیں، تو ہر جگہ کفار ان پر مسلّط ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا۔ اور اس کی رُوح سے کنارہ کش ہو گئے۔ پھر اقبال کے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''اس دل میں اسلام کی محبت اور رسول ﷺ کی خاص شیفتگی نظر آتی ہے''۔

سیّد ابوالعزائم کے اشارے پر ایک مرید نہایت دلکش مصری لہجے میں سورۃ الفتح سنانے لگا۔ جب اقبال جانے کے لیے اٹھے تو سید ابوالعزائم کے مریدوں نے حضرتِ اقبال زندہ باد کے نعروں سے انہیں رخصت کیا۔ کچھ دیر کے بعد پروفیسر علی بے عبدالرزاق ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے اپنی کسی تصنیف میں مذہب اور سیاست کی علیٰحدگی کے مسئلے پر بحث کی تھی۔ جس پر علمائے ازہر نے ان کے خلاف فتوٰی دے رکھا تھا۔ اقبال نے انہیں اس مسئلے پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا اور ایسی علیحدگی کے نقصانات کی تفصیل بیان کی۔ اسی دوران مصطفٰے نحاس پاشا رئیس حزب الوفد کا ٹیلی فون آیا کہ وہ اقبال کے منتظر ہیں۔ چنانچہ اقبال انہیں ملنے کے لیے بیت الامہ چلے گئے۔ ''وفد پارٹی'' کے دیگر ارکان اور نحاس وزارت کے چند وزراء سے اقبال کا تعارف کرایا گیا۔ گفتگو زیادہ تر مصری اور ہندوستانی سیاست کے متعلق ہوئی۔ بعد ازاں اقبال، احمد ذکی پاشا شیخ العروبہ کے مکان پر گئے جو دریائے نیل کے کنارے واقع تھا اور رات کا کھانا اُن کے ساتھ کھایا۔ گفتگو مسئلہ فلسطین اور مؤتمرِ اسلامی کو کامیاب بنانے کے بارے میں ہوئی۔

قاہرہ کی سیاحت اور جامعہ ازہر میں حاضری

۴؍دسمبر۱۹۳۱ءکو اقبال قاہرہ کا میوزیم دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ پہلے فراعنہ کے عہد کے آثار اور توت اخ آمون کے مقبرے سے برآمد کردہ نوادر دیکھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کے فرعون کی، جو سمندر میں غرق ہوا تھا، لاش کی ممی بھی موجود تھی۔ لیکن قبطیوں کے اعتراض کے پیشِ نظر ان ایّام میں اس کی نمائش نہ کی گئی تھی۔ پھر عربی دور کے میوزیم کو دیکھنے کے لیے گئے، جس میں اسلامی تمدن کی یادگاریں موجود تھیں۔ اِن نوادر میں امام غزالی کا قلمدان اور عثمانی سلاطین محمد فاتح، سلیمان اعظم اور سلیم یلدرم کی شمشیریں بھی تھیں۔ میوزیم سے واپس آکر چار بجے شام جمعیۃ الرابطہ الہندیہ کی طرف سے چائے کی پارٹی میں شریک ہوئے۔ تقریب میں صدیق محمد ناڑو اور محمود احمد عرفانی نے اقبال کو سپاسنامہ پیش کیا اور لطفی بے جمعہ اور منیر الحضی نے خطاب کیا، اقبال نے اپنی جوابی تقریر میں اراکینِ جمعیت کا شکریہ ادا کیا۔ اور مصر و ہندوستان کے مابین تعلقات کو مضبوط بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بعد میں سات بجے شبان المسلمین کے ارکان سے خطاب کرنے کے لیے شبان المسلمین کے دفتر پہنچے۔ ہال اہلِ علم سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اقبال کی تقریر انگریزی میں تھی۔ رات کے کھانے کی دعوت محمد علی پاشا کے ہاں تھی۔ اقبال نے اُن سے مختلف موضوعات پر گفتگو کی جن میں مسئلہ سود، قرونِ اولیٰ کی اسلامی فتوحات، دورِ جدید میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ہندوستان کی سیاسیات نمایاں تھی۔

۵؍دسمبر۱۹۳۱ءکی صبح کو سید ابوالعزائم نے اپنی کار مع ڈرائیور بھیج دی تاکہ اقبال فسطاط (مصر کا قدیم اسلامی دارالخلافہ) دیکھ آئیں۔ اس شہر کو مشہور مسلمان سپہ سالار حضرت عمرو بن العاصؓ نے آباد کیا تھا۔ اقبال اور غلام رسول مہر، شیخ محمود احمد عرفانی کی معیت میں فسطاط پہنچے اور سب سے پہلے جامع عمرو ابن العاص دیکھی۔ اس مسجد میں ایک مقام پر صحابہ کرامؓ میں سے کسی ایک بزرگ ہستی نے نماز ادا کی تھی جس کے سبب لوگوں نے اس جگہ کو چاٹ چاٹ کر گڑھے بنادیے تھے۔ مسجد کے صرف دوستون سلامت رہ گئے تھے مگر چونکہ بعض ضعیف الاعتقاد لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مسجد کے باقی تمام ستونوں نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن یہ دوستون

کافر رہ گئے اس لیے نماز کے بعد نمازی ان ستونوں کو جوتے لگایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حکومت مصر کو ان کی حفاظت کے لیے آہنی جنگلا لگانا پڑا۔ مسجد کے شمال میں عیسائی بادشاہوں کے محلوں یا گرجوں کے کھنڈر تھے۔ اور جنوب میں فسطاط شہر آباد تھا۔ گو اب وہ کھنڈر ہی کی صورت میں باقی ہے۔ فسطاط سے کچھ فاصلے پر پرانے قبرستان میں مملوک سلاطین اور خدیو خاندان کے افراد کی قبریں تھیں۔ اقبال نے قبروں پر فاتحہ پڑھی اور پھر امام شافعی کے مزار پر پہنچے۔ مزار مربع کمرے پر قُبہّ کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ دیواروں پر نقش و نگار تھے۔ تربت زمین سے تقریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ اور اس پر سبز غلاف چڑھا ہوا تھا۔ اردگرد جالی لگی تھی۔ اقبال جالی کے باہر بیٹھ گئے۔ اور دیر تک قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے رہے۔ ''اسرارِ خودی'' میں الوقت سیف کے تحت امام شافعی کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

سبز بادا خاکِ پاکِ شافعی
عالمے سر خوش زتاکِ شافعی
فکر او کوکب ز گردوں چیدہ است
سیفِ براں وقت را نامیدہ است

(امام شافعی کی خاک پاک سبز ہو یعنی رحمت کی بارش سے اُن کی تُربت ٹھنڈی رہے۔ ایک دنیا امام موصوف کے انگور کا رس پی کر مست و سرخروش ہے۔ اُن کی فکر نے آسمان سے تارے توڑے ہیں۔ انھوں نے وقت کو کاٹنے والی تلوار قرار دیا۔)

بعد ازاں بانیٔ خاندان خدیو کے قلعے اور تاریخی مساجد کی زیارت کرتے ہوئے جامعہ ازہر پہنچے۔ جامعہ ازہر کے منتظم محمد خالد حسنین بے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ اقبال نے کچھ دیر طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر تفسیر، حدیث، اور منطق کے درس سُنے۔ جامعہ کا نیا حصّہ بھی دیکھا جہاں طلبہ کو علوم جدیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نیز طبعیات، کیمیا وغیرہ کے شعبوں کا معائنہ کیا۔

جامعہ کے ایک استاد نے اقبال کی شان میں قصیدہ لکھ کر رکھا تھا۔ جو انہیں پڑھ کر سنایا گیا۔ اس پر تمام طلبہ نے ''دکتور اقبال زندہ باد'' اور ''شاعرِ ہندی زندہ باد'' کے نعرے لگائے۔ پھر اقبال، شیخ الازہر شیخ مصطفیٰ المراغی سے ملنے گئے جو اپنے دفتر میں اُن کے منتظر تھے۔ اقبال

نے جامعہ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ راستہ وہی ہے گو قافلہ بدل گیا ہے۔اس لیے اگر آپ موجودہ قافلے کی، وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق ضروریات کا خیال نہ کریں گے، تو مقصد کی تحصیل میں ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ جامعہ از ہر سے ماسٹر محمد رمضان کے گھر آئے اور کھانا کھایا (ماسٹر صاحب گوجرانوالہ کے باشندے تھے اور قاہرہ/اسماعیلیہ میں فوج کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔آپ کے ایک بھائی بھی بیت المقدس میں رہتے تھے)۔ پھر سیّد ابوالعزائم کے مکان پر پہنچے اور کچھ دیر اُن کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ بعدازاں ہوٹل پہنچ کر سامان ریلوے اسٹیشن بھجوایا اور خود ڈاکٹر شہبندر کے ہاں چائے کی دعوت میں شرکت کے لیے گئے۔ یہاں کئی شامی مجاہدین اُن سے ملاقات کے منتظر تھے۔ نیز احمد ذکی پاشا، علی بے عبدالرزاق لطفی بے جمعہ، ڈاکٹر منصور فہمی، منیر الحضی، احمد جمال پاشا الغزی وغیرہ اصحاب بھی موجود تھے۔ چائے سے فراغت کے بعد سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ اسٹیشن پر کئی مصری اور ہندوستانی اصحاب انہیں الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ پورے چھ بجے ریل فلسطین کے لیے روانہ ہوئی۔اور اقبال مصر کی محبت وشفقت کا ایک انمٹ نقش اپنے دل میں لے کر رخصت ہو گئے۔

سفرِ فلسطین

اقبال اور غلام رسول مہر کی ٹرین بہنا، رزقازق اور اسماعیلیہ میں ٹھہرتی ہوئی تین گھنٹوں کے بعد قنطرہ پہنچی۔ اسمٰعیلیہ کے اسٹیشن پر ہندی مسلمانوں کا ایک گروہ اقبال کے خیر مقدم کے لیے موجود تھا۔قنطرہ کے مقام پر ٹرین بدلنا پڑی۔ جب گاڑی چلی تو انھوں نے زندہ باد کے نعروں سے اقبال کو رخصت کیا۔ یہاں سے گاڑی خان یونس، غزہ اور مجدل کے ریگستانی علاقے سے گزر کر لد پہنچی۔ لد میں انھوں نے پھر ٹرین بدلی اور اب گاڑی بحر روم کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے فلسطین کے پہاڑی علاقہ کی طرف مڑ گئی۔

بیت المقدس کئی مرتبہ برباد اور کئی مرتبہ آباد ہوا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جس کے لیے اس قدر خون بہایا گیا ہو، جتنا القدس کے لیے بہایا گیا۔شاید ہی کوئی شہر اتنی مرتبہ بنا اور بگڑا ہو، اس لیے شہر کی حدود معلوم کرنا دشوار تھا۔ کھدائی سے تین فصیلوں کے آثار نکلے تھے۔ چوتھی فصیل سلیمان اعظم نے تعمیر کرائی تھی۔ اس فصیل کا بیشتر حصہ پہلی دو فصیلوں پر مبنی تھا۔ اصل شہر

اس کے اندر واقع تھا جو چار مختلف پہاڑیوں کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ ان میں سے ایک پہاڑی یعنی جبل مریا پر حرمِ مقدس واقع تھا۔ شہر کے مشرق میں جبلِ زیتون تھی، جہاں عام روایت کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے پہاڑی پر مشہور وعظ فرمایا تھا، جسے پہاڑی کا وعظ کہا جاتا ہے۔

اقبال اور مہر کو فلسطین پہنچ کر عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان بے پناہ کشیدگی اور عدم رواداری کا علم ہوا۔ بیت اللحم میں ان عیسائی فرقوں کی جنگ اپنے عروج پر تھی۔ کنیسۂ مولد کے اندر انھوں نے سپاہی کھڑے دیکھے تو پوچھا کہ یہ کیوں متعیّن ہیں؟ اس وقت معلوم ہوا کہ مختلف فرقے آپس میں بُری طرح لڑتے رہتے تھے، اس لیے قیامِ امن کے لیے سپاہی متعیّن کر دیے گئے تھے۔ ہر فرقے کے لیے اس مقام پر الگ الگ دائرے بنا دیے گئے تھے۔ دیواروں پر ان دوائر کے نشان تھے۔ کوئی ایک فرقہ دوسرے دائرے میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ سپاہی ایک فرقے کو دوسرے کے دائرے میں جانے سے روکتا تھا۔ نیز پہلے ہر فرقہ دوسرے فرقے کے دائرے میں غلاظت پھینک دیتا تھا، سپاہی یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ نہ پیش آئے۔

۶ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح ساڑھے نو بجے اقبال بیت المقدس (یروشلم) پہنچے۔ بارش جاری تھی۔ اسٹیشن پر اُن کے استقبال کے لیے مفتی سیّد امین الحسینی، مولانا شوکت علی اور مؤتمرِ اسلامی کے منتظمین موجود تھے۔ مؤتمرِ اسلامی کے اجلاس حرمِ مقدّس کے متصل روضۃ المعارف کی عمارت میں منعقد ہو رہے تھے۔ اس لیے مندوبین کو اس کے قریب ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا۔ بعض پیلس ہوٹل (فندق بلاس) میں مقیم ہوئے۔ بعض جن میں مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی اور رؤف پاشا شامل تھے، روضۃ المعارف ہی میں ٹھہرے۔ اقبال اور غلام رسول مہر کا قیام گرینڈ ہوٹل (فندق مرقص) میں تھا۔ ۶ر دسمبر ۱۹۳۱ء تک بیشتر مندوب بیت المقدس پہنچ گئے تھے۔ یہ مؤتمر مفتی سیّد امین الحسینی اور ان کے رفقاء کی طرف سے اتحادِ اسلامی کے نصب العین کی خاطر منعقد کی گئی تھی اور اس کی دعوت کسی اسلامی حکومت نے نہ دی تھی۔ اس مؤتمر میں بیشتر اسلامی ممالک اور تقریباً ہر اہم اسلامی خطے کے نمائندوں نے شرکت کی۔

مراکش، ریف، الجزائر، تونس، نائجیریا، سوڈان، مصر، طرابلس، شام، عراق، شرق اردن، فلسطین، حجاز، یمن، حضر موت، ایران، ترکی، چینی ترکستان، روسی ترکستان، بخارا، قفقاز، ایرال، اورال، یوگوسلاویہ، ہندوستان، سیلون اور جاوا کے مسلم نمائندے شرکت کے لیے جمع

ہوئے تھے۔ ان میں اربابِ علم، اہلِ سیاست اور بزرگانِ دین بھی تھے اور مجاہدینِ حریّت بھی۔

مؤتمر کا تعارفی اجلاس ۶/دسمبر ۱۹۳۱ء کو شام چار بجے روضۃ المعارف کے وسیع و عریض ہال میں ہوا۔ اس وقت خوب بارش ہو رہی تھی۔ اجلاس کی کاروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ جس میں مندوبین کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا گیا۔ کاروائی کے اختتام پر دیگر مندوبین کے ساتھ اقبال بھی رضا کاروں کی معیّت میں مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ رضا کار مل کر عربی زبان میں قومی نغمے گاتے رہے۔ رستے میں مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر اقبال رک گئے۔ محمد علی جوہر، اقبال کے بہت قدر شناسوں میں تھے دونوں احباب ایک دوسرے سے بہت بلا تکلّف اور ہلکے پھلکے مزاح کے انداز میں تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جوہر، اقبال کے ہاں حاضر ہوئے تو سردیوں کے دن تھے، اقبال بستر پہ رضائی لیے حُقے کے کش لگا رہے تھے۔ جوہر نے اقبال کو کہا کہ ظالم ہم تیرے اشعار پڑھ پڑھ کر جیل کی ہوا کھا رہے ہیں اور تُو اِدھر بیٹھا مزے سے حُقے کے کش لگا رہا ہے۔ اقبال نے برجستہ جواب دیا ''مَیں قوم کا قوّال ہوں اور اگر قوّال ہی حال میں چلا جائے تو قوّالی کیسے جاری رہے گی''۔ پھر ۳۰/دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے اسیران جب رہا ہوئے تو محمد علی جوہر اور شوکت علی کے اعزاز میں مسلم لیگ نے پُر وقار تقریب منعقد کی۔ علّامہ اقبال سٹیج پر مولانا جوہر سے بغل گیر ہوئے اور انھوں نے علی برادران کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی وہ نظم سُنائی جو بعد میں ''اسیری'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے آخری دو اشعار یوں ہیں۔

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

آخری مصرع میں محمد علی جوہر اور شوکت علی کو کس قدر خوبصورت انداز میں شہباز اور شاہین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو اقبال کی شاعری کے بہترین استعارے ہیں۔ فلسطین میں آرام گاہِ جوہر پہ فاتحہ خوانی کی۔ (۴/جنوری ۱۹۳۱ء کو وہ شخص کہ جس کا دل نپولین کا، زبان برک کی اور قلم میکالے کا تھا۔ لندن میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے دوران مر گیا اور مفتیِ اعظم فلسطین

کے کہنے پر بیت المقدس میں دفن کیا گیا)۔علاّمہ کا مرثیہ جوہر کی عظمت کو ایک ابدی خراجِ تحسین کی حیثیت رکھتا ہے۔ان اشعار کی شرح کی جائے تو جوہر کی سیرت سامنے آ جاتی ہے۔

یک نفس جانِ نزارِ اُو تپید اندر فرنگ تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں درگزشت
اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گزشت
خاکِ قدس اُو را بہ آغوشِ تمنا در گرفت سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت
می نگنجد جز بآں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست بندہ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت
جلوۂ اُو تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگا خاور از خاور گزشت

ترجمہ:

اس کی کمزور جان نے ایک سانس دیارِ مغرب میں لی
پلک جھپکتے میں ستاروں سے آگے نکل گیا
خوشا اُس کا مشتِ غبار کہ حرم کی کشش میں
اندلس سے لے کر بربر کے ساحل تک چلا گیا
بیت المقدس کی خاک نے اسے آغوشِ تمنا میں سمیٹ لیا
آسمان کی جانب اسی راہ سے گئے جہاں سے پیغمبر گئے تھے
اس خاک کے سوا کہیں سمائی نہ ہوئی جو رنگ و بو سے پاک ہے
وہ بندہ جو کالے، گورے کی تمیز سے اوپر اُٹھ گیا
ایشیا کی نگاہ میں اس کا جلوہ ابد تک باقی ہے
اگرچہ مشرق کی آنکھ کا یہ نور مشرق سے رخصت ہو چکا

مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر حاضری کے بعد اقبال مسجدِ اقصیٰ روانہ ہوئے اور مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔نماز کے بعد مسجدِ اقصیٰ میں محفل اسراء منعقد ہوئی جس میں قرآنِ کریم کی تلاوت اور نعت خوانی کی گئی، چند اصحاب نے آیات اسراء کی تفسیر بیان کی۔محفل کے اختتام تک نمازِ عشاء کا وقت ہو گیا تھا اور مسجد اس وقت پوری طرح بھر چکی تھی۔سب نے نمازِ عشاء پڑھی۔ فراغت کے بعد مفتی سید امین الحسینی نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھتے ہوئے فرمایا:

اس مؤتمر کے انعقاد کا مقصد ہے کہ ہم کسی امت یا دین کو فتح کرنا چاہتے ہیں نہ ہی ہم کسی سے مخاصمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان یک جان اور یک آہنگ ہوکر اپنے مصالح کے لیے جدوجہد کریں۔ بعدازاں انھوں نے مؤتمر کے مقاصد کی تفصیل یوں بیان کی:

۱- مسلمانوں کے اتحاد وتعاون کے لیے جدوجہد

۲- صحیح اسلامی اخوت کی نشوونما

۳- مسلمانوں کو اجتماعی اسلامی فرائض کی طرف متوجہ کرنا، اور

۴- دین اسلام کو عوارض سے بچانا، عقائد کو الحاد سے محفوظ رکھنا اور اسلامی تمدّن کی اشاعت کرنا۔

ان کے بعد اقبال سمیت بعض مندوبین نے مختصر تقاریر کیں اور داعیان مؤتمر کی مساعی کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں مصر کے ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے نے اس بابرکت مقام (مسجد اقصیٰ) کے پیش نظر اراکین سے التماس کی کہ سب کھڑے ہوکر اللہ سے عہد کریں کہ وہ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ اس پر سب نے کھڑے ہوکر عہد کیا اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے رات تقریباً دس بجے یہ تقریب ختم ہوئی۔

۷/دسمبر ۱۹۳۱ء کو مؤتمر کا اجلاس شروع ہوا۔ صدر اور سیکرٹریوں کے انتخاب کے لیے اہل عرب کے اصول پر عمل کیا گیا۔ یعنی مجمع میں سب سے معمر شخص صدر منتخب ہوئے۔ اور سب سے کم عمر دو مندوب، سیکرٹریوں کے طور پر چنے گئے۔ مفتی سید امین الحسینی کو مستقل صدر کی حیثیت سے اتفاق رائے سے منتخب کیا گیا۔ اقبال، محمد علی پاشا (مصر) سیّد ضیاء الدین طباطبائی (ایران) اور سیّد محمد زبارہ (یمن) نائب صدر منتخب ہوئے۔ پھر سیکرٹریوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ انتخابات سے فراغت کے بعد دنیائے اسلام سے مبارک باد کے تار اور پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی بلکہ ایک مصری اخبار نویس کا کہنا تھا کہ ایک ہزار تار اور مکتوب مؤتمر کی تائید میں آئے تھے۔ دورانِ مؤتمر ہر جلسے کے آغاز میں پندرہ منٹ ان مکاتیب اور تاروں کے لیے مخصوص تھے۔ بعض خط پورے پڑھے جاتے اور اکثر کے سلسلے میں محض مرسل کا نام بتا دیا جاتا۔ یہ مکاتیب اور تار دنیا کے ہر خطے سے آئے تھے۔ ان میں بادشاہوں، علماء وفضلاء، مختلف

جماعتوں کے عہدے داروں، اور صاحبانِ جاہ و مرتبہ کے خطوط تھے۔ ان میں سے بعض اشخاص کے ناموں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس لیے یہ نام درجِ ذیل ہیں:

امیر فیصل (عراق) امیر عبداللہ (شرقِ اردن) سلطان ابنِ سعود، فواد بے حمزہ (وزیر خارجہ نجد و حجاز) یوسف یاسین متشار، پرنس عمر طوسون پاشا (مصر) احمد زکی پاشا (مصر) مصطفیٰ نحاس پاشا (رئیس حزب الوفد مصر) محمد محمود پاشا (رئیس حزب الاحرار مصر) عباس حلمی پاشا (مصر کے سابق وزیر) ابراہیم یحییٰ پاشا (رئیس مجلس الشیوخ مصر) جمعیتہ التاتاریہ، وارسا کے مہاجر مسلمان، اورال کے مہاجر مسلمان، رئیس الوزراء شرقِ اردن، محمد نجاتی بک عضو المجلس التشریعی رکنِ مجلسِ قانون ساز قبرص، امیر علی (شریف حسین کا بیٹا اور سابق شاہِ حجاز) جمعیتہ الاخوان المسلمین نیویارک، شیخ حافظ لطیف خطیب جامع مسجد رومانیہ، مسلمانانِ برلن، رئیسِ مجلس الاعیان (ہاؤس آف لارڈز) عراق، امیر شکیب ارسلان، اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال، امیر امین ارسلان سلطان الحج، احسان بک الجابری، بوسنیا کے مسلمان، فلسطین کے آرتھوڈوکس یہودی، مراکش الجزائر اور تونس سے بہت سے خطوط اور تار آئے۔

بعد ازاں مولانا شوکت علی کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے سات کمیٹیوں کا تقرر ہوا، جنھیں خصوصی مسائل کے بارے میں رپورٹیں اور قراردادیں ترتیب دینے کی ہدایات کی گئیں۔ وہ کمیٹیاں یہ تھیں۔ حجاز ریلوے کمیٹی، مسجدِ اقصیٰ کمیٹی، نشر و اشاعت کمیٹی، تبلیغِ دین کمیٹی، اماکن المقدسہ کمیٹی، قانونِ اساسی کمیٹی اور مالی کمیٹی۔

مشہور مؤرخ جارج انٹونیس ان دنوں بیت المقدس میں تھے اور انھوں نے مؤتمرِ اسلامی کے انعقاد میں عملی حصہ لیا۔ آپ دن میں دو چار مرتبہ مؤتمرِ میں تشریف لاتے۔ ایک روز انھوں نے دوپہر کے کھانے پر اقبال، سیّد ضیاء الدین طباطبائی، استاد عبدالرحمٰن عزام، حسن خالد پاشا طباطبائی، محمد روشن اختر اور مہر کو بلایا لیکن آپ حضرات کو دوسرے روز ''شونہ'' جانا تھا اس لیے آخری وقت میں معذرت کرنی پڑی۔ ایک روز فرصت دیکھ کر انھوں نے پھر دعوت دی اور پُر تکلّف کھانا کھلایا۔

انگریز حکومت صہیونیوں کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ ان کی بے پناہ تنظیم اور دولت کی وجہ سے مقامی غریب مسلمان مقابلے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ یورپی یہودی منہ مانگے داموں عربوں کی زمینیں اور جائیدادیں خرید رہے تھے۔ تل ابیب تو خالصتاً یہودی شہر بن چکا تھا۔ عمارتوں سے

عبرانی طرزِ تعمیر نمایاں تھا۔ یہ جدید شہر یورپی یہودیوں کے سرمائے سے تعمیر ہوا تھا۔

فلسطین کی کل آبادی ۱۵۴،۰۳۵،۰ تھی۔ ۱۹۳۱ء میں مختلف اقوام کی آبادی اس طرح تھی۔ مسلمان ۷۵۹،۹۵۳۔ عیسائی ۹۰،۶۰۷۔ یہود ۵۰۰،۱۷ جبکہ باقی دوسری اقوام تھیں۔ بیت المقدس کی آبادی اس وقت ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ جس میں ۵۱ یا ۵۲ ہزار یہودی تھے، باقی عیسائی اور مسلمان تھے۔ یہودیوں نے ایک خاص حکمت عملی کے تحت ساحلی مقامات اور اہم مراکز پر قبضہ جمانا شروع کیا تھا۔ یافہ کی بندرگاہ پر اُن کا تسلّط تھا۔ ملک کی تجارت اور زراعت پر صیہونی انگریوں کی مدد سے تیزی سے چھا رہے تھے۔ صیہونیوں نے مؤتمر کی بھرپور مخالفت کی لیکن مفتی سیّد امین الحسینی کے عزم اور مقامی مسلمانوں کے خلوص اور تعاون کی وجہ سے یہ مؤتمر کامیاب ہو کر رہی۔

اقبال نے مؤتمر کے اجلاسوں میں ۷؍دسمبر ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۴؍دسمبر ۱۹۳۱ء تک شرکت کی اور اس دوران میں پانچ کمیٹیوں کی رپورٹوں یا پیش کردہ قراردادوں پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مثلاً حجاز ریلوے کمیٹی کی سفارش تھی کہ حجاز ریلوے وقفِ اسلامی ہے اور اسے مختلف غیر اسلامی حکومتوں کے قبضے سے نکال کر ایک بین الاقوامی مسلم مجلسِ انتظامیہ کی تحویل میں لانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ مسجدِ اقصیٰ کمیٹی کی سفارش تھی کہ بیت المقدس میں تعلیم کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جو تمام عالمِ اسلام کے مسلم طلبہ کو غیر ملکی یونیورسٹیوں سے بے نیاز کر دے۔ اقبال ایسی قدیم طرز کی یونیورسٹی کے قیام کے خلاف تھے جس میں صرف علومِ دینیہ کی تعلیم دی جائے۔ ان کی رائے میں ایسی یونیورسٹی میں جدید و قدیم دونوں قسم کے علوم کی دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق تعلیم دینا ضروری تھا۔ دوم، ان کے خیال میں تجویز نا قابلِ عمل تھی کیونکہ یہ توقع نہ رکھی جاسکتی تھی کہ عالمِ اسلام کے تمام مسلم طلبہ تعلیم کی خاطر صرف اس یونیورسٹی کی طرف رجوع کریں گے۔ سوان کی نظر میں تعلیمی اعتبار سے بیت المقدس کو وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو مدینہ منورہ، قاہرہ، تہران اور دمشق کو حاصل تھی۔ نیز بیت المقدس میں صیہونی خطرہ بھی تھا جو شہر کے امن و سکون کو ختم کر سکتا تھا۔

مؤتمرِ میں اسلامی اخوت کا عملی مظاہرہ ہوا اور کوشش کی گئی کہ مسلمان فقہی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر ایک ہو جائیں۔ ۱۱؍دسمبر ۱۹۳۱ء کو بیت المقدس میں جمعہ کی نماز عراق کے ایک شیعہ عالم کی

امامت میں پڑھی گئی۔اس نماز میں مندوبین کے علاوہ فلسطینی شیعہ اور سنی بھی شریک ہوئے تھے۔

اقبال نے ۱۴/دسمبر ۱۹۳۱ء کو عصر کے وقت انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔''مجھے افسوس ہے کہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے کانفرنس کے اختتام تک نہیں رہ سکتا لیکن میری یہ آرزو ہے کہ اس سرزمینِ انبیاء اور مقاماتِ مقدّسہ کی دوبارہ زیارت کروں آج کل اسلام کو دو بڑے خطرات گھیرے ہوئے ہیں۔ایک کیمونزم اور دوسرے وطن وقوم پرستی۔مَیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ ہم دل سے مسلمان ہوں میں اسلام کے دشمنوں سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں سے خوفزدہ ہوں'' ایرانی وفد کے سربراہ آقا ضیاء الدین طباطبائی (یادرہے علاّمہ طباطبائی نوزبانوں کے ماہر تھے اور یہ ایران کے وزیرِاعظم بھی رہے) نے علاّمہ کی تقریر کا عربی میں ترجمہ کیا وہ کہتے ہیں جب علاّمہ نے فی البدیہ تین فارسی کے اشعار پڑھے تو سامعین پر ایک نشہ طاری ہو گیا اور یہ آبدار اشعار دل میں ایسے پیوست ہوئے کہ ان کا ترجمہ میرے لیے (جو خود فارسی زبان دان تھا) مشکل ہو گیا۔علاّمہ نے ''پیامِ مشرق'' سے یہ اشعار پڑھے:

طارق چو برکنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند! کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دُوریم از سوادِ وطن باز چوُں رسیم
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر مُلک مُلکِ ماست کہ مِلک خدائے ماست

(طارق نے جب اندلس کے کنارے اپنی کشتیاں جلائیں تو لوگوں نے کہا کہ عقل کی نظر سے یہ غلط کام ہے،ہم وطن سے دُور ہیں اور شریعت میں اسباب چھوڑنا جائز بھی نہیں۔طارق مسکرایا اور شمشیر پہ ہاتھ رکھ کر کہا کہ دُنیا کا ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا کی ملکیّت ہے۔)

علاّمہ اقبال نے اپنے قیام کے دوران میں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے علاوہ فلسطین کا یتیم خانہ،حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش دیکھی اور فلسطین کے اکابرین سے ملاقاتیں کیں۔علاّمہ نے فلسطینی نوجوانوں کو خدا،رسول اور خودی کو رہنما بنانے کی تلقین کی۔

علامہ فرماتے ہیں:

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سُنا ہے مَیں نے، غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے!

اقبال نے اپنی شہرۂ آفاق نظم ''ذوق وشوق'' کے اکثر اشعار فلسطین میں قلمبند کیے اقبال کے پورے کلام میں یہ نظم ایک خاص اہمیّت کی حامل ہے۔ مسلمانوں نے وہ ضابطۂ حیات چھوڑا جس پر چل کر سنجر وسلیم جیسے عظیم فرمانروا تاریخ میں اپنا نام چھوڑ گئے۔ اقبال نے اپنی اس نظم میں خاص طور سے ''سنجر وسلیم'' اور ''جنید و بایزید'' کا حوالہ دیا ہے:

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

اِن مسلم حکمرانوں کا جاہ وجلال اور بزرگوں کا فقر اور اخلاقی برتری اسلام کی عالمگیریت اور حضور اکرم خاتم النبین ﷺ کے جلال و جمال کا مظہر ہے۔ مسلمانوں کو فلسطین کے ساتھ ایک خاص انس ونسبت ہے۔ فلسطین انبیاء کی مقدس سرزمین ہے اور یہیں سے حضورؐ سفرِ معراج پر روانہ ہوئے تھے۔ اس لیے وہاں پہنچ کر جو جذبات اقبال کے ہوئے، ہر سچے مسلمان کے یہاں اُن جذبات کا پیدا ہونا یقینی امر تھا۔ یہاں اقبال کے سامنے تمام پردے اٹھ گئے اور انھوں نے اپنے آپ کو تاریخ کے اس دور میں محسوس کیا اور اسی پس منظر میں انھوں نے مسلمانوں کے موجودہ معاملات کو پیش کیا اور ان کے مسائل کی پوری عکاسی کی ہے۔ اس نظم میں مسلمانوں کے لیے ایک پیام بھی ہے۔ اس سے ان میں ذوقِ یقین پیدا ہوتا ہے اور یہ وقت کی اہم ضرورت ہے، اس کے بغیر زندگی کا قافلہ جمود کا شکار ہو جاتا ہے اور منزل اس سے دور ہو جاتی ہے۔ اقبال نے ''ذوق وشوق'' کے اشاروں میں زندگی کے اسی تصوّر کو عملی شکل دینے کی کوشش کی ہے اور گویا یہ اُن کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے جو اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اقبال اپنی نظم ''خضرِ راہ'' میں بھی حضرت خضرؑ سے مختلف سوال و جواب کے ذریعے مسلمانوں کو کچھ پیغامات دیتے ہیں۔ ویسے تو اقبال کی پوری شاعری ہی مشعلِ راہ ہے لیکن خاص طور پر ''خضرِ راہ''، ''ذوق وشوق''، ''ساقی نامہ'' اور ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ایک ہی سلسلے کی مختلف

کڑیاں ہیں۔ وہ مسلمانوں کی حالتِ زار پر کڑھتے ہیں جیسا کہ ''خضرِ راہ'' میں ''دنیائے اسلام'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں　　　مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ　　　خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

روانگی سے قبل اقبال نے ۱۴ر دسمبر کی شام کو نہایت مؤثر خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ کی تقریر انگریزی میں تھی اور استاذ عبدالرحمٰن عزام عربی میں ساتھ ساتھ ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''افسوس مَیں مؤتمر کے اختتام تک نہیں ٹھہر سکتا اور اس کا بھی افسوس ہے کہ عربی زبان کے بولنے پر پوری قدرت نہ ہونے کے باعث مَیں مباحث میں بھی زیادہ حصہ نہ لیتا رہا۔ میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ پھر مقاماتِ مقدسہ اسلامیہ اور فلسطین کی زیارت کروں جو انبیا کی سر زمین ہے۔ مَیں آپ لوگوں کو اس روحِ اخوت و مودت پر مبارک باد دیتا ہوں جس کا مظاہرہ مسلسل ہوتا رہا۔ ہم پر واجب ہے کہ اپنے نوجوانوں کو سلامتی کی راہ پر چلائیں۔

اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک الحادِ مادی کی طرف سے ہے اور دوسرا وطنی قومیّت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روحِ طاہر ان دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیّت یا وطنیّت بجائے خود بری چیز نہیں ہے، لیکن اگر اس میں خاص اعتدال کو ملحوظ نہ رکھا جائے اور افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو اس میں بھی دہریّت اور مادہ پرستی پیدا کر دینے کے امکانات موجود ہیں۔ مَیں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے اندیشہ نہیں ہے لیکن خود مسلمانوں سے مجھے اندیشہ ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ایک نہایت پیاری حدیث یاد آئی ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

انا حظکم من الا نبیاء وا نتم حظی من الامم

(انبیاء کرامؑ میں سے مَیں تمھارے حصہ میں آیا ہوں اور اُمتوں میں سے تم میرے حصے میں آئے ہو۔)

مَیں تو جب کبھی سوچتا ہوں شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول ﷺ ہم پر فخر کریں؟ جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے جو رسول ﷺ نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہو سکیں گے کہ حضور ﷺ ہم پر فخر کریں۔

مؤتمر کی ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں۔ اس کے سامنے اہم کام ہیں۔ خاص طور پر حجاز ریلوے کی واپسی اور جامعۂ اسلامیہ کا قیام لیکن اگر ہم اسلام واخوّت کی سچی روح سے معمور ہو کر کام کریں گے تو اپنے مقاصد حاصل کر لیں گے۔ اپنے ہم وطنوں میں واپس جاؤ تو روحِ اخوّت ہر جگہ پھیلا دو اور اپنے نوجوانوں پر خاص توجہ دو۔ ہمارا مستقبل انھی کی مساعی پر موقوف ہے۔ مَیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ عرب نوجوانوں میں مَیں نے وہ روح دیکھی ہے جو اٹلی کے نوجوانوں کے سوا کہیں نہیں دیکھی۔ عرب نوجوان بلندیٔ مرتبت کی روحِ صادق سے معمور ہیں۔

میرا عقیدہ ہے اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل عرب کی وحدت پر موقوف ہے۔ جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام کامیاب ہو جائے گا۔ ہم سب پر واجب ہے کہ اس باب میں اپنی ساری قوتیں صَرف کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیں کامیابی عطا کرے۔''

آپ کی تقریر کے دوران بار بار تالیاں بجائی گئیں اور نعرۂ تکبیر بلند کیا گیا۔ آخر میں ریاض الصلح بک نے کہا کہ ''ان کا پیغام عرب نوجوانوں کے دلوں پر نقش رہے گا اور ہم ہر جگہ اس پیغام کو پہنچائیں گے۔'' آپ نے ہندوستان کے دیگر مندوبین کا بھی شکریہ ادا کیا۔ مفتی سیّد امین الحسینی اور بعض دیگر اکابر روضۃ المعارف کے دروازے تک اقبال کو رخصت کرنے کے لیے آئے۔

فلسطینی کانفرنس کے الوداعی خطبہ میں اقبال نے بڑی تاکید کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل اتحاد پر موقوف ہے جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام بھی کامیاب ہو جائے گا ہم پر واجب ہے کہ اس باب میں ساری قوت صرف کر دیں' مسئلۂ فلسطین پر تبصرہ کرتے ہوئے علّامہ نے مس فارقوہرسن کو لکھا ''فلسطین پر یہودیوں کا کوئی حق نہیں۔ یہودیوں نے تو اس ملک کو رضامندانہ طور پر عربوں کے فلسطین پر قبضہ سے بہت پہلے خیر آباد کہہ دیا تھا۔ صیہونیت کوئی مذہبی تحریک نہیں علاوہ ازیں مذہبی یہودیوں کو صیہونیت سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ بقول یہودی محقق پروفیسر ہوکنگ یہود اپنی مرضی سے

فلسطین چھوڑ کر گئے اور اُن کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدوّن ہوا“

علاّمہ نے فرمایا اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو عربوں کا حق اسپین، سسلی اور دوسرے مفتوحہ یورپی علاقوں پر کیوں نہیں ہوسکتا، یہودیوں کا دعویٰ فلسطین پر ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین امریکا پر اور مُہن گال وگاتھ قومیں برطانیہ پر دعویٰ کردیں۔ ہزار سال دست برداری اور خاموشی کے بعد یہودیوں کا نیا دعویٰ بالکل بے بنیاد اور بے دلیل ہے۔ حکومتِ برطانیہ مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ میں مستقل انتداب اور سیادت کی شکل میں اپنے لیے ایک مقام کی تلاش میں ہے“۔

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیّتِ انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا

وطن واپسی

۱۵؍دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو اقبال اور غلام رسول مہر بیت المقدس سے روانہ ہوئے۔ مفتی سید امین الحسینی، سید ضیاء الدین طباطبائی، سعید شامل بے اور دیگر اصحاب انہیں الوادع کہنے کے لیے اسٹیشن پر آئے۔ چھ بجے شام گاڑی قنطرہ پہنچی، وہاں سے ڈاکٹر سلیمان کی کار میں بیٹھ کر پورٹ سعید گئے۔ سفر کے دوران میں اقبال کی طبیعت ناساز ہوگئی، تاہم ڈاکٹر سلیمان کے علاج سے وہ اگلے روز ٹھیک ہوگئے۔ پورٹ سعید میں ۱۶؍دسمبر ۱۹۳۱ء کو رات کا کھانا انھوں نے ڈاکٹر سلیمان اور ان کی جرمن بیگم کے ساتھ کھایا۔ ۱۷؍دسمبر ۱۹۳۱ء کی شب صدیق محمد ناڑو کی دعوت میں شریک تھے اور وہیں اطلاع ملی کہ جہاز بندرگاہ پر لگ گیا ہے۔ سو اسی رات تقریباً بارہ بجے ”پلسنا“ نامی جہاز میں سوار ہوگئے۔

۱۸؍دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح چار بجے جہاز پورٹ سعید سے روانہ ہوا۔ اس جہاز میں مہاتما گاندھی ہندوستان جا رہے تھے۔ اُن کے علاوہ دیگر بیگمات، شہزادی درِشہوار اور شہزادی نیلوفر اُن کی والدہ، معزول سلطان ترکی عبدالمجید خان کی بیگم اور بیگم اکبر حیدری وغیرہ۔ عدن کی بندرگاہ پر جہاز چند گھنٹوں کے لیے رکا اور اقبال گھنٹہ بھر سیر کے لیے اترے۔ ۲۸؍دسمبر ۱۹۳۱ء کی

صبح کو جہاز بمبئی پہنچ گیا۔ اقبال کے استقبال کے لیے مولانا محمد عرفان اور خلافت کمیٹی کے بعض ارکان بندرگاہ پر موجود تھے۔ دس بجے کے قریب خلافت ہاؤس پہنچے۔ عطیّہ فیضی نے اس مرتبہ بھی اُن کے اعزاز میں ایوانِ رفعت میں دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اقبال نے دن بھر تو خلافت ہاؤس میں آرام کیا، لیکن شام کو آدھے گھنٹے کے لیے ایوانِ رفعت میں تشریف لے گئے۔ وہاں سے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ریل ساڑھے سات بجے بمبئی سے روانہ ہوئی۔ چند احباب نے انہیں رخصت کیا۔ روانگی سے قبل اخبارات کے لیے صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات اور صوبائی خود مختاری کے حصول کے بارے میں ایک بیان دیا۔

۲۹ر دسمبر ۱۹۳۱ء کی شام کو گاڑی دہلی اسٹیشن پر پہنچی۔ یہاں حافظ محمد صدیق ملتانی رئیس دہلی نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا اور بڑی تعداد میں لوگ استقبال کے لیے موجود تھے۔ اسٹیشن پر اقبال کو سپاسنامہ پیش کیا گیا اور وہیں انھوں نے کھانا کھایا۔ ٹرین دہلی سے روانہ ہو کر رات چار بجے لدھیانے اسٹیشن پر رکی۔ یہاں بھی اقبال کے عقیدت مند پھولوں کے ہار لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ اقبال اس وقت سو رہے تھے، اس لیے انہیں بیدار نہ کیا گیا۔ امرتسر کے اسٹیشن پر بھی یہی کیفیت دیکھنے میں آئی۔

۳۰ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح آٹھ بجے گاڑی لاہور پہنچی۔ اسٹیشن پر ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ سپاسنامہ پیش کرنے والے اسے پڑھ بھی نہ سکے۔ بے شمار لوگوں نے اقبال کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا اور اسی حالت میں گھر پہنچے۔

سفرِ فلسطین اور گول میز کانفرنس پہ اخباری بیان

یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے نمائندے نے اُن سے گھر پر ملاقات کی اور سفرِ فلسطین کے متعلق سوالات پوچھے۔ اقبال نے کہا:

''سفرِ فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ فلسطین کے زمانۂ قیام میں متعدد اسلامی ممالک کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوانوں' عربوں سے مل کر مَیں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ان نوجوانانِ اسلام میں اس قسم کے خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی۔ جیسی مَیں نے اطالیہ میں فاشسٹ نوجوانوں کے علاوہ کسی میں نہیں دیکھی۔ مَیں نے

اسلام، عیسائیت، اور صہیونیت کے بعض مشترکہ مقامات مقدسہ کی زیارت کی۔ خصوصاً حضرت عیسیٰؑ کے مقام ولادت سے مَیں بہت متاثر ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی اسکیم بالآخر ناکام رہے گی۔ مؤتمر شاندار طریق سے کامیاب رہی۔ اس عظیم الشان اجتماع میں اکثر اسلامی ممالک کے نمائندے شریک ہوئے اور اسلامی اخوت اور ممالک اسلامی کی آزادی کے مسائل پر مندوبین نے بے حد جوش و خروش کا اظہار کیا۔ مَیں بہت سی سب کمیٹیوں کا رکن تھا۔ جو بعض تجاویز پر بحث کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھیں۔ ایک سب کمیٹی میں مَیں نے یروشلم میں قدیم جامع ازہر کی طرز پر ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزّہ یونیورسٹی بالکل جدید طرز پر قائم کی جائے۔ ہم نے تجویز دی کہ یہ یونیورسٹی یروشلم کی بجائے دمشق، بغداد، اسکندریہ یا کسی اور جگہ قائم کی جائے۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ غلط فہمی کیونکر پیدا ہوگئی کہ یروشلم میں کسی قسم کی یونیورسٹی کے قیام کا حامی نہیں ہوں۔ رائٹر نے ایک تار بھیج دیا تھا جس کا مفہوم یہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری یہ پُر زور خواہش ہے کہ عربی زبان بولنے والے لوگ صرف ایک ہی نہیں بلکہ کئی یونیورسٹیاں قائم کر کے علوم جدیدہ کو زبانِ عربی میں تبدیل کرلیں''۔

نمائندہ مذکورہ کو گول میز کانفرنس کے متعلق سوالات کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے واضح کیا:

''مَیں نے کانفرنس سے استعفا نہیں دیا بلکہ صرف مسلم وفد سے علیٰحدگی اختیار کی تھی۔ اور مَیں نے یہ بات آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلے کے ماتحت کی تھی۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ طریقِ انتخاب، صوبہ سرحد اور سندھ کے مسائل پر عملی طور پر بحث و تمحیص ختم ہو چکی ہے دارالعوام میں وزیراعظم اور سرسیمول ہور نے ان کے متعلق واضح بیان دے دیا ہے۔ اب جس مسئلہ کا تصفیہ باقی ہے۔ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کا مسئلہ ہے''۔

ایک اور موقع پر اقبال نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا ''مَیں نے وہاں یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں اچھی طرح دیکھی ہیں۔ یہ مقامات تہ خانوں کی صورت میں زمین کے نیچے بنائے گئے ہیں جہاں دن کے بارہ بجے اس قدر تاریکی ہوتی ہے کہ لیمپ روشن کرنے پڑتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی ماحول کی اداسی، غمگینی اور یبوست کا اثر اس شدت سے قلب پر پڑتا ہے کہ جسم کے قویٰ شل ہوتے ہیں۔ جب مَیں ان عبادت گاہوں کی سیر کر کے باہر آیا تو مَیں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو کھلی فضا، تازہ ہوا اور

سورج کی جاں بخش روشنی میں عبادت کی تلقین کی ہے‘‘۔

روضۂ رسولؐ پہ حاضری کی آرزو

اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطاء محمد نے آپ سے فرمایا ’’اقبال فلسطین گئے تھے لگے ہاتھوں روضۂ نبوی ﷺ پر بھی حاضری دے آتے۔‘‘ اقبال نے جواب دیا ’’بھائی کس مُنہ سے روضۂ اقدس پہ حاضری دیتا۔ انگلستان کا سفر حکومتِ ہند کے خرچ پر کیا گیا تھا۔ انگلستان سے واپسی پر مؤتمرِ اسلامی کے جلسہ میں شمولیّت کے لیے فلسطین جانا ہوا۔ وہاں خیال آیا کہ دیارِ حبیب ﷺ قریب ہے، زیارت کرتا ہوں، لیکن یہ احساس سدِّ راہ ہُوا کہ حضور اکرم حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے در پر حاضری کے لیے گھر سے اُسی نیّت سے اور اپنے خرچ پر سفر کرنا چاہیے۔ دنیوی مقصد کے سفر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لگے ہاتھوں حضور ﷺ کے روضہ پر حاضری کے لیے جانا مجھے آدابِ مُحبّت کے خلاف محسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے توحج کی نیت بھی ہے اور زیارتِ روضہ رُسول ﷺ کی بھی۔‘‘

☆☆☆

باب:۱۲

سفرِ شملہ بغرض امداد مسلمانانِ الور

ریاست الور آج کل بھارت کے صوبہ راجستھان کا حصہ ہے۔ ۷؍اپریل ۱۹۴۹ء کو یہ ریاست بھارت میں ضم ہوگئی۔ ایک زمانہ میں اس کا رقبہ تقریباً سوا تین ہزار مربع میل تھا اور ۱۴۱۲ء میں اسے الور خاں نے مستحکم کیا۔ جن کے اجداد فیروز شاہ تغلق کے عہد میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔

ریاست الور کی حکومت عرصۂ دراز سے وہاں کے مسلمانوں کو مٹانے کی فکر میں تھی۔ کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کے مکاتبِ تعلیمِ قرآن واُردو بند ہو جائیں۔ مسلمان بچے اگر پڑھیں بھی تو ریاست کے مدارس میں جن میں ذریعہ تعلیم ہندی تھی اور وہ بھی ایسی سنسکرت آمیختہ ہندی کہ مسلمان بچے اس کو پڑھنے کے بعد بھی عملاً اس سے کورے ہی رہیں اور ریاست کی کسی ملازمت کے قابل کبھی نہ بن سکیں۔ اس کے علاوہ مساجد کو منہدم کیا جاتا تھا، مسجدوں کو مندر بنایا جاتا تھا، قبرستانوں میں سڑکیں نکالی جاتی تھیں اور طرح طرح سے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو ناممکن بنایا جا رہا تھا۔ اگر مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے آئینی جدوجہد کرتے تھے تو اُن کو باغی اور مخالفِ ریاست اور اُن کی قائم کردہ انجمنوں کو خلافِ قانون قرار دیا جاتا تھا۔ مسلمانانِ الور نے اپنی ایک جماعت خادم المسلمین کے نام سے قائم کی تھی جو مسلمانوں کے حقوق کی بات کرتی تھی۔ حکامِ الور نے اسے ممنوع قرار دے دیا۔ یہ قصہ طویل ہے مگر اس سلسلہ میں ۲۹؍مئی ۱۹۳۲ء کو ریاست کی فوج نے بلاوجہ اور بالکل ناجائز طور پر مسلمانوں کے پرامن مجمع پر گولی چلائی۔ کئی مسلمان شہید ہوئے، کئی زخمی ہوئے اور اس کے بعد مسلمانوں پر گوناگوں تشدد کیا گیا۔ آخر تنگ آ کر ہزارہا مسلمانوں نے الور سے ہجرت کی۔ اس زمانے میں آل انڈیا مسلم کانفرنس قائم تھی

اور اقبال اس کے صدر تھے۔ ۲۲؍ مارچ ۱۹۳۲ء کو اقبال نے مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے مسلمانانِ الور کی شکایات پیش کیں۔ ایک وفد تشکیل پایا جس کے سربراہ مولوی شفیع داؤدی تھے۔ حکام نے اس وفد کو وقت دینے سے انکار کر دیا۔ مسلم کانفرنس نے ۸؍ جون کو احتجاج کیا۔

جمعیتِ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کے معتمد عمومی کی حیثیت سے غلام بھیک نیرنگ نے معاملاتِ الور کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور انھوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس سے معاونت کی درخواست کی۔ چنانچہ قرار پایا کہ مسلم کانفرنس کا ایک وفد وائسرائے کی خدمت میں پیش ہو کر مسلمانانِ الور کی دادرسی کے لیے وائسرائے کو توجہ دلائے۔ اس وفد کے ارکان کی تعداد تو زیادہ تھی مگر وائسرائے نے تاریخ اس قدر نزدیک مقرر کی کہ ہندوستان کے مختلف مقامات سے اکثر لوگ اس تاریخ پر شملہ نہ پہنچ سکتے تھے اور وائسرائے کا خیال یہ تھا کہ دو چار آدمی آ جائیں، زیادہ مجمع کرنا غیر ضروری ہے۔ چنانچہ اقبال بحیثیتِ صدر آل انڈیا مسلم کانفرنس اس وفد کی قیادت کے لیے لاہور سے شملہ تک کے سفر کی صعوبت گوارا کرتے ہوئے شملہ پہنچے۔ کالکا سے غلام بھیک نیرنگ اُن کے ہمراہ ہو لیے۔ کالکا سے شملہ تک کا سفر دونوں نے ایک ہی موٹر میں کیا۔ شملہ میں اُن کا قیام لوئر بازار کے ایک بالا خانہ میں رہا۔ کیونکہ اس مردِ خدا (اقبال) کے مزاج میں یہ بات تھی ہی نہیں کہ ہم بڑے آدمی ہیں، وائسرائے سے ملنے کے لیے آئے ہیں، ہمارے قیام کے لیے کسی بڑے ہوٹل یا کوٹھی میں پُرتکلف انتظام ہو۔ اس کے بعد ۶؍ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو وفد وائسرائے لارڈ ولنگڈن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جس میں مسلمانانِ الور پہ ہونے والے مظالم کی داستان بیان کی گئی۔ اس دباؤ کے نتیجہ میں مہاراجہ الور جے سنگھ پر بھاکر بہادر (جو ۱۸۹۲ء سے ریاست کے حکمران تھے) کی خاصی گوشمالی ہوئی اور مسلمانانِ الور کو بعد میں آسودگی رہی۔

غلام بھیک نیرنگ جو اس سفر میں اقبال کے ہمرکاب تھے، اس سلسلے میں چند واقعات پہ روشنی ڈالتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ قومی ضرورتوں کے موقع پر اقبال جو عموماً پہلے غیر متحرک نظر آتے تھے، ایسے ہی متحرک بن جاتے تھے جیسے کوئی اور جوشیلا کارکن۔ دوسری بات یہ کہ جب غلام بھیک نیرنگ اور وہ موٹر میں کالکا کو جا رہے تھے تو حسب معمول اسلامی موضوعات پر گفتگو چھڑ گئی۔ نیرنگ نے کہا کہ ''آپ نے قران کا بہت مطالعہ کیا ہے اور اس زمانے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے خیالات سے بھی آپ واقف ہیں، یہ دیکھتے ہوئے کہ ابنائے زمانہ کو قرآن کی

تعلیم سے بیگانگی اور بُعد کیوں ہے، آپ ان کے لیے قرآن کی تفسیر یا قرآن پر حواشی لکھیئے''۔ انھوں نے اس کام سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ اس اظہار معذوری کے سلسلہ میں جو انھوں نے ایک تقریر کی تو اس میں بعض نازک مسائل آ گئے، ان کو بیان کرتے کرتے ان پر ایک حالتِ جوش وجذبہ طاری ہو گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ اُن کا دل سینے سے نکل پڑے گا۔ مگر چند سیکنڈ میں انھوں نے خاموش رہ کر پھر سلسلۂ گفتگو جاری کر دیا اور دیر تک جاری رکھا، اس حالت پر ضبط پا لیا۔ نیرنگ کہتے ہیں کہ اسی قسم کا جوش وجذبہ مَیں نے ایک اور موقع پر بھی دیکھا۔ اس ملاقات کی بھی کچھ تفصیل یُوں ہے۔

''۱۹۳۴ء میں منٹگمری میں تعلیمی کانفرنس صوبہ پنجاب کا اجلاس ہوا۔ مَیں بھی اس کانفرنس میں شریک ہوا۔ علی گڑھ سے سر راس مسعود اور نواب صدر یار جنگ بہادر؛ حبیب الرحمٰن خان شروانی بھی تشریف لاکر شریکِ اجلاس ہوئے۔ جب یہ اجلاس ختم ہو گیا تو واپسی میں نواب صدر یار جنگ اور راقم ایک دو روز کے لیے لاہور ٹھہر گئے اور شیخ سر عبدالقادر کے مہمان ہوئے۔ ایک روز اقبال سے ملنے گئے۔ وہ اس وقت میکلوڈ روڈ پر اس بنگلے میں رہتے تھے جس کے عقب میں حضرت شاہ ابوالمعالی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ بازار انارکلی کے بالا خانہ سے اٹھ کر وہ اسی بنگلہ میں آ گئے تھے اور جب تک اُن کی کوٹھی جاوید منزل تعمیر نہ ہو گئی، اسی میں رہتے رہے۔ ہم جو گئے تو اُن کو سامنے کے بڑے کمرے میں جس کے آگے برآمدہ تھا، بیٹھے ہوئے پایا کمرے میں نیچے چٹائی اور اس کے اوپر دری کا فرش تھا اور سامنے کی دیوار کی طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اقبال اپنے معمولی قلندرانہ لباس (بنیان، تہبند، کمبل) میں ملبوس بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ وہ ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور باتیں شروع ہو گئیں۔ مَیں نے دیکھا کہ اس کمرے میں ایک طرف دیوار کے قریب کئی قالین لپٹے ہوئے رکھے ہیں۔ مَیں نے پوچھا کہ یہ قالین کیوں رکھے ہوئے ہیں، کہنے لگے کہ مَیں افغانستان گیا تھا، نادر شاہ نے یہ قالین بطور تحفہ دیے تھے، اِن کو بچھانے کی کوئی جگہ نہیں، یہ رکھے ہیں۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ قلندر کو جو کوئی تحفہ دے، خواہ دینے والا بادشاہ ہی ہو، اس تحفہ کا یہی حشر ہوتا ہے۔ (لیکن اِن قالینوں کی دعا آخر قبول ہوئی جب جاوید منزل تعمیر ہو گئی تو یہ بچھائے گئے)۔''اس زمانے میں اقبال جاوید نامہ لکھ رہے تھے، مجھ کو اور شروانی صاحب کو اس کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ پڑھتے پڑھتے ان پر دو چار سیکنڈ کے لیے وہی جوش وجذبہ طاری ہو گیا، جو مَیں نے شملہ کے سفر میں دیکھا تھا اور اسی

طرح انھوں نے اس جوش پر فوراً قابو پالیا‘‘۔

اس کے علاوہ ایک دفعہ اور بھی علاّمہ کا ریاست الور میں جانا ہوا تھا جس کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر وائسرائے سے ملاقات سے پہلے کا تھا۔ انھوں نے خود یہ قصہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو سنایا ’’ایک دن سر علی امام نے مجھ سے کہا کہ مہاراجہ الور کو ایک قابل پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت ہے۔ اگر آپ وہاں نوکری کرنا چاہیں تو مَیں تقریب کرائے دیتا ہوں۔ آپ جا کر مہاراجہ سے ملاقات کر آیئے۔ چنانچہ مَیں منشی طاہر الدین اور علی بخش کو ساتھ لے کر الور پہنچ گیا، وہاں ہم مہمان خانہ شاہی میں ٹھہرائے گئے۔ دوسرے ہی دن صبح ایک مسلمان حجام ہماری خدمت کے لیے آیا۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ یہ ڈاکٹر اقبال ہیں جو مسلمانوں کے بڑے مشہور شاعر اور رہنما ہیں۔ اس نے میری حجامت بناتے بناتے مجھ سے پوچھ لیا کہ مَیں یہاں کیوں آیا ہوں۔ اس کے بعد اس نے بہت رُک رُک کر نہایت تامّل سے کہا: صاحب! آپ یہاں نوکری نہ کریں تو اچھا ہے۔ مَیں نے پوچھا کیا وجہ؟ اس نے پھر تامّل سے کہا: صاحب کچھ نہیں، ہم تو غریب رعایا ہیں، اپنے مہاراجہ کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں؟ لیکن آپ کے لیے کوئی ضروری تو نہیں کہ یہاں کی نوکری کریں۔ جب مَیں نے اس سے بہ اصرار وجہ پوچھی تو اس نے ہزار تامّل کے بعد وہ ناگفتہ بہ باتیں سنائیں جو ان اطراف میں بچے بچے کی زبان پر تھیں۔ علاّمہ مہاراجہ الور سے ملے، کچھ باتیں ہوئیں۔ اس گفتگو کے دوران میں علاّمہ کو معلوم ہوا کہ پرائیویٹ سیکرٹری کی تنخواہ صرف چھ سو روپے ہوگی۔ علاّمہ نے مہاراجہ سے کہا کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ یہ کہہ کر واپس آئے اور چپ چاپ ریاست الور سے رخصت ہو کر لاہور پہنچ گئے۔

☆☆☆

باب:۱۳

مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت

آل انڈیا مسلم کانفرنس بحیثیت آل پارٹیز مسلم کانفرنس ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی تھی اور اقبال اس کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۹۳۴ء تک اس نے مسلم سیاست میں نہایت اہم اور فعال کردار ادا کیا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ انتشار کا شکار تھی۔ خلافت کمیٹی نہ ہونے کے برابر تھی۔ دیگر مسلم سیاسی جماعتیں مثلاً مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمیعۃ العلماء، الاحرار وغیرہ مسلمانوں کی کم اور گانگرس کی زیادہ ترجمان تھیں۔ مسلم کانفرنس کی ایک باقاعدہ مجلسِ عاملہ تھی، ایگزیکٹو بورڈ تھا، مختلف صوبوں میں شاخیں تھیں۔

۲۹/دسمبر ۱۹۲۸ء* سے یکم جنوری ۱۹۲۹ء تک دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس سر آغا خان کی صدارت میں ہوا۔ آغا خان خصوصی طور پر انگلستان سے اس میں شرکت کرنے آئے اور وائسرائے کے مہمان تھے۔ صاحبِ صدر کی سنہری کرسی کے پیچھے خاص نمائندے علاّمہ اقبال، میاں سر محمد شفیع، مولانا محمد علی جوہر، سر ابراہیم رحمت اللہ اور سر عبدالقیوم تشریف فرما تھے۔ اجلاس میں نہرو رپورٹ کی مذمت اور اس کے خلاف قرارداد منظور کی گئی۔ مسلم مطالبات کو مرتب کر کے کانفرنس میں منظور کیا گیا یہی مسلم مطالبات بعد میں زیادہ واضح شکل میں ''جناح کے چودہ نکات'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ علاّمہ اقبال نے سر محمد شفیع کی جانب سے پیش کی جانے والی قرارداد کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ''مَیں حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لیے راہ عمل قائم کی تھی، وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔ حضرات! آج مَیں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان کے زندہ رہنا ہے تو اس کو جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض حصے ایسے ہیں جن میں

مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔ آج ہر قوم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و عمل کر رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش نہ کریں۔ آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولیشن پیش ہوا، وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری اُمت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہوگا۔''

دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد علاّمہ اقبال ۳۰؍دسمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور پہنچے۔ کچھ مسلم حلقوں میں یہ اضطراب تھا کہ علاّمہ نے کانفرنس سے استعفیٰ دے دیا ہے، اس پر آپ نے فرمایا! مَیں نے گول میز کانفرنس سے استعفیٰ نہیں دیا بلکہ مسلم وفد سے علیٰحدگی اختیار کی تھی اور یہ قدم آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلے کے تحت اُٹھایا۔ اس پہ مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ نے ۸؍جنوری ۱۹۳۲ء کو دہلی میں اجلاس طلب کیا۔ علاّمہ کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے ۸؍جنوری ۱۹۳۲ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ سیّد نذیر نیازی شام تک اُن کے ساتھ رہے اور اسی رات علاّمہ لاہور چلے آئے۔

۸؍جون ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس علاّمہ اقبال کی صدارت میں شملہ میں منعقد ہوا۔ چند قراردادیں ریاست الور کے متعلق اور صوبوں کو مالی خودمختاری دیے جانے کے بارے میں منظور کی گئیں۔ الور کے راجہ کی اشیرباد سے حکومت نے مساجد پر قبضہ کر رکھا تھا، اردو اور فارسی کی تعلیم مدرسوں میں بیس برس سے بند تھی، ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مسلم کانفرنس نے ایک وفد مولوی شفیع داؤدی کی سربراہی میں مہاراجا سے ملنے کے لیے ترتیب دیا مگر اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ ۸؍جون ۱۹۳۲ء کو جو احتجاج کیا اس کا بھی مہاراجا پر اثر نہ ہوا، پھر لارڈ ولنگڈن وائسرائے کی خدمت میں یادداشت پیش کی جس میں الور کے مظالم بیان تھے۔ اس کے بعد وائسرائے نے مہاراجا کو ریاست سے بے دخل کر دیا۔

۷؍اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس علاّمہ اقبال کی زیرِ صدارت دہلی میں ہوا۔ جس میں قرار پایا کہ مسلم لیڈر سکھوں سے اپنی گفت وشنید کو اس وقت تک ملتوی رکھیں جب تک حکومت فرقہ ورانہ فیصلہ کا اعلان نہ کر دے۔ اسی اجلاس میں حکومت سے مطالبہ

کیا گیا کہ حکومت جلد از جلد فرقہ ورانہ فیصلہ کا اعلان کرے۔ یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ اگر مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو مجلسِ عاملہ کے چند ارکان پہ مشتمل کمیٹی (علاّمہ اقبال، مولانا مظہر الدین، مولانا حسرت موہانی، سیّد حبیب، غلام رسول مہر، حسن ریاض اور ذاکر علی) سکھوں سے مذاکرات کرے گی۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ علاّمہ نے ارکان کو سکھوں کی ہٹ دھرمی سے آگاہ کر دیا۔

۷/اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس علاّمہ اقبال کی صدارت میں ہوا جس میں ایک قرارداد کشمیر ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں احرار کی قید و بند پر احتجاج اور اُن کی رہائی سے متعلق منظور کی گئی۔ مگر تحریکِ کشمیر جاری رہی۔ ۲۳/اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس علاّمہ اقبال کی زیرِ صدارت دہلی میں ہوا۔ جس میں فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق قرارداد منظور کی گئی۔ اگلے روز اس قرارداد کی تائید میں ایک اہم بیان جاری کیا۔ جس میں کہا گیا کہ پنجاب کونسل میں مسلمانوں کو واضح اکثریت نہیں دی گئی اور سکھوں کو زیادہ پاسنگ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض نشستوں کی مشترکہ انتخاب کے ذریعے حاصل کرنے کی پابندی عائد کی گئی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود اُن کا حق مار کر یورپین جماعت کو پاسنگ دیا گیا ہے۔ تیسرا اعتراض یہ تھا کہ بنگال، پنجاب اور سرحد میں غیر مسلم اقلیتوں کو کو زیادہ پاسنگ دیا گیا ہے جبکہ ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلم اقلیت کو اس قدر پاسنگ نہیں دیا گیا تھا۔ فرقہ ورانہ فیصلے میں مسلمانوں کے نقصان کی تلافی کے لیے اقبال نے دو تجاویز پیش کیں: اوّل یہ کہ بنگال میں دو ایوانی مقنّنہ بنائی جائے اور بالائی ایوان میں مسلمانوں کو اُن کی آبادی کے تناسب سے نشستیں دی جائیں۔ نیز کابینہ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کے سامنے جوابدہ ہو۔ دوم صوبوں کو حقیقی اختیارات زیادہ سے زیادہ دیے جائیں اور مرکز کو صرف چند برائے نام اختیارات ہوں۔ ۲۱/مارچ ۱۹۳۳ء کو دہلی میں مسلم کانفرنس کا اجلاس علاّمہ اقبال کی صدارت میں ہوا۔ سر محمد یعقوب اس کے کنوینر تھے۔ سینکڑوں مسلمان ہوٹل میں جمع تھے۔ غالب اکثریت مسلمان وزیروں، سرداروں اور خان بہادروں کی تھی۔ جلسے کے اختتام پر آپ مولوی محمد شفیع داؤدی، رکن اسمبلی کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔

☆☆☆

باب:۱۴

تیسری گول میز کانفرنس اور سفرِ یورپ
(۱۷/۱۰اکتوبر ۱۹۳۲ء تا ۲۵/فروری ۱۹۳۳ء)

تیسری گول میز کانفرنس ۱۷/نومبر ۱۹۳۲ سے ۲۴/دسمبر ۱۹۳۲ء تک جاری رہی۔ کانگریس نے اس میں شرکت نہیں کی کیونکہ وہ یو۔ پی، بنگال اور سرحد میں تحریکِ سول نافرمانی میں مصروف تھی۔ اس میں قائداعظم کو بھی مدعو نہیں کیا گیا۔ البتہ علاّمہ اقبال کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ عملی طور پر اس کانفرنس نے کوئی خاص کام سرانجام نہیں دیا۔ لہٰذا یہ کانفرنس جلد ہی ختم ہوگئی۔

تیسری گول میز کانفرنس میں علاّمہ اقبال کو خوش دلی سے مدعو نہیں کیا گیا جیسا کہ عظیم صاحب اپنے والد سر فضل حسین کے سوانح میں لکھتے ہیں:

''دوسرے سال سر فضل حسین نے ترغیب دی کہ ڈاکٹر اقبال کو پھر گول میز کانفرنس میں بھیجا جائے۔ پچھلے سال کے تجربہ کی بناء پر حکومت ڈاکٹر اقبال کو گول میز کانفرنس میں بھیجنے کے لیے سرد مہری کے ساتھ رضامند ہوگئی''۔

حکومت کی اس سرد مہری کا سبب علاّمہ اقبال کا وہ روّیہ تھا جو آپ نے دوسری گول میز کانفرنس کے دوران اختیار کیا۔ نیز ۲۱-۲۲/مارچ ۱۹۳۲ بیرونِ دہلی دروازہ لاہور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں اقبال ہی کی زیرِ صدارت راست اقدام کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس لیے حکومت انہیں گول میز کانفرنس میں بلانا پسند نہیں کرتی تھی، تاہم انہیں نظر انداز بھی نہ کر سکتی تھی۔ بہر حال بہ امرِ مجبوری اس نے علاّمہ کو بھی شرکت کی دعوت دے ہی دی۔

بمبئی آمد

علاّمہ قبال ۱۷/۱۰کتوبر ۱۹۳۲ کو لاہور سے بذریعہ ریل بمبئی روانہ ہوئے۔ علاّمہ اقبال مسلم مندوب کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے

دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے موقع پر اور پھر دورانِ سفر کچھ مشکلات محسوس کی ہوں گی کہ اس دفعہ انھوں نے سیکرٹری کی ضرورت محسوس کی۔ انگریز حکومت تو اقبال کو سیکرٹری کی سہولت مہیّا کرنے سے رہی۔ مسلم لیگ کے پاس اتنے فنڈز نہیں تھے کہ وہ زادِراہ کا بندوبست کر کے کوئی سیکرٹری بھیجتی۔ اقبال کی اپنی بھی مالی حیثیت اتنی اچھی نہ تھی کہ وہ خود کسی دوسرے کا بوجھ اٹھاتے۔ چنانچہ سیّد مراتب علی نے اپنے خرچ پر اپنے بیٹے سیّد امجد علی کو علاّمہ کے ساتھ بطور سیکرٹری بھیجا۔ سیّد امجد علی آپ کے سیکرٹری کی حیثیت سے ہمسفر تھے (یہ سیّد مراتب علی کے بیٹے تھے بعد میں ۵۴-۱۹۵۳ء میں امریکا میں پاکستان کے سفیر بھی رہے)۔ علاّمہ اقبال بمبئی پہنچے تو سٹیشن پر افغان قونصل جنرل نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔

سیّد امجد علی نے اپنی رہائش کا الگ انتظام کیا جبکہ اقبال نے سردار صلاح الدین سلجوقی* سفیرِ حکومت افغانستان کے ہاں قیام فرمایا۔ بمبئی میں اپنے مختصر قیام کے دوران علاّمہ اقبال نے کچھ وقت عطیّہ بیگم اور اُن کے خاوند کے محل نما مکان میں گزارا، جہاں عطیّہ کے خاوند فیضی راحمین نے فن کے کچھ نادر نمونے اور تصاویر دکھائیں۔

یورپ روانگی

علاّمہ اقبال اور سید امجد علی ۱۷ اکتوبر کو SS Conte Ross بحری جہاز کے ذریعے لندن روانہ ہوئے۔ یہ جہاز لائڈ ٹریسٹینو کمپنی Lloyd Triestino Co کا تھا۔ یہ جہاز جب عدن پہنچا تو آپ کی طبیعت خراب ہوگئی اس لیے آپ اپنے کمرے میں آرام کرتے رہے۔ سید امجد علی کہتے ہیں کہ میَں اس صورتِ حال پر بے حد رنجیدہ تھا کیونکہ اسی جہاز پر ایک نامور ہندوستانی طبیب سرسی۔ دی۔ رامن بھی سوار تھے جو یورپ جا رہے تھے۔ سرسی۔ دی۔ رامن دلچسپ اور خوبصورت گفتگو کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ انھوں نے دَورانِ گفتگو اپنے یورپ کے متعدد سفروں اور وہاں کے بلند پایہ ادباء وسائنسدانوں سے اپنی ملاقاتوں کا رنگین حال بیان کیا۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور (اس وقت تک ٹیگور کو نوبل انعام مل چکا تھا) کا ذکر آیا تو کہنے لگے:

''وہ (ٹیگور) رہتا مشرق میں ہے مگر اس کی شہرت مغرب میں پہنچ چکی ہے۔ اور کہا کہ اگر علاّمہ بھی اس طرح یورپ کے سفر کرتے رہیں تو انہیں زیادہ شہرت حاصل ہوگی اور ٹیگور کی طرح وہ

بھی با آسانی نوبل پرائز حاصل کر سکتے ہیں‘‘۔سیّد امجد علی کہتے ہیں مَیں نے علاّمہ سے اس کا تذکرہ کیا۔علاّمہ اقبال نے یہ بات سنی تو مسکراتے ہوئے کہا:

"Tagore practices action and preaches rest, whereas Iqbal preaches action and practices rest".

یعنی ٹیگور خود تو حرکت و عمل میں رہتا ہے اور دوسروں کو سکون و راحت کی تلقین کرتا ہے، جبکہ اقبال دوسروں کو حرکت و عمل کی دعوت دیتا ہے اور خود سکون آشنا رہتا ہے۔

پیرس میں قیام

جب جہاز وینس پہنچا تو علاّمہ اقبال نے سید امجد علی سے فرمایا کہ یہاں سے لندن بذریعہ ریل چلیں گے اور راستے میں دو تین روز پیرس میں ٹھہریں گے۔ چنانچہ آپ وینس سے ریل کے ذریعے پیرس پہنچے۔ پیرس کے سٹیشن پر آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے امراؤ سنگھ مجیٹھیا پیرس میں موجود تھے۔ سردار موصوف نے دونوں مہمانوں کو ایک سادہ سے ہوٹل میں ٹھہرایا۔علاّمہ نے قیام کے دَوران سردار صاحب کی دو لڑکیوں سے بھی ملاقات کی جن میں سے ایک مشہور فن کارہ امرتا شیر گل تھی۔

علاّمہ اقبال نے پیرس پہنچتے ہی امراؤ سنگھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس دَوران نپولین کی قبر پر جائیں گے، مشہور محقق میسی نون Massignon سے ملاقات کریں گے۔ جو اندلس میں مسلمانوں کے عہد پر تحقیق کے لیے مشہور تھے میسی نون نے منصور حلاّج کی ’’کتاب الطّواسین‘‘ کے عربی متن کو ایک مدلّل مقدمے اور مفید حواشی کے ساتھ ۱۹۱۳ء میں شائع کیا تھا۔ اقبال سے اُن کا تعارف اسی تصنیف کی وجہ سے ہوا اور اس کے بعد ہی اقبال کا حلاّج کے متعلق نظریہ بدل گیا۔ اگر ممکن ہوا تو فرانس کے شہرہ آفاق فلسفی پروفیسر برگسان Bergson سے بھی ملاقات کریں گے۔علاّمہ کا خیال تھا کہ پروفیسر برگسان کا نظریۂ واقعیتِ زماں اسلامی تصوّر سے بہت قریب ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ اُن سے گفتگو کرنے کے خواہاں تھے۔ پروفیسر برگسان کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں پیرس سے باہر مضافات میں ایک گاؤں میں مقیم ہیں۔ علاّمہ اپنے طبعی تساہل کی بناء پر وہاں جانے پر آمادہ نہ ہوئے اور کانفرنس سے واپسی پر ملاقات کا پروگرام بنا لیا۔ کیونکہ اس وقت تک پروفیسر برگسان کی واپسی کا امکان تھا۔

نپولین کے مزار پر

مشہور فرانسیسی سپہ سالار نپولین بونا پارٹ کی قبر پر جانے کے لیے وقت مقرر ہوا۔ سردار امراؤ سنگھ اور سیّد امجد علی آپ کے ہمراہ تھے۔ نپولین کے مقبرے کو ڈاکٹر صاحب نے دیکھا اور وہاں دس پندرہ منٹ رہے۔ لیکن مقبرے سے باہر نکلے تو اُن کے چہرے سے کسی خاص تاثر اور کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

سیّد امجد علی کو یہ دیکھ کر حیرانی بھی ہوئی اور مایوسی بھی۔ انہیں توقع تھی کہ نپولین ایسے عظیم فرانسیسی سپہ سالار کے مقبرے کی زیارت سے علاّمہ اقبال پر وہ کیفیت ضروری طاری ہو جائے گی جس کے نتیجے میں وہ شعر کہتے ہیں لیکن جب انھوں نے علاّمہ کے چہرے پر اس کی کوئی علامت نہ دیکھی تو ان کا یہ شوق تشنۂ تکمیل رَہ گیا۔ اس کے باوجود ''نپولین کے مزار پر'' کے زیرِ عنوان ان کی ایک نظم ہمیں ملتی ہے جس میں انھوں نے نپولین کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اُس کے چند اشعار یُوں ہیں:

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز　　جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع　　کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز!
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر　　سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز!

میسی نون سے ملاقات

فرانسیسی محقق میسی نون سے علاّمہ اقبال کی یکم نومبر ۱۹۳۲ء میں ملاقات ہوئی تو پروفیسر موصوف جس کمرے میں بیٹھے تھے اس میں ہر طرف کتابوں کے انبار تھے۔ علاّمہ اقبال اور آپ کے رفقاء (سید امجد علی اور امراؤ سنگھ) بڑی مشکل سے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ بنا سکے۔ میسی نون کے علمی ذوق اور وسعت معلومات کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے دوسری متعدد تصانیف کے علاوہ وہ شیخ محی الدین ابن عربی صاحب فصوص الحکم کے نظریات پر ایک مبسوط و مستند کتاب لکھی۔ جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے حقیقت یہ ہے کہ میسی نون نے

یوسف بن منصور حلاج پر تحقیق کے حوالے سے شہرت حاصل کی تھی۔ علاّمہ اقبال نے کہا کہ مغرب کے مؤرخین کو اسلام سے جو تعصّب اور عناد ہے۔ امتدادِ زمانہ سے اس میں کمی آ رہی ہے اور اسلام کی صداقت ان پر واضح ہو رہی ہے کیا آپ اس رائے سے متفق ہیں؟ فرانسیسی پروفیسر نے جواب دیا کہ یہ بات درست ہے کہ اب مغربی مؤرخین پہلے کی نسبت زیادہ غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے اسلامی تحریکوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ یورپ پر مسلمانوں کے عظیم احسانات ہیں۔ انھوں نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور تعلیم و معاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کے لیے نئے نئے مواقع بہم پہنچائے۔ فرانسیسی پروفیسر نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ اُن کی تحقیقات کو بڑے پیمانے پر قبولیت حاصل ہو رہی ہے اور متعدد مستشرقین اندلس کے عربوں کے پرانے علمی کارناموں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

فرانس میں قیام کے دوران اقبال نے ایک غزل بھی کہی جس کا مطلع یہ ہے۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام !وائے تمنائے خام!

اس غزل کے دو اشعار یہ ہیں:

پیرِ حرم نے کہا سُن کے مری روئداد!
پختہ ہے تیری فغاں اب نہ اسے دل میں تھام
آہ کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر سلطنت روم و شام

میسی نون نے اپنی زندگی میں علاّمہ سے قلمی و روحانی رشتہ برقرار رکھا۔ اس کے علاوہ جب وہ جون ۱۹۴۵ء میں ہندوستان آئے تو ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کو علاّمہ اقبال کی آخری آرام گاہ پہ حاضری دی۔

لندن میں قیام

علاّمہ اقبال اور سید امجد علی ریل کے ذریعے پیرس سے روانہ ہوئے اور خلیج عبور کر کے لندن پہنچے تو ریلوے سٹیشن پر ایک نومسلم انگریز خالد شیلڈرک Khalid Sheldrake نے علاّمہ کا

خیر مقدم کیا۔ خالد شیلڈرک نے اس موقع پر علّامہ کی خدمت میں مشہور برطانوی سیاستدان جان برائٹ John Bright کی تقریروں کا مجموعہ (مرتبہ جے۔ ای۔ ٹی۔ راجرس، مطبوعہ میکملن اینڈ کمپنی لندن، ۱۸۹۲ء) پیش کیا اور عرض کیا کہ آپ کو گول میز کانفرنس کے اہم سیاسی مباحث میں حصہ لینا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ ان تقریروں کو آپ وقت نکال کر ضرور پڑھ لیں۔ سیّد امجد علی کہتے ہیں۔

''رات کے کھانے کے بعد علّامہ نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا اور رات گئے تک اس میں محو رہے۔ علّامہ اس کتاب کے پڑھنے میں اس قدر محو ہوئے کہ وہ بھول گئے کہ مَیں بھی کمرے میں موجود ہوں۔ لہٰذا مَیں ایک گھنٹے کے بعد انہیں مطالعہ کرتے ہوئے چھوڑ کر چلا گیا۔ اگلی صبح جب مَیں نے پوچھا کہ آیا وہ رات گئے تک پڑھتے رہے تھے تو انھوں نے فرمایا کہ انھوں نے تقریباً آدھی رات کو یہ کتاب ختم کی۔ اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ بہت کم کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں شروع سے آخر تک پوری توجہ سے پڑھنا پڑتا ہے اور یہ اُن میں ایک ہے''۔

جان برائٹ کی تجویز

گول میز کانفرنس کے مباحث میں شرکت کرتے ہوئے اقبال نے جان برائٹ کی تقریر سے خاصی مدد لی۔ اِس انگریز کی فراست اور دُور بینی کی داد دینا پڑتی ہے۔ کیونکہ اس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک سال بعد برطانوی حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان کو خالی کرنے سے پہلے اسے کم از کم پانچ خود مختار حصّوں میں تقسیم کرنے کا اہتمام کرے۔ جان برائٹ نے برطانوی دارالعوام میں ۲۴/ جون ۱۸۵۸ء کو ہندوستان کے متعلق پبلک پالیسی کے موضوع پر جو تقریر کی تھی اس کا ایک اہم اقتباس یہ ہے۔

''میری تجویز ہے کہ ایک سلطنت ہند اور اس کے گورنر جنرل مقرر کرنے کی بجائے ہم نہ پہلی صورت اختیار کریں نہ دوسری (دونوں سے دست کش ہو جائیں) بلکہ مَیں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ہم سلطنت قائم کرنے کی بجائے ہندوستان میں صوبے یا یونٹ قائم کریں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں کم از کم پانچ صوبے یا احاطے قائم کیے جائیں اور ان کی حکومتیں مرتبے اور مالی ذرائع کے اعتبار سے بالکل مساوی ہوں۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان یونٹوں کے

دارالحکومت کلکتہ، مدراس، بمبئی، آگرہ اور لاہور ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ہر یونٹ کا محکمۂ مالیات، محکمۂ وصولی ٹیکس، محکمۂ انصاف، پولیس، امورِفاہِ عامہ اور محکمۂ فوج ایک دوسرے سے علیحدہ ہو۔ گویا ہر علاقہ ایک بالکل خودمختار سٹیٹ (ریاست) ہو جس کا ہندوستان کے دوسرے حصّوں (صوبوں) سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ ہر یونٹ کو اس ملک (انگلستان) کا صرف ایک تابع Dependency تسلیم کیا جائے۔ اگر آئندہ کبھی انگلستان کو اپنے اقتدارِاعلیٰ سے دست بردار ہونا پڑے تو ہم ایک ملک کی بجائے ان پانچ خودمختار یونٹوں سے دستبردار ہوں جن میں سے ہر علاقہ اپنی آزادی اور اپنی حکومت کو قائم رکھ سکے''۔

نیشنل لیگ کی تقریب

لندن میں مس فارقوہرسن (Margaret Foarquharson) نے ۱۹۱۴ء میں ایک تنظیم نیشنل لیگ کے نام سے قائم کی تھی۔ جس کا مقصد جنگ کے دوران برطانیہ کی مدد کرنا تھا۔ جنگ کے بعد دُنیا بھر کے مسلمانوں کو برطانیہ سے قریب کرنا اور ان کے منصفانہ مطالبات کے لیے رائے عامہ ہموار کرنا بھی اس کے پیشِ نظر تھا۔ علاّمہ اقبال شروع ہی سے اس لیگ کی کوششوں کے معترف تھے۔ نیشنل لیگ کی بانی مس فارقوہرسن نے گول میز کانفرنس کے موقعے پر علاّمہ اقبال کی لندن میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۴رنومبر ۱۹۳۲ء کو ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں متعدد مقتدر برطانوی، گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلم مندوبین اور مولانا شوکت علی بھی شامل ہوئے۔ مس فارقوہرسن نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے اقبال کا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا:

''علاّمہ اقبال غیرمعمولی صفات کے مالک ہیں۔ وہ اپنی شاعرانہ بصیرت سے مستقبل میں دور تک دیکھ سکتے ہیں، وہ ایک فلسفی کی دقّتِ نظر اور عمیق فکر سے انسانی مسائل میں مضمر اصولوں اور ایک عملی آدمی کی قوتوں کو دریافت کرتے ہیں۔ اپنی انھی خصوصیات کی بناء پر وہ گول میز کانفرنس کی رکنیت سے سرفراز ہوئے۔ یہ ایک خاص موقع ہے جس میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین، متعدد ممالک کے سفراء اور ہمارے بہت سے مشرقی دوست یہاں جمع ہیں تاکہ ان کی عزت افزائی کرسکیں۔'' اس تعارف کے بعد لارڈ لیمنگٹن Lord Lamington نے اقبال کی علمی کاوشوں اور شعری تخلیقات کی تعریف کی اور ان کی خدمات کو سراہا جو اقبال نے دنیا بھر کے

انسانوں کی بیداری کے سلسلے میں سرانجام دیں۔اس کے بعد انھوں نے رسمی طور پر علاّمہ اقبال کو حاضرینِ اجلاس سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔علاّمہ اقبال نے ایک مختصر مگر جامع تقریر میں متفقہ آئین تیار کرنے کے لیے باہمی اعتماد اور خیر سگالی کی فضا برقرار رکھنے پر زور دیا۔انھوں نے اس توقع کا اظہار بھی کیا کہ مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت کی ضمانت دی جائے گی۔

علاّمہ اقبال نے اپنی تقریر میں فرمایا:

''ہم برطانوی حکومت کے تعاون سے ہندوستان کے لیے آئین بنانے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ہمیں ایک ایسا آئین تیار کرنا چاہیے جس کی ناکامی کا امکان نہ ہو۔ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جس میں مختلف نسلوں اور زبانوں کے لوگ ہزار سالوں سے اکٹھے بس رہے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ کانفرنس کے مقاصد کی صحیح طریق سے وضاحت کر دی جائے۔تمام فرقوں کا آپس میں اور ملک (کے مفاد) کے ساتھ گہرا رابطہ ہو۔ باہمی اعتماد بے حد ضروری ہے۔اعتماد کرنے سے ہی اتحاد حاصل ہوتا ہے۔کانفرنس میں خیر سگالی کی فضا موجود ہے۔مسلمان باہمت ہیں اور انھوں نے ہمیشہ برطانیہ سے وفاداری اور محبت کا اظہار کیا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ مسلمانوں کے جائز مطالبات اور خواہشات کو آخری سمجھوتہ میں مکمل تحفظ دیا جائے گا''۔

اس کے بعد ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۲ کو نیشنل لیگ نے کمیٹی روم نمبر ۱۰ میں ایک اجلاس منعقد کیا تاکہ مسلم وفد کے ارکان اور علاّمہ اقبال سے برطانوی عوام وخواص ملاقات کا شرف حاصل کر سکیں۔اس میں غیر ملکی سفیروں کے علاوہ دارالامراء اور دارالعوام کے ارکان نے بھی شرکت کی۔ اس میں اقبال نے ایک جامع تقریر میں مسلمانوں کے مطالبات کی توضیح کی اور کہا کہ مسلمانوں کا اہم ترین مسلہ اپنی تہذیب و ثقافت کا تحفظ کرنا اور اپنی روایات کے مطابق شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونا ہے۔ لہٰذا برطانیہ کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کی اس فطری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُن کے مطالبات تسلیم کر لے۔علاّمہ اقبال نے فرمایا:

''مسلمانانِ ہند کے مطالبات میں ایک بے حد سادہ اصول کارفرما ہے جو برطانوی عوام کو یقیناً قبول ہوگا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی آبادی سات کروڑ ہے۔اس آبادی کا نصف حصہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے جب کہ نصف سے زیادہ حصّہ نسبتاً یک جا اور خاص طور پر اُن صوبوں میں آباد ہے جو ہندوستان کے وسیع مغربی خطے پر مشتمل ہیں۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۵۷ فی صد، سندھ میں ۷۳ فی صد اور صوبہ سرحد میں تقریباً ۹۵ فی صد ہے''۔

واپسی کا پروگرام

۲۹/دسمبر۱۹۳۲ء کو آپ نے ایک خط کے ذریعے اپنی واپسی کے پروگرام سے مطلع کرتے ہوئے تحریر کیا:

''اس سے پہلے مَیں نے جو خطوط اپنے بمبئ پہنچنے کی تاریخ کے متعلق چودھری صاحب یا منشی طاہر دین یا کسی اور کو لکھے ہیں اُن سب کو منسوخ تصوّر کیجیے۔ پہلے ارادہ یہی تھا۔ مگر بعد میں دیکھا جہازوں کی روانگی کی موزوں تاریخیں نہ ملیں۔ اس واسطے اب میں ہسپانیہ، جرمنی اور آسٹریا ہوتا ہوا۱۰/فروری۱۹۳۳ کو وینس سے بمبئ کے لیے جہاز لوں گا۔ اس جہاز کا نام ''کانٹے وردی'' ہے اور یہ بمبئ ۲۲/فروری کی صبح کو پہنچے گا''۔

پیرس آمد اور برگسان سے ملاقات

علّامہ اقبال لندن سے ۳۰/دسمبر۱۹۳۲ء کو روانہ ہوئے اور پیرس میں فرانس کے مشہور فلسفی پروفیسر برگسان سے ملاقات کی۔ برگسان بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور پھر اسے وجع المفاصل کی تکلیف بھی تھی۔ وہ دو پہیوں کی کرسی کے بغیر حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا۔ نوکر اُس کی کرسی کو اُس کی خواہش کے مطابق اِدھر اُدھر لے جاتے تھے۔ اِس بناء پر اُس نے لوگوں سے ملنا جلنا بند کر رکھا تھا۔ لیکن جب اسے اقبال کے شوقِ ملاقات کا علم ہوا تو اُس نے خاص طور پر ملاقات کے لیے وقت نکالا۔ یہ ملاقات خاصی طویل رہی۔ اس میں برگسان کے نظریہ واقعیتِ زماں پرسَیر حاصل بحث ہوئی۔ علّامہ نے پروفیسر موصوف کو حضورا کی یہ حدیث سنائی ''زمانہ کو بُرا مت کہو (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) مَیں خود زمانہ ہوں'' تو برگسان حیران و ششدر رَہ گیا۔ اور بار بار علّامہ سے دریافت کرتا رہا کہ کیا یہ قول درست ہے۔ اس ملاقات کے بارے میں اقبال نے سر ولیم روتھن سٹائن Sir William Rothenstein کے نام ایک مکتوب میں لکھا:

''پیرس میں برگسان سے میری ملاقات ہوئی اور فلسفیانہ مسائل پر بے حد دلچسپ باتیں ہوئیں۔ برگساں نے کہا بارکلے کے فلسفہ کا حاصل یہ ہے۔ ادراک میں مادہ بہ تمام وکمال منکشف ہو جاتا ہے لیکن ذہن میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ بارکلے کے فلسفیانہ افکار کی تشریح کا نہایت دلچسپ انداز ہے ہماری گفتگو دو گھنٹے جاری رہی۔ برگسان بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اور بیمار بھی بہت ہیں۔

لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر رکھا ہے۔ لیکن میری ملاقات کے لیے انھوں نے ازراہِ کرم خاص طور پر وقت نکالا۔ بدقسمتی البتہ یہ ہوئی کہ جو صاحب برگسان سے ملاقات کے وقت ساتھ تھے اور ہماری باتیں قلم بند کر رہے تھے بعد میں اپنا لکھا ہوا خود بھی نہ پڑھ سکے''۔

لارڈ لوتھین کے نام ۱۷/مارچ ۱۹۳۳ء کے خط میں اقبال اس ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پیرس میں قیام کے دَوران میری برگسان سے ملاقات ہوئی۔ جدید فلسفے اور تمدّن Civilization پر ہماری گفتگو تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ کچھ وقت ہم نے برکلے پر تبادلہ خیال کیا جس کے فلسفے پر بعض فرانسیسی فلاسفروں نے بعض نہایت دلچسپ مشاہدات پیش کیے''۔

برگسان سے ملاقات کے بارے میں سیّد نذیر نیازی نے ایک مرتبہ پوچھا۔ جب آپ نے برگسان سے ملاقات کی اور گفتگو ہوئی تو کیا اُس کی کوئی یاداشت بھی لی گئی تھی؟ فرمایا امراؤ سنگھ میرے ساتھ ساتھ تھے۔ گفتگو بھی انھی کے توسط سے ہوتی رہی اور انھی نے اسے قلم بند بھی کیا، مگر اس بُرے طریق سے کہ بعد میں انہیں خود بھی اپنی تحریر کا پڑھنا مشکل ہو گیا۔ آپ نے مزید فرمایا۔ اس گفتگو میں برکلے کے متعلق بھی خُوب باتیں ہوئیں۔ برکلے کی اہمیت موجودہ زمانے میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ پھر فرمایا اس گفتگو کا خلاصہ مشہور فنکار کو بھیج دیا گیا تھا، معلوم نہیں وہ کہیں موجود بھی ہے یا ضائع ہو گیا۔ سیّد نذیر نیازی کے اس سوال پر کہ آپ نے برگسان سے اپنے نظریۂ زماں کا ذکر بھی کیا تھا۔ ہاں اس کا ذکر آیا تھا اور برگسان کو بھی افسوس تھا کہ مَیں نے اسے کیوں ضائع کر دیا۔

ایسا لگتا ہے کہ برگسان وہ مغربی مفکر ہے جس کے افکار اور اقبال کے نظریات میں کافی مشابہت ہے۔ سیّد نذیر نیازی ۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کی روداد لکھتے ہیں کہ اقبال نے فرمایا: کیمبرج کے زمانۂ طالب علمی میں جب مَیں نے اِس موضوع، یعنی زمانے کی حقیقت پر ایک مقالہ لکھا تو میرے اُستاد میک ٹیگرٹ نے اُسے دیکھا مگر اِس قدر ناپسند کیا کہ مَیں نے دل برداشتہ ہو کر اُسے تلف کر دیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں جب برگسان نے اِس موضوع پر ویسے ہی اظہارِ خیال کیا اور اُس کے نظریے کی اشاعت ہونے لگی تو میک ٹیگرٹ کو بڑا دکھ ہوا۔ اِس لیے کہ برگسان نے بھی کم وبیش وہی نظریہ قائم کیا تھا جسے پہلے مَیں اپنے مقالے میں پیش کر چکا تھا۔

میک ٹیگرٹ نے مجھ سے کہا افسوس ہے مَیں نے اپنا فریضۂ استادی ادا نہیں کیا۔ مَیں نے تم پر بڑا ظلم کیا کہ اِس بہت بڑے کارنامے سے محروم کر دیا۔ مجھے بھی رنج تھا کہ مَیں نے اپنا مقالہ کیوں تلف کر دیا۔

ہسپانیہ آمد اور اہلِ علم سے خطاب

تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں اقبال کے قیامِ لندن کے دوران نواب بھوپال حمیداللہ خاں بھی وہیں تھے۔ ایک روز نواب صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب! یہ موقع اچھا ہے کہ آپ سپین بھی ہو آیئے۔ اقبال برجستہ بولے ''ضرور ہو آتا اگر مَیں نواب ہوتا''

نواب اشارہ سمجھ گئے چنانچہ انھوں نے زادِ راہ کا بندوبست کر دیا۔ ایک موزوں سیکرٹری منتخب کی گئی۔ اقبال نے رقم اُس کے حوالے کر دی اور اپنا پروگرام بتا دیا۔ پہلے تو اس نے سیکرٹری کی طرح رسمی انداز میں کام کیا پھر وہ انگریز لڑکی اس طرح اُن کی خدمت کرنے لگی جیسے پرائیوٹ سیکرٹری نہیں بلکہ مریدنی ہے۔ علاّمہ نے طرزِ عمل کے بدلنے کا سبب پوچھا تو وہ یوں گویا ہوئی کہ مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ آپ ایک آسمانی مخلوق ہیں۔ اس لڑکی کے بارے میں ہسپانوی اخبار میں یہ چھپ گیا کہ اقبال کی ایک بیٹی بھی ساتھ ہے جو دُبلی پتلی اور سفید فام ہے۔ اقبال نے یہ رُوداد خود عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھی۔

تیسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد پیرس ہوتے ہوئے اقبال جنوری ۱۹۳۳ء میں ہسپانیہ پہنچے۔ سیّد امجد علی کہتے ہیں کہ اقبال اور مَیں دونوں گول میز کانفرنس کے اختتام پر سپین جانا چاہتے تھے، لیکن بدقسمتی سے اقبال کی ناک میں ایک پھنسی نکل آئی جس کی وجہ سے وہ فوری طور پر سپین کے سفر پر روانہ نہ ہو سکے اور مَیں بھی ان کی معیّت سے محروم رہا اور اُن سے الگ ہو گیا۔ جب اُن کی تکلیف ختم ہو گئی تو وہ سپین کی سیّاحت پر روانہ ہو گئے۔ ہسپانیہ پہنچنے کے فوراً بعد اقبال نے بعض اہم شخصیّات سے ملاقات کی۔ مولانا غلام رسول مہر کے نام اپنے مکتوب میں جو لاہور میں ۴؍فروری ۱۹۳۳ء کو موصول ہوا۔ اقبال لکھتے ہیں:

''کل مع الخیر میڈرڈ پہنچے۔ یہاں سے قرطبہ اور غرناطہ وغیرہ جائیں گے۔ ۶؍فروری تک وینس پہنچنا ہے۔ آج یہاں کے وزیرِ تعلیم پروفیسر آسن سے ملاقات ہوئی جنھوں نے دانتے کی ڈوائن کامیڈی اور اسلام پر کتاب لکھی ہے۔ صدرِ جمہوریہ سے غالباً ملاقات ہوگی''۔

میڈرڈ میں اقبال سے درخواست کی گئی کہ آپ اہلِ علم کی ایک مجلس میں خطبہ ارشاد فرمائیں۔ آپ نے جس مجلس میں خطبہ ارشاد فرمایا اس کی روداد ہسپینی اخبارات میں شائع ہوئی۔ روزنامہ El-Debate میں جو تفصیل شائع ہوئی وہ درجِ ذیل ہے:

''سر محمد اقبال ایک سیّاح کی حیثیت سے اور عربوں سے دلچسپی رکھنے کے لیے ہسپانوی دانشوروں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے سپین میں آئے ہیں۔ گذشتہ شام انھوں نے مانکلوا Moncloa میں فلسفہ وادب کی فیکلٹی کی نئی عمارت میں اسلام کی فکری دنیا اور سپین کے زیرِ عنوان ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔

مسٹر آسن پیلاشیئس Asin Palacios نے کہا کہ علاّمہ اقبال ایک نکتہ سنج فلسفی اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ آپ ان منتخب ہستیوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے خوش قسمتی سے اسلامی دنیا میں شاعری کے آسمانی فن اور مابعدالطبیعیات کے گہرے مطالعے کا ذوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے مزید کہا کہ ''علاّمہ اقبال (ایک فلسفی اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک سیاست دان کی حیثیت سے) گاندھی اور دیگر قابلِ ذکر ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے ساتھ گول میز کانفرنس کی اعلیٰ کونسل کی رکنیت کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا لیکن ہمارے مہمان (اقبال) گاندھی جیسے سیاست دانوں اور مقدس قوم پرست اشخاص سے مختلف ہیں۔ اقبال ایک دانشور ہیں۔ سیاست اور گول میز کانفرنس میں اُن کی شرکت محض ایک اتفاقی امر ہے۔ گاندھی کے برخلاف انھوں نے یورپی طور طریقوں سے عدم مطابقت کا مظاہرہ نہیں کیا جب کہ گاندھی نے اپنا مخصوص لباس تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی تہذیبی نشو ونما کیمبرج کی قانون کی یونیورسٹی میں ہوئی ہے اس لیے وہ ایک نئے طرز کی جیکٹ کی حد تک یورپی لباس پہنتے ہیں۔ اُن کے نسلی امتیاز کی علامت صرف ان کی ٹوپی ہے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ ان کی صاحبزادی ہیں، دبلی پتلی، (اس لڑکی کا) چہرہ کسی یورپین کی طرح گورا چٹا ہے''۔

اپنے خطبے میں اقبال نے واضح کیا کہ اسلامی سپین کے شعراء اور فلسفیوں نے مشرق کے دُور دراز حصّوں میں بسنے والے مسلم دانشوروں کو بے حد متاثر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مشرق میں کس طرح (ان علماء) خصوصاً ابن خلدون، المسعودی اور الکندی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اُن بے شمار تحقیقات کا ذکر کیا جو اس سلسلے میں کی جا رہی ہیں۔

ہسپانیہ کے وزیرِ تعلیم پروفیسر آسن کی درخواست پر انھوں نے میڈرڈ یونیورسٹی میں

The Intellectual World of Islam and Spain کے موضوع پر لیکچر دیا۔ اس سفر کے دوران میں انھیں ہسپانیہ کے کئی دوسرے شہروں (طلیطلہ، قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ) کی سیّاحت کا موقع ملا۔ ہسپانیہ صدیوں تک مسلم تہذیب و تمدّن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس لیے اقبال کو اس خطے سے خصوصی تعلقِ خاطر تھا۔

اپنی مشہور نظم ''ہسپانیہ'' میں کہتے ہیں۔

ہسپانیہ تُو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تُو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

لارڈ لوتھین کے نام ۱۷/مارچ ۱۹۳۳ء کے مکتوب میں اقبال نے یورپ اور سپین کی سیّاحت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا:

''ہسپانیہ میں قیام کے دَوران عربی کے بہت سے پروفیسروں سے میرا رابطہ ہوا جو اسلام کے کلچر کے بارے میں بہت پُرجوش نظر آتے تھے۔ میڈرڈ یونیورسٹی نے Spain and the intellectual world of Islam کے موضوع پر مجھ سے یونیورسٹی میں خطاب کرنے کی درخواست کی۔ میرے خطاب کو بے حد سراہا گیا۔ صدارت پروفیسر آسن نے کی جو Islam and Divine Comedy کے معروف مصنّف ہیں۔

ہسپانیہ کی نئی حکومت غرناطہ کو دنیائے اسلام کے لیے ایک طرح کا تہذیبی مکّہ بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ میرے خیال میں مناسب ترین وقت یہی ہے کہ انگلستان کو اسلام کے تہذیبی پہلو میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لینی چاہیے۔ درحقیقت ایک معاشی نظام کی حیثیت سے اسلام کہیں زیادہ دلچسپ ہے اور ہماری موجودہ مشکلات کے کہیں زیادہ عملی حل تجویز کرتا ہے''۔

قرطبہ میں مسلم طرزِ تعمیر

قرطبہ (Cordoba) اسپین کے صوبہ اندلوز یا (اندلس) کا معروف شہر ہے۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں صدر مقام رہا۔ آج بھی اس کے قدیم حصے میں واقع دروازوں، تنگ اور پر پیچ

گلیوں، برجوں اور فصیل کے باقی ماندہ حصوں کی صورت میں قرطبہ کی عظمتِ رفتہ کے نشانات باقی ہیں۔سونے اور چاندی کے پانی سے نقش نگاری کی صنعت آج بھی قرطبہ میں زندہ ہے۔

قرطبہ کی تاریخ کئی سال قبل مسیح پرانی ہے۔قرطبہ سب سے پہلے ۷۱۱ء میں مسلمانوں کے زیرِ تسلّط آیا۔عبدالرحمٰن اوّل (۷۸۸۔۷۵۶ء) نے قرطبہ کو اپنی سلطنت کا دارالحکومت بنایا اور یہاں مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی۔کسی زمانے میں یہاں سینٹ ونسٹ کا گرجا واقع تھا۔مسلمانوں نے ۷۱۱ء میں اس کے ایک حصے کو مسجد بنا لیا تھا بعد میں عبدالرحمٰن نے ایک لاکھ دینار کے عوض گرجے کا باقی حصہ خرید لیا اور یہاں مسجد تعمیر کی گئی۔

اصل مسجد میں ستونوں کی تعداد بارہ سو سے زائد تھی۔تین چار سو کلیسا کی نذر ہو گئے،اب آٹھ سو کے قریب باقی ہیں مگر ان کا حُسن و جمال اب بھی، دیکھنے والوں کو لُبھاتا ہے۔ان پر جس زاویے سے اور جدھر سے نظر دوڑائیں،ایک تناسب اور موزونیت کا احساس ہوتا ہے۔قطار اندر قطار ستونوں اور محراب بر محراب کے سلسلے کو دیکھ کر بے اختیار علاّمہ اقبال کی نظم ذہن میں آتی ہے۔

تیرا جلال و جمال ، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

تیری بنا پائدار، تیرے ستُوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو، جیسے ہجومِ نخیل

مسجدِ قرطبہ کی محراب کی مثال نہ ممالکِ اسلامی میں ملتی ہے نہ کسی اور مقام پر۔اس کے نقشے نیز دیگر جزئیات کی کہیں بھی نقل نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں (مؤلف: رُوحِ اقبال) کے بقول:''مسجدِ قرطبہ ایک جلیل القدر قوم کی جفاکشی، جانبازی، مہم جوئی، اور بلند خیالی کی زندہ تصویر ہے''۔

علاّمہ اقبال نے شیخ محمد اکرام کے نام ایک خط میں لکھا''مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایک ایسی رفعت تک پہنچا دیا، جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی''۔مقالاتِ یوسف سلیم چشتی میں تحریر ہے کہ کسی نے علاّمہ اقبال سے پوچھا کہ مسجد کو دیکھ کر آپ پر کیا اثر ہوا تھا؟ آپ نے کہا:

.It is a commentary on the Quran, written in stones

یہ قرآن پاک کی ایسی تفسیر ہے جو پتھروں کے ذریعے لکھی گئی ہے۔

علاّمہ اقبال ایک پختہ فکر شاعر اور فلسفی تھے اور اس وقت ان کی عمر ۵۶ سال تھی۔ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس عمر میں وہ جذبات کی رَو میں بہہ گئے ہوں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسجد کا جلال و جمال ہی اس قدر متاثر کرنے والا اور مرعوب کن تھا کہ اس نے اقبال کے جذبات میں ہلچل مچا دی۔ مسجد دیکھ کر واپس آئے تو قرطبہ ہی سے غلام رسول مہر کو لکھا: ''مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو'' اسی طرح بیٹے جاوید اقبال کے نام خط میں لکھتے ہیں: ''مَیں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں اس مسجد کے دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد، دنیا کی تمام مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو۔'' (بے شک مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ کی زیارت سب سے افضل ہے)

جگن ناتھ آزاد نے اپنے ایک مضمون میں اقبال کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے اُن کی شاعری کے ذکر کو غزل کے بجائے نظم پر ختم کیا ہے اور اس ضمن میں ''مسجد قرطبہ'' کے حوالے سے اقبال کے بے مثل اسلوبِ بیان اور نظم کی شعریت اور حسن و جمال کی بھرپور داد دی ہے وہ لکھتے ہیں:

''یہ نظم صرف اقبال ہی کا شاہکار نہیں بلکہ ساری اُردُو شاعری کا شاہکار ہے۔ اردو شاعری میں اس نظم کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی ہماری شاعری دنیا کی صفِ اوّل کی شاعری میں ایک ممتاز مقام حاصل کر سکتی تھی۔ نظم ''مسجدِ قرطبہ'' شعریت، رومانیت، حقیقت پسندی، رمزیّت، اور امائیت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے کہ ہماری ساری اردو شاعری روزِ اوّل سے آج تک اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں ۲۸،۲۹۲۰ مربع فٹ کے رقبے میں بنی ہوئی اس عظیم الشان مسجد کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور تصوّر میں اس مسجد کے جلال و جمال کا اندازہ کرنا آسان بھی نہیں ہے...... اگر مجھے کبھی ہسپانیہ کی اس مسجد کو دیکھنے کا موقع ملے تو شاید میں اس وقت بھی یہ فیصلہ نہ کرسکوں کہ ہسپانیہ کی مسجدِ قرطبہ زیادہ جلیل و جمیل ہے یا بالِ جبریل کی ''مسجد قرطبہ''۔ (یاد رہے یہ بات انھوں نے ۱۹۶۲ء میں کہی تھی۔ جبکہ ۱۹۹۱ء میں قرطبہ میں کانفرنس ہوئی تھی جسمیں انہیں انڈیا سے شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ پاکستان سے پروفیسر محمد منور، سہیل عمر، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر جاوید اقبال نے مع اپنی بیگم کے شرکت کی تھی)۔

اقبال کی اس بے مثال فنی تخلیق کی داد، اردو کے بیشتر نامور نقادوں نے دی ہے، مثلاً مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں: ''شاعر نے یہ نغمے غرناطہ کی عطر بیز فضاؤں اور وادی الکبیر

کی کیف انگیز ہواؤں میں خود ڈوب کر لکھے ہیں۔ ’’مسجدِ قرطبہ‘‘ اقبال کی پختہ تر شاعری میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے اور اس کے بعض مقامات یقیناً دنیا کی عظیم ترین شاعری میں شمار کیے جا سکتے ہیں‘‘۔

ممتاز نقاد اور دانش ور سلیم احمد لکھتے ہیں:

’’اقبال کی مسجدِ قرطبہ ایک ہندی کی طرف سے عرب مسلمانوں کے لیے عقیدت اور محبت کے ان جذبات کی تخلیق ہے جو ہندی مسلمانوں کے دل کو عربوں کے لیے ہمیشہ آغوشِ عاشق کی طرح کشادہ رکھتے ہیں۔ (اسے) ابدیت کی تاریخ میں ایک معجزہ کا اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے‘‘۔

مولوی شمس تبریز خان رقم طراز ہیں: ’’اس نظم کی ایک بڑی خصوصیّت یہ ہے کہ اس کے آفاق اور دائرۂ تخیل بہت ہمہ گیر، محیط اور اس کا Canvas بہت وسیع اور اس کے پس منظر کا تاریخی شعور بہت طویل و عریض ہے اور تقریباً فتح اندلس سے لے کر زمانۂ حال تک کے تاریخی حوادث و انقلاب اور فکر و فلسفے کے اہم تحریکات کا ذکر آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اقبال کا نظریۂ کائنات، اِن کا فلسفۂ خودی، مردِ مومن کا تخیل، ایمان و عشق کے بارے میں واضح تصّورات، اِن کا فلسفۂ تاریخ، اِن کا نظریہ شعر و ادب، فنون لطیفہ کے بارے میں اِن کا طرزِ عمل، زندگی کے تخلیقی و تحریکی عناصر اور ان کے علاوہ بہت سے واضح نظریات اِس نظم میں آ گئے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسجدِ قرطبہ کے آئینے میں، ہم اقبال کی ہشت پہلو شخصیّت کے خدوخال دیکھ سکتے ہیں۔ اور ان سے مل سکتے ہیں۔‘‘

مسجدِ قرطبہ کی زیارت

اقبال نے قیامِ قرطبہ کے دوران مسجدِ قرطبہ کی زیارت بھی کی۔ فقیر سیّد وحیدالدین لکھتے ہیں۔ حکیم الامت علاّمہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد اسپین بھی گئے اور وہاں اسلامی دَورِ اقتدار ختم ہونے کے تقریباً سات سو سال بعد انھوں نے مسجدِ قرطبہ میں پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی۔ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی حامل یہ مسجد اب گرجا بن چکی ہے۔ ہسپانیہ کے 25 روزہ سفر کے بارے میں شیخ محمد اکرام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ’’مَیں اپنی سیاحتِ اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجدِ قرطبہ پر بھی لکھی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت

تک پہنچا دیا جو مجھے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی‘‘

علّامہ اقبال مسجد کی شان وشوکت سے اس قدر مرعوب اور متاثر ہوئے کہ آپ نے جب نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو یکا یک اشعار کا نزول ہونے لگا حتیٰ کہ انھوں نے پوری دعا اشعار کی صورت میں مانگی اور وہی نظم بعد میں شائع بھی ہوئی۔ اس نظم کا مطلع یہ ہے۔

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

اس نظم کا ایک شعر ہے:

چشمِ کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبُو خلوتیوں کے کدو!

مسجد سے ملحق اس یونیورسٹی نے پورے یورپ میں علم وفن کی اشاعت میں بیش بہا کارنامے سرانجام دیے۔ علّامہ اقبال مسجد کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
تیرے درو بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل

مشہور تاریخ دان حتّی Hitti مسجدِ قرطبہ کو مغرب کا کعبہ قرار دیتے ہوئے اس کے ستونوں کو Forest of Stately Columns سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

(Twelve Hundred and Ninety Three Columns, a veritable forest supported its roof.)

مسجدِ قرطبہ اندلس میں صدیوں کی شاندار اسلامی حکومت کی یادگار کو سقوطِ قرطبہ ۱۲۳۶ء کے بعد گرجا میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی لیے اقبال کہتے ہیں:

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

علّامہ اقبال پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مسجدِ قرطبہ کے گرجے میں تبدیل کیے جانے کے کئی سو سال بعد ۱۹۳۳ء میں پہلی بار اس میں اذان دے کر دو رکعت نماز ادا کی۔

سپین میں مسلم تمدّن

پروفیسر حمید احمد خان روایت کرتے ہیں کہ اسپین سے واپسی کے بعد علاّمہ اقبال نے ایک ملاقات میں اسلامی فنِ تعمیر کی قوت و ہیبت کا ذکر کرتے ہوئے مسجدِ قرطبہ کے حوالے سے فرمایا ''اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جُوں جُوں قومی زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصرِ زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے، مسجدِ قرطبہ مہذب دیووں کا مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا''۔ پھر ایک تبسم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ مَیں الحمرا کے ایوانوں میں جابجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی ، دیوار پر ''ہو الغالب'' لکھا ہوا تھا۔ (مَیں نے دل میں کہا یہاں تو ہر طرف اللہ غالب ہے، کہیں انسان نظر آئے تو بات بھی ہو)۔ اقبال نے اندلس کے سفر کے دوران جو کلام لکھا وہ انتہائی معرکتہ الآ را اور شاعری کا تاج محل ہے اِن میں کچھ نظمیں مسجد قرطبہ میں قیام اور چند ایک سفر کے دوران لکھی گئیں۔ اِن میں مسجدِ قرطبہ، دُعا، قید خانہ میں معتمد کی فریاد، عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا درخت، ہسپانیہ، طارق کی دُعا، یہ حُوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب نمایاں ہیں۔

مراجعتِ وطن

یکم فروری ۱۹۳۳ء کو مولانا غلام رسول مہر کے نام مکتوب میں اقبال نے اطلاع دی۔ ''۲۶ر جنوری کو ہسپانیہ کے سفر سے واپس آیا۔ اب ۱۰ر فروری کو وینس سے اطالوی جہاز'' کانٹے وردی'' پر سوار ہو کر ۲۲ر فروری کی صبح کو ان شاءاللہ العزیز بمبئی پہنچ جاؤں گا۔''

سفرِ سپین پر انٹرویو

حسبِ پروگرام اقبال ۱۰ر فروری کو وینس سے ایک اطالوی جہاز'' کانٹے وردی'' پر سوار ہو کر ہندوستان روانہ ہوئے۔ ۲۲ر فروری ۱۹۳۳ء کو آپ بمبئی پہنچے تو بمبئی کے اخبار'' خلافت'' کے نامہ نگار نے آپ سے سپین کے بارے میں چند سوالات کیے۔ ان کے جواب میں علاّمہ

اقبال نے فرمایا:

''مجھے لندن میں اسپین جا کر لیکچر دینے کی دعوت ملی تھی۔ اسلام کے اس مرکز کو دیکھنے کا مجھے پہلے ہی شوق تھا۔ اس لیے مَیں نے دعوت قبول کر لی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے مجھے تقریر کے موضوع کا کوئی علم نہ تھا، البتہ خواہش یہ تھی کہ ایسا مضمون ہو جس پر تقریر کرتے ہوئے مَیں اسلامی ثقافت وتمدن اور اسلامی فلسفہ پر کچھ کہہ سکوں۔ وہاں پہنچنے پر پروفیسر آسن کو انتخابِ مضمون کا اختیار دے دیا۔ اتفاق سے انھوں نے وہی مضمون تجویز کیا جس کا مَیں خود خواہش مند تھا۔ یعنی ''سپین اور فلسفۂ اسلام''۔ میرا لیکچر میڈرڈ کی جدید یونیورسٹی میں ایک گھنٹہ جاری رہا، جس میں مَیں نے اسپین کے مسلمانوں کے تمدن، فلسفہ اور ان کی تہذیب و روحانیت کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و تفسیر بیان کرتے ہوئے حاضرین سے اپیل کی کہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کریں، نہ عیسائیوں کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہوں، بلکہ عربوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ مَیں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ملک کے متعدد مشہور تاریخی مقامات و آثار کا بہ نظرِ غائر معائنہ کیا۔ مَیں اپنے تاثرات کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا بس یوں سمجھ لیجیے کہ جس طرح یہودیوں کے لیے ارضِ موعودہ فلسطین ہے، اسی طرح عربوں کے لیے غالباً اسپین کی سرزمین موعودہ ہے۔ اس قدر خوبصورت، اس درجہ پُر فضا اور ایسا آرام دِہ ملک۔'' پروفیسر آسن عربی زبان کے پروفیسر اور بہت ہی خوش خلق و ملنسار آدمی ہیں۔ ان کا ایک شاگرد قرطبہ کی قدیم یونیورسٹی کا پرنسپل ہے۔ اس یونیورسٹی میں عربی تعلیم پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے''۔

ایک سوال کے جواب میں اقبال نے فرمایا:

''اس وقت تو وہاں کوئی مسلمان نہیں۔ لیکن تعلیم یافتہ طبقہ اب عربی النسل ہونے پر فخر کا اظہار کرنے لگا ہے اور ہر اچھی چیز کو ''مورش'' کہہ دیتا ہے (یعنی اسلامی)۔ ان میں اسلام کی طرف سے بغض وعناد کم ہوتا جا رہا ہے اور وہ اسلامی تہذیب وتمدّن اور فلسفہ، مذہب کا مطالعہ بڑے ذوق سے کرتے ہیں۔ سپین میں اکثریت رومن کیتھولک کی ہے لیکن مذہب روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ گرجے آباد تو ہیں مگر اِن میں غریب طبقہ جاتا ہے۔ یہی حالت تقریباً ہر یورپین ملک کی ہے۔ جن مسجدوں کو گرجاؤں میں تبدیل کر دیا گیا تھا وہ اب تک مسجدوں کی شکل میں نہیں آئیں۔ البتہ چند مسجدیں واگذاشت ہوگئی ہیں۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے عربوں کی عمارتیں کئی جگہ کھود کر نکالی ہیں۔ کارڈوا (قرطبہ) میں کھدائی کا کام جاری ہے۔ خلفاء کے زمانے کی چند عمارتیں نکل آئی ہیں۔ اُن کے بعض حصوں میں ٹوٹی ہوئی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔''

ایک سوال کے جواب میں علاّمہ نے فرمایا:

''عربوں کا تمدّن سپین سے بالکل فنا نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ شہر طلیطلہ عربی تمدن کی زندہ مثال ہے۔ قدرتی مناظر وحسن کے علاوہ یہاں کی معاشرت بھی آرام دہ اور دلکش ہے۔ وہاں پہنچ کر مَیں نے محسوس ہی نہیں کیا کہ اجنبی ملک میں ہوں۔ یہاں کے بازار، مکانات بالکل مشرقی نمونہ کے ہیں اور غذا بھی وہی ہے جو لوگوں کو مرغوب ہے۔ چنانچہ پلاؤ کا مجھے وہی مزہ آیا جو لاہور میں آتا ہے۔ لوگ خلیق اور ملنسار ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کا طریقہ بھی مشرقی ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی بالکل سادہ وضع کی مسجد ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں اب تک قائم ہے۔ غالبًا کِسی مسلمان سپاہی نے فتحِ طلیطلہ کے بعد اسے بنوایا تھا۔ موجودہ حکومت نے اُسے آثارِ قدیمہ میں لے کر محفوظ کر دیا ہے۔ اسپین کی زبان میں اب تک عربی لفظ بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ ''ال'' تو اکثر الفاظ میں ملا ہوتا ہے''۔

اقبال نے دورانِ قیام سپین ہی ایک نظم میں فرمایا تھا۔

آج بھی اُس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بُوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے!
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے!

موجودہ حکومت کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

''جمہوریت سے تمام لوگ خوش ہیں معدودے چند ہوں گے جو شہنشاہیت پسند ہیں۔ موجودہ حکومت کوشش کر رہی ہے کہ قدرتی وسائل اور انعام واکرام سے استفادہ کرے۔ چنانچہ کان کنی اور معدنیات کے متعلق اب تک جو معلومات بہم ہوسکی ہیں وہ سب وہی ہیں جن کی تحقیقات عربوں نے کی تھی۔ اُن کاوشوں کا نفع موجودہ نسل اُٹھانا چاہتی ہے۔ اسکوریل لائبریری بڑی عظیم الشان لائبریری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عربوں کے زمانے کی قلمی تحریروں کا ذخیرہ متعصبین نے پہلے غارت کر دیا تھا۔ اب تھوڑا ذخیرہ رہ گیا ہے۔ جس میں زیادہ تر مولانا جامی اور حضرت حافظ کی قلمی تحریریں ہیں''۔

ڈاکٹر صاحب نے آخر میں مشورہ دیا کہ ''ضرورت ہے کہ یہاں سے دوچار ایسے تعلیم یافتہ طلبا اسپین بھیجے جائیں جو فلسفہ الٰہیات، عربی تمدن، اسلامی تاریخ اور مذہب سے اچھی طرح واقف ہوں تاکہ وہ اسلام کا صحیح نمونہ اہلِ ہسپانیہ کو پیش کرسکیں''۔

لاہور آمد

اقبال ۲۵رفروری ۱۹۳۳ء کو فرنٹیئر میل سے لاہور پہنچے۔ٹرین تقریباً ۲۰ منٹ لیٹ تھی۔ اسٹیشن پر آٹھ بجے ہی سے مسلمان جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اور ٹرین کی آمد تک پلیٹ فارم کا بیشتر حصّہ حضرت علاّمہ کی پیشوائی کرنے والوں سے بھر گیا تھا۔

جمعیّت الاسلام کا سپاسنامہ

گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی تو اللہ اکبر کے پُر جوش نعروں سے اسٹیشن گونج اٹھا۔حضرت علاّمہ کو کثرت سے ہار پہنائے گئے۔ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ مصافحہ بھی بصد دقت ہوتا تھا۔ پلیٹ فارم ہی پر ارکانِ جمعیت الاسلام نے حضرت علاّمہ کی خدمت میں سپا سنامہ پیش کیا۔خواجہ فیروزالدین صاحب بیرسٹر نے جمعیت کی طرف سے سپاسنامہ پڑھا،جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

''اس وقت مسلمانانِ ہند کی زبوں حالی عیاں راچہ بیاں کی مصداق ہے اور یہ عظیم الشان قوم جس کی قسمت میں کبھی دنیا کی جہاں بانی تھی، آج تشتت و افتراق کی آماجگاہ بن کر ہندوستان میں اپنی تاریخی وقعت کھو بیٹھی ہے اور حقیقت بیں آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ زوال اور پستی ہمارے مذہبِ اسلام کے سنہری اصول سے روگردانی کی وجہ سے ہے۔

ساقی مدام بادہ باندازہ می دہد
ایں بے خودی گناہِ دلِ زُود مستِ ماست

(ساقی شراب ہمیشہ ظرف کے مطابق دیتا ہے۔ ہماری یہ بےخودی ہمارے جلد مست ہو جانے والے دل کا گناہ ہے۔)

جنابِ والا کی ہستی دیگر صفات کے علاوہ مسلمانوں کے دلوں میں اس لیے جگہ کیے ہوئے ہے کہ حضورِ والا نے اپنی ترنم ریزیوں سے مسلمانوں کو وہ بھولے ہوئے اسباق یاد دلائے ہیں جو آج سے تیرہ سو سال پہلے عرب کی تپتی ہوئی ریگ پر کملی والے نے اسلام کی دل نواز اور روح پرور لَے سے اہلِ عرب کو سنائے تھے۔حضورِ والا نے جس بے باکی اور جس عالمانہ قابلیت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی گول میز کانفرنس میں کی اور جس طرح آپ کی مدّبرانہ اور محققّانہ تقاریر نے دشمنانِ حقوقِ اسلامی کے ایوانوں میں لرزے ڈالے، وہ آج ہر خاص و عام مسلمانوں کے دل سے اخلاص کی نذر وصول کرنے کے علاوہ آپ کی شخصیت کی مرغوبیت کو چار چاند لگا رہی ہیں،لیکن

ان جملہ حقائق کے باوجود ہم حضورِ والا سے حضور ہی کے الفاظ میں گزارش کریں گے۔

دشتِ حجاز منتظر ریگِ عراق تشنہ کام
خونِ حسین باز دہ کوفہ و شامِ خویش را

(تیرے دل کے حجاز کا دشت منتظر ہے اور تیرے فراق کی ریت پیاسی ہے۔ تو اپنے کوفہ وشام کو خونِ حسینؓ سے دوبارہ سیراب کردے۔)

حضرت علاّمہ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ:

''آپ نے اس استقبال اور سپاس نامہ کے پیش کرنے سے میری جس قدر عزت افزائی کی ہے، مَیں اس کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ میری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ آپ کی خدمت میں گزرا ہے اور آپ میری سابقہ زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اوّل سے لے کر اب تک میری زندگی کا مطمعِ نظر یہی رہا ہے کہ مسلمان موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں، وہ دور ہو جائیں۔ جہاں تک مجھ سے ہوسکا مَیں نے گول میز کانفرنس میں اسلامی حقوق کے تحفّظ کی پُوری پُوری کوشش کی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں کہا، جس سے مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ باہمی اختلافات کو دور کرنے کے لیے یہ ایک زرّیں موقع ہے۔ وہ اپنی سابقہ روایات کی روشنی میں متحد ہو سکتے ہیں۔ مَیں نے یورپ میں اس امر کا بخوبی مشاہدہ کیا ہے کہ وہاں کا ہر مرد اور عورت ماہیّتِ اسلام سے آگاہ ہونے کے لیے بے تاب ہے اور وہ ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہیں، جس سے انسان کی روحانی تشنگی کا ازالہ ہو سکے۔ وقت چونکہ تنگ ہے اس لیے مَیں اس موضوع پر مفصّل تقریر نہیں کرسکتا اور اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے آپ سے دوبارہ یہی درخواست کروں گا کہ خدا کے لیے اپنے تمام اختلافات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی، بالکل مٹا دیں اور ایک ہو جائیں۔ اس وقت تمام اسلامی سلطنتوں نے بڑی حد تک اِن نقائص کو دور کر دیا ہے۔ آپ کو بھی ان کی تقلید کی کوشش کرنی چاہیے''۔

پلیٹ فارم سے باہر آنے میں کم وبیش ۲۰ منٹ صَرف ہو گئے۔ اکثر اصحاب حضرت علاّمہ کے دولت کدہ تک ساتھ آئے۔ دولت کدہ پر پہنچنے کے بعد بھی اکثر اکابر ملاقات کے لیے تشریف لائے جو اسٹیشن پر نہیں پہنچ سکے تھے۔

☆☆☆

باب: ۱۵

جامعہ مِلّیہ اسلامیہ دہلی کا سفر

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں ایک معتبر نام ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہی یہ تأثر عام ہو گیا تھا کہ علی گڑھ کالج اُن مقاصد کو پورا کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔ جن کو ذہن میں رکھتے ہوئے سر سیّد احمد خان نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اِس کی بنیادی وجہ کالج کے لیے سرکاری گرانٹ، سرکار کے تعلقات اور پھر سرکار کا عمل دخل تھا۔ مسلم اکابرین نے بہت کوشش کی کہ کالج کو سرکار کے عمل دخل سے آزاد کرایا جائے مگر سیاسی حالات کے تقاضے اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس لیے مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ کالج کے سیکریٹری اور سر سیّد کے دستِ راست نواب وقار الملک (اگرچہ نواب صاحب اس وقت وفات پا چکے تھے) کی پیش کی ہوئی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۲۰/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں اس نئے ادارے کی بنیاد رکھی۔ لیکن پانچ سال بعد ۱۹۲۵ء میں یہ نئی جامعہ ہندوستان کے مرکزی شہر دہلی منتقل ہو گئی۔ مولانا محمد علی جوہر اس ادارے کے پہلے وائس چانسلر تھے۔ اس ادارے کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی باگ ڈور شروع ہی سے ایسے ہاتھوں میں آئی جنھوں نے اس کی سر بلندی کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کر دیں۔ حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی مخلص، قابل اور محنتی شخصیات کی راہنمائی میں یہ ادارہ دن دگنی، رات چوگنی ترقی کرتا گیا (ذاکر حسین بعد میں بھارت کے صدر بھی بنے، اُن کے بھائی محمود حسین پاکستان کے وزیرِ تعلیم اور دوسرے بھائی یوسف حسین علی گڑھ یونیورسٹی کے پرو چانسلر رہے) جامعہ مِلّیہ اسلامیہ کی سب سے اہم خصوصیت وہاں کے اساتذہ کا ایثار و قربانی کا جذبہ ہے۔ اِن قابلِ عزت لوگوں نے خود ڈھیروں روپیہ خرچ اور شب و روز محنت کر کے یورپ کی

بہترین یونیورسٹیوں سے جدید علم کے موتی اکٹھے کیے اور پھر معمولی مشاہروں پر محض قومی خدمت کے جذبے کے تحت علم کا یہ خزانہ جامعہ ملّیہ کے پلیٹ فارم سے ملّتِ اسلامیہ تک پہنچانے کا بندوبست کیا۔

جامعہ ملّیہ دہلی نے فروری ۱۹۳۳ء میں سابق وزیراعظم ترکی جناب رؤف پاشا کو مندرجہ ذیل عنوانات پر لیکچر کے لیے دعوت دی۔

۱) عثمانی دور کا انحطاط اور جدید تبدیلیوں کا آغاز..................۱۰/مارچ ۱۹۳۳ء

۲) نیشنلزم، پان اسلام ازم اور پان توران ازم میں کشمکش......۱۲/مارچ ۱۹۳۳ء

۳) ترکی اور جنگِ یورپ.......................................۱۴/مارچ ۱۹۳۳ء

۴) ترکی کا موجودہ دور اور مستقبل کے انتظامات.....................۱۶/مارچ ۱۹۳۳ء

(صاحبِ زندہ رُود نے دوسرے اور تیسرے اجلاس کی تاریخ ۱۸/مارچ اور ۲۰/مارچ لکھی ہے)

پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کی۔ دوسرے اور تیسرے اجلاس کی صدارت علاّمہ اقبال نے کی۔ علاّمہ اقبال اس کے لیے لاہور سے شام ۱۱/مارچ کو بذریعہ ریل روانہ ہوئے۔ دہلی میں ترکی کے پرنس جمی سے ملاقات فرمائی۔ خواجہ حسن نظامی نے علاّمہ کی بعض مصروفیات کا ذکر ہفتہ وار ''روزنامچہ'' دہلی مؤرخہ ۱۶/مارچ ۱۹۳۳ء میں یوں کیا۔

۱۲/مارچ ۱۹۳۳ء: ''بعد مغرب جامعہ ملّیہ کے جلسہ میں گیا۔ یہ مقام میرے گھر سے سات میل دور ہے۔ غازی رؤف پاشا کی تقریر تھی۔ ممبران اسمبلی اور دہلی کے سب تعلیم یافتہ ہندو، مسلمان اور بعض خواتین بھی موجود تھیں۔ پان اسلام ازم، پان توران ازم اور نیشنل ازم کے فرق پر خوب مباحثہ ہوا۔ یہ سب کچھ انگریزی میں ہوا مگر لطف مجھے بھی آیا۔''

۱۳/مارچ ۱۹۳۳ء: بارہ بجے دن نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملنے گیا جو ڈاکٹر مختار انصاری کے مکان پر مقیم ہیں۔ نواب بہادر یار جنگ ان کے بہت ہی مداح اور معتقد ہیں۔ مَیں نے نواب صاحب کا ڈاکٹر صاحب سے اِن الفاظ میں تعارف کرایا:

''اگر آپ بادشاہ ہیں تو یہ آپ کے سپہ سالار ہیں اور اگر آپ شمع ہیں تو یہ آپ کے پروانے ہیں اور اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو یہ آپ کے دیوانے ہیں۔''

مولا شفیع داؤدی ممبر اسمبلی بھی وہاں تھے۔ بہت دیر تک نہایت دلچسپ باتیں ہوئیں۔

غازی رؤف پاشا بھی وہیں آ گئے اور اُن سے بھی وہ باتیں ہوئیں جو وہ عوام کے سامنے نہیں کرتے۔''

بعد میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ساتھ شہزادہ ولی عہد مانگرول سے ملنے گیا۔ شہزادہ صاحب نے سر محمد اقبال صاحب کو مانگروال آنے کی دعوت دی اور خوب دلچسپ باتیں بھی ہوئیں۔''

مشہور ادیب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بطورِ خاص جامعہ ملّیہ دہلی کے اس جلسہ میں شرکت کے لیے تشریف لائے، وہ اپنی آپ بیتی ''گردِ راہ'' میں لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں اتاترک کے پرانے رفیق رؤف بے جامعہ ملّیہ کی دعوت پر ہندوستان آئے اور اُن کی تقریر سننے کے لیے مَیں اشرف کے ساتھ دہلی گیا اور کوچہ پنڈت میں احمد علی کے گھر ٹھہرے۔ جلسے کی صدارت علاّمہ اقبال نے کی اور انگریزی میں ایسی برجستہ تقریر کی کہ سب اُن کی بصیرت کے قائل ہوگئے۔ اس وقت تک ہم تینوں میں سے کسی کو اُن سے نیاز حاصل نہ تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ ڈاکٹر انصاری کی قیام گاہ (جدھر علاّمہ ٹھہرے ہوئے تھے) پر وقت مقرر کر کے اُن سے مِلا جائے۔ دوسرے دن مَیں نے فون کیا تو جواب ملا کہ اقبال شام کو ہر کس و ناکس سے ملتے ہیں جو چاہے بے تکلف آ جائے...... ملازم کی نشاندہی پر جب مَیں ایک کمرے میں داخل ہوا تو اقبال کو پلنگ پر دراز پایا، سلام کر کے کونے میں بیٹھ گیا۔ وہ تنہا تھے اور بلا تامّل میری طرف متوجہ ہوگئے۔ جب انھوں نے سُنا کہ مَیں میوات کے باغی کسانوں کا حال دیکھ کر اُن کی زیارت کے لیے دہلی ٹھہرا ہوں، تو مسکرا کر کہا، معلوم ہوتا ہے کہ تم تعلیم کی طرف توجہ کم دیتے ہو، ورنہ اِن مشاغل کے لیے وقت کیسے نکل سکتا ہے۔

مَیں نے عرض کیا کہ مَیں تجسس کی اس منزل پر ہوں جب رسمی تعلیم تضیعِ اوقات معلوم ہوتی ہے۔ مَیں حقیقت کا جویا ہوں اور اسی کو حاصلِ علم تصور کرتا ہوں۔ آپ جیسے بزرگوں کے فیض سے جو حاصل ہوگا وہ کسی درس گاہ میں کب میسّر ہوگا؟

اِس جواب پر اقبال محظوظ ہو کر اُٹھ بیٹھے اور پوچھا ''تمھارے ذہن میں حقیقت کا تصور کیا ہے۔''

عرض کیا کہ مَیں ابھی معاشی مسائل سے زیادہ سوچنے کی صلاحیّت پیدا نہیں کر سکا اور اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ انسانی بھوک اور شہوت کی تسکین کے علاوہ اور بھی کچھ ہے، اسی الجھن میں ہوں کہ ان بنیادی مسائل کا مناسب حل نکل آئے تو پھر انسان اپنی خفیہ صلاحیتوں کو صحیح طور پر بروئے کار لا سکے گا۔

اقبال نے کچھ دیر مجھے غور سے دیکھا اور فرمایا! بھوک اور شہوت کے مسائل حیوان اور انسان کے مشترک ہیں۔ جو قدر اِن میں امتیاز پیدا کرتی ہے وہ فلسفے کی اصطلاح میں ''آئیڈیا'' ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ایمان، ضمیر، اخلاق، مسلک وغیرہ کی شکلیں اختیار کرتا ہے۔ سوچو کہ انسان کی بہتری اور ترقی کی جدو جہد میں جن لوگوں نے مصائب جھیلے ہیں انھیں ان قربانیوں کے لیے کس نے مجبور کیا۔ کسی نورِ ایمان نے انھیں اس کاوش کے لیے اُبھارا۔ یہی جذبہ انسانیت کا جوہر اوراس کی سر بلندی کی ضمانت ہے۔

غرض کہ مَیں دیر تک اقبال کی سمع خراشی کرتا رہا مگر وہ بے لطف نہ ہوئے اور بوقتِ رخصت تاکید کی کہ جب کبھی لاہور آؤ تو مجھ سے ملو۔ بنا بریں لاہور میں چند بار اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آخری ملاقات ۱۹۳۵ء میں پانی پت میں مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کے مشہور جلسے میں ہوئی جب میرا مقالہ ''ادب اور زندگی'' اُن کی نظر سے گزر چکا تھا۔ کسی نے میرا تعارف علاّمہ اقبال سے اِن الفاظ میں کیا کہ آپ کی شان میں سخن گسترانہ باتیں لکھ گئے ہیں، تو انھوں نے کمال شفقت سے فرمایا ''ایسے مخلص نوجوانوں کی مَیں قدر کرتا ہوں، بے جان لوگوں کے اتفاق پر جاندار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں''۔

اُس وقت مَیں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیّت کی عظمت کا اعتراف کروں۔ غمِ دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمتِ انسان کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا۔''

جامعہ ملّیہ میں غازی رؤف پاشا کے تیسرے لیکچر (۱۴/مارچ ۱۹۳۳ء) کی صدارت بھی علاّمہ اقبال نے کی۔ لوگ متوقع تھے کہ آج پھر ایک فصیح و بلیغ خطبہ سننے میں آئے گا لیکن علاّمہ نے صرف چند منٹ تقریر کی اور یہ لطیفہ سُنایا:

''جنگِ عظیم کے ایّام میں ابلیس کے چند مرید اُس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ فارغ بیٹھا سگار پی رہا ہے۔ اس سے بے کاری کا سبب دریافت کیا تو اُس نے جواب دیا: آج کل مجھے بالکل فرصت ہے اس لیے کہ مَیں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کے سپرد کر رکھا ہے'' آخر میں آپ نے اپنی نظم ''مسجدِ قرطبہ'' کا آخری بند سنایا۔ دہلی میں قیام کے دوران آپ نے سیّد عبدالغنی (برادرِ اصغر مولوی سیّد میر حسن) سے بھی ملاقات کی۔ ۱۶/مارچ ۱۹۳۳ء کی صبح علاّمہ

واپس لاہور تشریف لے آئے۔ ۵/اپریل ۱۹۳۳ء کی صبح علاّمہ پھر دہلی آ گئے۔ کیونکہ ۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو مسئلہ تعلیم پر وائسرائے کے ہاں کانفرنس میں اقبال کو مدعو کیا گیا تھا اور وہ اس لیے کہ تیسری گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں انھیں اینگلو انڈین فرقہ کی تعلیمی کمیٹی کا رکن بنایا گیا تھا۔

۵/اپریل ۱۹۳۳ء ہی کی شام کو ذاکر حسین کی صدارت میں انھوں نے جامعہ ملّیہ میں ''لندن سے غرناطہ تک'' کے موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ اگلے روز انھوں نے وائسرائے کے ہاں اینگلو انڈین کمیٹی برائے تعلیم کی تقریب میں شرکت کی۔ وہاں سے فارغ ہو کر پھر جامعہ ملّیہ میں طلبہ سے خطاب کرنے آ گئے۔ مولانا اسلم جیراجپوری نے اُن کا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ اقبال ہمارے مدۃ العمر کے محبوب ہیں۔ انھوں نے شعر کہنا شروع کیے، ہمارے دل میں گھر کر لیا۔ ہم اپنی محبت کا اظہار اِن کے استاد ہی کی زبان میں کریں گے۔

ع تخلّص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

ان کا گھر بھی عشّاق کا دل ہے اور وہ ہم سب کے محبوب ہیں۔ اقبال نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور طلبہ سے خطاب کیا۔ بعد ازاں طلبہ سے بات چیت کی اور بیاضوں پر دستخط کرتے رہے۔ اقبال ۷/اپریل ۱۹۳۳ء کو لاہور روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

افغان باقی، کُہسار باقی

افغانستان کی موجودہ جغرافیائی حیثّیت ۱۷۴۷ء سے چلی آ رہی ہے۔ اپنی تخلیق کے روزِ اوّل سے ہی یہ بڑی طاقتوں کی کشمکش کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔

علاّمہ اقبال افغانستان کے مقام اور افغانیوں کے جذبۂ ایمانی کے گوہر کو پہچانتے تھے، وہاں کی تاریخی اصالت و اصابت سے واقف تھے انہیں معلوم تھا کہ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں بڑے بڑے حوادث اور طوفان اٹھے، لیکن ان تمام حوادث کے سیلابوں نے افغانستان کے بلند و بالا ننگے پہاڑوں میں دم توڑ دیا وہ پہاڑ جن کے دلیر و بہادر باشندوں نے ایمان و ایقان کی اس پختگی کے ثبوت کے طور پر صدیوں کی تاریخ میں اپنے اپنے نقوشِ پا نہایت پامردی اور مضبوطی سے گاڑے ہیں۔ اس کے امن سے پورے وسطی ایشیا بلکہ ایشیاء میں امن ہے، یہاں فساد یا معرکہ آرائی پورے ایشیا کا سکون و امن ہلا کے رکھ دیتی ہے۔ بقول اقبال:

آسیا یک پیکرِ آب و گِل است
ملّتِ افغاں دَر آں پیکر دل است
از فسادِ اُو فسادِ آسیا
دَر کشادِ اُو کشادِ آسیا

(ایشیا مٹی اور پانی کا ایک پیکر ہے۔ افغان قوم اس پیکر کا دل ہے۔ اس میں بدامنی کی صورت میں پورے ایشیا میں بدامنی ہوگی۔ اس میں امن و امان کی صورت میں پورے ایشیا میں امن و امان ہوگا۔)

اقبال کو افغانستان سے عشق تھا۔ بہت کم ایسے شاعر ہوں گے جو افغانستان میں پیدا ہوئے ہوں اور اُن کی آواز اقبال کی طرح ان کوہساروں سے خود افغانستان کی تعریف میں بلند

ہوئی ہو اور اس طرح اپنے افکار کے جواہر پاروں کو اپنی سخاوت و فیاضی کے ساتھ اس سرزمین کے قدموں پہ نثار کیا ہو۔ دیوانوں کی طرح اس سرزمین کے ساتھ اللہ کے حضور مناجات کی ہو اور دیوانوں کی طرح اپنے مرشدوں کے پیچھے گیا ہو۔ کتنے افغان شاعروں کو بارگاہِ سنائی میں شرفِ باریابی رہا ہوگا؟ غزنی اور علی ہجویری کے دیوانوں سے تعلق و واسطہ رہا ہوگا؟

امیر امان اللہ خان کی فتوحات اور ملک بدری

امیر امان اللہ خاں نے تیسری افغان جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں افغانستان کو مکمل خودمختاری دلائی اس لیے وہ ملّتِ اسلامیہ کی آنکھ کا تارا بنے۔ اقبال کو امیر امان اللہ خان کی ذات سے نہ صرف عقیدت تھی، بلکہ اُن سے انہیں بڑی توقعات بھی وابستہ تھیں۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنی تصنیف ''پیامِ مشرق'' امیر امان اللہ خان کے نام معنون کی۔ اقبال اور غلام رسول مہر کو افغانستان سے بہت دلچسپی تھی۔ ''انقلاب'' نے ۱۱؍دسمبر ۱۹۲۷ء کو غازی نمبر (امیر امان اللہ خاں) نکالا تو اس میں اقبال کی نظم ''کوش در تہذیبِ افغانِ غیّور'' شائع ہوئی۔ ۱۵؍دسمبر ۱۹۲۷ء کو ''ہدیہ بحضورِ شہر یار غازی'' اور ۱۶؍دسمبر ۱۹۲۷ء کو ''نذرِ شہر یار غازی'' شائع ہوئیں یہ تینوں نظمیں دراصل پیامِ مشرق کی نظم ''پیش کش بحضورِ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں فرماں روائے مستقلہ افغانستان'' کے تین اجزاء تھے۔ لیکن جب امیر امان اللہ خان نے افغانستان میں چند ایسی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی جو سیکولر نوعیّت کی اور اسلام کے منافی تھیں تو اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء اُن کے خلاف ہو گئے اور ۱۴؍اگست ۱۹۲۸ء کو افغانستان میں بغاوت کی ابتداء ہوئی۔ ہندوستان کی انگریز حکومت نے اپنی اغراض کے پیشِ نظر باغیوں کی مدد کی۔ لیکن برطانوی حکمرانوں کے دلوں میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے۔ انھوں نے امیر کے خلاف بغاوت کے شعلوں کو ہوادی اور باغیوں کو مسلح کیا جس کے نتیجہ میں ۱۷؍جنوری ۱۹۲۹ء کو بچّہ سقّہ نامی ڈاکو کابل پر قابض ہو گیا۔ امان اللہ خان جلاوطنی پر مجبور ہوئے۔

گو بچّہ سقّہ نے کابل میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا، مگر ملک بھر میں خانہ جنگی کی کیفیت طاری رہی۔ ۲۶؍فروری ۱۹۲۹ء کو لاہور کے ''ٹریبیون (Tribune)'' اخبار کے نمائندے نے افغانستان کے حالات کے متعلق اقبال کا ردِّعمل معلوم کرنے کے لیے اُن سے ملاقات کی تو انھوں نے فرمایا:

''معلوم ہوتا ہے کہ شہر یار غازی کی ناکامی کا سبب بڑی حد تک یہ ہے کہ انھوں نے اصلاحات نافذ کرنے میں عُجلت اور فوج کی طرف توجہ کرنے میں غفلت سے کام لیا اور دنیا کے ملاّؤں کے نظریے کے خلاف حقیقی ترقی میں گہری دلچسپی لی۔ اس سے بلا شبہ افغانستان کے چند علماء ناراض ہوگئے...... اس امر کے یقینی ہونے میں کوئی شبہہ نہیں کہ عالمِ اسلام میں قدامت پسندانہ جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہوگئی ہے۔ اغلب ہے کہ قدامت پسند اسلام بغیر جدوجہد کے سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا۔ اس لیے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہیے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں، جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہے۔ جو چیزیں غیر ضروری ہیں اُن کو ملتوی کر دینا چاہیے، کیونکہ ضروری چیزیں فی الحقیقت قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ امر صحیح نہیں کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر منزلِ ارتقا طے کرتی ہے''۔

افغانستان میں نادر شاہ کی فرمانروائی

افغانستان کے حالات تیزی سے بدلتے چلے گئے۔ بچّہ سقّہ کی حکومت جو صرف کابل تک محدود تھی، دیرپا ثابت نہ ہوسکتی تھی، اس لیے کسی ایسی متبادل قیادت کی ضرورت تھی، جس پر افغان بحیثیتِ مجموعی اعتماد کر سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت برطانیہ نے پیرس میں مقیم افغان سفیر جنرل نادر خان سے رابطہ قائم کیا۔ جنرل نادر خان نے تیسری افغان جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا اور ٹل کے مقام پر انگریزی فوجوں کو شکست دی تھی۔ چنانچہ جنرل نادر خان حکومتِ برطانیہ کی دعوت پر ہندوستان آئے۔ نادر شاہ سے اقبال کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اقبال نادر شاہ کو اس زمانے سے جانتے تھے، جب وہ پیرس میں افغانستان کے سفیر تھے۔ نادر شاہ بقولِ اقبال نصف پنجابی تھے، کیونکہ اُن کی والدہ کی جائے ولادت لاہور تھی اور وہ لاہور ہی میں رہائش پذیر رہیں۔ نادر شاہ خود بھی ڈیرہ دون کے پڑھے ہوئے تھے اور اردو بڑی اچھی بولتے تھے بلکہ اقبال کے ساتھ اردو ہی میں بات چیت کرتے تھے۔ اقبال کی ملاقات نادر شاہ سے کب ہوئی؟ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ بات مشہور ہے کہ وہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۹ء میں ایک دوسرے سے لاہور ریلوے اسٹیشن پر ملے، جب نادر شاہ افغانستان جاتے

ہوئے یہاں رکے تھے۔ نادر شاہ کا قد زیادہ لمبا نہ تھا اور ویسے بھی وہ دبلے پتلے سے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نادر شاہ نے اقبال کو دیکھ کر کہا کہ مَیں تو سمجھا تھا کہ آپ ایک لمبی چوڑی داڑھی والے بزرگ ہوں گے۔ اس پر اقبال نے جواب دیا کہ میرا خیال بھی یہ تھا کہ آپ کوئی قوی ہیکل قسم کے پہلوان ہوں گے، بہر حال نہ تو شاعرِ اسلام، نادر شاہ کی توقع کے مطابق نکلا اور نہ ہی غازیٔ اسلام کی صورت اس ذہنی تصویر سے مطابقت رکھتی تھی، جو اقبال نے بنا رکھی تھی۔ اس کے بعد ایک روایت تو یہ ہے کہ اقبال، نادر شاہ کو ایک طرف لے گئے اور انہیں بتایا کہ مَیں نے زندگی بھر میں دس ہزار کی ایک پونجی جمع کر رکھی ہے، مَیں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی مہم کے لیے اسے چندے کے طور پر قبول فرما لیں۔ نادر شاہ کو اگرچہ روپے کی ضرورت تھی، مگر انھوں نے اقبال کی پونجی لینے سے معذرت کر دی۔ جب اقبال نے اصرار کیا تو یہ طے پایا کہ اقبال یہ روپیہ اپنے پاس رکھیں اور نادر شاہ کو جب اشد ضرورت پڑے گی وہ منگوا لیں گے۔ نادر شاہ کو اس روپے کی ضرورت نہ پڑی۔ دوسری روایت یہ کہ گاڑی کی روانگی سے قبل اقبال نے نادر شاہ کو علیحدگی میں لے جا کر کہا:

تم ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو۔ مَیں ایک فقیر آدمی ہوں۔ صرف دعاؤں ہی سے تمھاری خدمت کر سکتا ہوں۔ اتفاق سے اس وقت میرے پاس پانچ ہزار روپے موجود ہیں۔ اگر یہ حقیر سی رقم تمھارے کسی کام آ سکے تو مجھے خوشی ہوگی۔ اس پر نادر شاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انھوں نے فقیر کی اس دین کو نیک شگون سمجھتے ہوئے بڑے احترام سے قبول کر لیا۔ خدا جانے یہ روایتیں کہاں تک درست ہیں۔ بہر حال نادر شاہ نے افغانستان کی تباہ حالی کے متعلق ہندوستانیوں سے ہر قسم کی امداد و اعانت کی اپیل کر رکھی تھی۔

جنرل نادر خان اور اُن کے بھائیوں نے آزاد علاقے میں وزیری اور محسود قبائل پر مشتمل لشکر تیار کیا اور انگریزی حکومت کے فراہم کردہ ہتھیاروں کے ساتھ افغانستان میں داخل ہو گئے، لیکن جب تک وہ افغانستان کی جنگ میں مصروف رہے، اقبال نے کسی نہ کسی طریقے سے اُن کی مدد جاری رکھی۔ اس سلسلے میں اقبال کی خدمت کا اعتراف جنرل نادر خان نے اپنے ایک مکتوب محررہ ۲ر اکتوبر ۱۹۲۹ء میں کیا، جس میں انھوں نے اقبال کو لکھا:

''آپ نے اپنے ان عالی جذباتِ ہمدردانہ سے، جو آپ افغانستان کی موجودہ تباہ حالی کے

متعلق رکھتے ہیں، مجھے اور افغانستان کے عام بہی خواہوں اور فدا کاروں کو ممنون و متشکر بنا دیا ہے۔ افغانستان تباہی کے نزدیک ہے، اس کی بے چارہ ملّت کو بہت بڑے تہلکہ کا سامنا ہے۔ افغانستان اپنے ہندی بھائیوں کی ہر قسم کی امداد و اعانت کا محتاج ہے۔ آپ ایسے وقت میں جو خیر خواہانہ قدم اٹھا رہے ہیں، وہ ہمارے لیے ڈھارس کا موجب ہے خصوصاً مالی امداد کا مسئلہ جس کے متعلق میں اخبار ''اصلاح'' کے ذریعے سے اپنے ہندی بھائیوں کے لیے شائع کر چکا ہوں، بہت حوصلہ افزا ہے۔ امید ہے کہ جناب فاضل محترم جو روحاً افغانستان کی موجودہ مصیبت میں شریک ہیں، اس موقع پر اپنی مساعی سے کام لے کر افغانستان کی رنج زدہ قوم کو ہمیشہ کے لیے ممنون و مشکور فرمائیں گے۔ باحترامات لائقہ۔ محمد نادر خان''۔

جنرل نادر خان کو وسیع مالی امداد فراہم کرنے کی خاطر سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے ایک جلسہ لاہور میں ۱۳؍اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں باہمی مشورے کے بعد اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ فی الفور نادر خان ہلال احمر فنڈ کے نام سے ایک فنڈ کھول دیا جائے۔ سرمائے کی فراہمی کے لیے ایک مجلسِ عاملہ قائم کی گئی، جس کے صدر اقبال منتخب ہوئے۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۱۱؍اکتوبر ۱۹۲۹ء کو مسلمانانِ ہند کے نام ایک اپیل بھی شائع کی۔ جس میں کہا:

''اس وقت اسلام کی ہزار ہا مربع میل سر زمین اور لاکھوں فرزندانِ اسلام کی زندگی اور ہستی خطرے میں ہے اور ایک دردمند اور غیور ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند پر ہی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ افغانستان کو بادِفنا کے آخری طمانچہ سے بچانے کے لیے جس قدر دلیرانہ کوشش بھی ممکن ہو کر گزریں''۔ غرض انھی ایّام میں جنرل نادر خان اور اُن کے لشکر نے کابل فتح کر لیا اور ۱۶؍اکتوبر ۱۹۲۹ء کو افغانستان میں محمد نادر شاہ کی بادشاہت قائم ہوگئی۔

دُنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

حکومتِ افغانستان کی تعلیمی اصلاحات کے لیے دعوت

ستمبر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ نے تعلیمی امور کے بارے میں مشورے کے لیے اقبال، سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ تعلیمی مقاصد کے حصول کے

سلسلے میں ہندوستان سے ان تین شخصیتوں کا انتخاب نہایت موزوں تھا، کیونکہ اِن میں ایک تو مفکّر تھا، دوسرا منتظم امورِ تعلیمی اور تیسرا عالم۔ اس سلسلے میں راس مسعود سے متعلق بہت دلچسپ واقعہ ہے کہ اُن کی شادی کو بہت تھوڑا عرصہ گزرا تھا بیگم راس مسعود نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ اس سفر میں ہمراہ چلنا چاہتی ہیں۔ سر راس مسعود کے لیے بیگم کی فرمائش کو ٹالنا کسی طرح ممکن نہ تھا، نئ نئ شادی ہوئی تھی، مناظر سے لبریز سفر، شاہی میزبانی، اِن حالات میں شریکِ حیات سے بہتر رفیقِ سفر اور کون ہوسکتا تھا۔ مگر اِس معاملہ میں راس مسعود نے ڈاکٹر اقبال سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا۔ ڈاکٹر صاحب سر راس مسعود اور بیگم مسعود دونوں کو عزیز رکھتے تھے اور اُن کا احترام کرتے تھے مگر یہ گھریلو نہیں قومی معاملہ تھا۔ انھوں نے راس مسعود کو جواب میں لکھا کہ حکومتِ افغانستان اپنے تہذیبی و تعلیمی نظام کی تکمیل و ترتیب کے لیے ہندوستان کے علماء کا وفد بلا رہی ہے اس کے ہمراہ ایک بے پردہ خاتون کا افغانستان کے حکمرانوں پر جو اثر مرتب ہوگا۔ وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں یعنی بیگم صاحبہ کو رفیقِ سفر بنانے سے ہندوستان کے مسلم ماہرینِ تعلیم کے خیالات و نظریات پر اُن کا وہ اعتماد ہی باقی نہ رہے گا، جس کی بنیاد پر اِس وفد کو بلایا گیا ہے۔ بیگم راس مسعود کے لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ جواب انتہائی دل شکن تھا مگر دونوں میاں بیوی نے ڈاکٹر صاحب کے مشورے کو آنکھوں پہ بٹھایا، وہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے جو مشورہ دیا ہے اس میں حکمت کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کا جذبہ بھی پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق سر راس مسعود بیگم صاحبہ کو ہمراہ لے کر نہیں گئے۔ افغانستان میں قیام اور وہاں کے عمائدین و ریاست کے اربابِ اختیار سے ملاقات اور سیّاحت کے دوران سر راس مسعود کو ڈاکٹر صاحب کے مشورہ میں پوشیدہ حکمت آشکارا ہوگئی۔

افغان قونصل جنرل کی خواہش تھی کہ یہ تینوں حضرات ۱۳/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جشنِ استقلال کے موقع پر کابل پہنچیں، مگر اس قدر جلد پاسپورٹ تیار ہونے کا امکان نہ تھا۔ بالآخر ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال اور سیّد راس مسعود کے پاسپورٹ مل گئے اور ان دونوں نے ۲۰/کتوبر ۱۹۳۳ء کو لاہور سے پشاور روانگی کا پروگرام بنالیا۔ روانگی سے قبل ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال نے ایک بیان میں اپنے سفرِ افغانستان کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''تعلیم یافتہ افغانستان، ہندوستان کا بہترین دوست ہوسکتا ہے۔ کابل میں ایک نئ یونیورسٹی کا

قیام اور ہندوستان کی مغربی سرحد پر اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں منتقل کرنے کی اسکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیان علاقے میں آباد ہوشیار افغان قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے بہت زیادہ ممد ثابت ہوگی۔ شاہِ افغانستان نے ہمیں اس لیے دعوت دی ہے کہ ہم وہاں وزیرِ تعلیم کو کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیں۔ ہم نے اس دعوت کو قبول کرنا اپنا فرض سمجھا۔ کابل میں شائع ہونے والے مختلف رسالوں سے پتا چلتا ہے کہ افغانوں کی نئی نسل نئے علوم کی تحصیل اور انہیں اپنے دین وتمدّن کے سانچے میں ڈھالنے کی بے حد خواہشمند ہے۔ افغان فطرتاً بہت خلیق لوگ ہیں اور ہندوستانیوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ افغانوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہورہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربے کی روشنی میں ہم انہیں تعلیمی مسائل میں مفید مشورہ دے سکیں گے۔ میرے ذاتی خیال میں خالص سیکولر تعلیم سے خصوصاً مسلم ممالک میں اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ بہر حال کسی نظامِ تعلیم کو قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ ہر ملک کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں اور ان ضروریات کی روشنی ہی میں اس کے نظامِ تعلیم کا تعیّن کیا جا سکتا ہے''۔

اقبال اور سیّد راس مسعود پشاور میں ٹھہرتے ہوئے ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل پہنچے اور انہیں کابل کی نئی آبادی دارالامان کے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ سیّد راس مسعود کے ہمراہ پروفیسر ہادی حسن بطور سیکرٹری آئے تھے اور اقبال کے ساتھ سیکرٹری کی حیثیت سے غلام رسول خان بیرسٹر آئے تھے۔ علی بخش بھی ان کی خدمت کے لیے ہمراہ تھا۔ دو تین روز میں تعلیمی معاملات کے متعلق مشورے کے سلسلے میں چند اجلاس ہوئے جن میں اقبال، سیّد راس مسعود اور حکومتِ افغانستان کے بعض سرکردہ نمائندوں نے شرکت کی اور سیّد راس مسعود نے تمام کاروائی کے نوٹس (Notes) بھی لیے، لیکن بدقسمتی سے اِن حضرات کی تجاویز کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ کابل میونسپلٹی نے ان کے لیے ایک دعوتِ چائے کا اہتمام کیا۔ بعد ازاں اقبال اور سیّد راس مسعود کی ایک ملاقات نادر شاہ سے قصرِ دلکشا میں ہوئی۔ اس ملاقات کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اقبال نے سوچا کہ شاہِ افغانستان کے لیے کوئی موٹر کار تحفۃً لے جائیں۔ پھر سوچا شاہ ہونے کے ناطے ان کے پاس ہر ساخت کی موٹر کار ہوگی۔ علی ھذا القیاس اور تحائف سے متعلق بھی ایسا ہی خیال ہوا۔ سوچا ایسا تحفہ لے جاؤں جو رفیع المرتبت اور بے نظیر ہو۔ چنانچہ اس کے لیے ایک

تاریخی مطلّا اور حمائل شریف قرآن تجویز ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب جب نادر شاہ کے حضور پیش ہوئے تو اعلیٰ حضرت کی آنکھوں میں وفورِ اخلاص سے معانقہ کے وقت آنسو آ گئے اور فرمایا الحمدللہ مَیں اس روز کو روزِ سعید سمجھتا ہوں کہ میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی نہایت خلوص بھرے الفاظ میں اس طرح اظہارِ عقیدت فرمایا کہ۔

بیابیا که بدامانِ نادر آویزیم
که مردِ نیک نهاد است و پاک طینت است
فقیرے در لباس خود امیرے
امیر دردمندے دل پذیرے

(آؤ آؤ کہ ہم نادر کے دامن سے وابستہ ہو جائیں کیونکہ وہ خوش اخلاق اور پاک طینت ہے۔ وہ بادشاہ کے لباس میں فقیر ہے۔ وہ دردمند بادشاہ ہے اور دلوں کو خوش رکھتا ہے۔)

معانقہ اور ملاقاتِ ''شاہِ افغانستان اور ''شاہِ سُخنستان'' کا ایسا سماں پرور اور دلچسپ منظر تھا کہ الفاظ میں تحریر مشکل ہے بہر حال سلام و پیام کے دور کے بعد اقبال نے فرمایا کہ ''اعلیٰ حضرت مَیں نے کوئی ہدیہ اور تحفہ حضورِ شاہانہ میں پیش کرنے میں بہت تفکر و تدبر سے کام لیا لیکن دُنیا کی ہر چیز مجھے ہیچ نظر آئی۔ مَیں نے خیال کیا کہ بحیثیت ایک جلیل القدر تاجدار نامدارِ افغانستان آپ کو سب نعمتیں حاضر ہیں۔ لہٰذا مَیں حمائل شریف اعلیٰ حضرت کی خدمت میں تقدیم کرتا ہوں جس کے کلام الملوک، ملوک الکلام (شاہوں کا کلام، کلام کا شہنشاہ) ہونے میں کوئی ریب و شک نہیں۔ اہلِ حق کی یہی دولت ہے۔ اِسی کے باطن میں حیاتِ مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتداء کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اِسی کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے''۔ نادر شاہ نے تعظیماً کھڑے ہو کر حمائل شریف کو بوسہ دے کر دونوں ہاتھوں سے سرو چشم پر رکھا اور فرمایا ''ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ ہدیۂ مبارک دے کر مجھے دونوں جہاں کی بادشاہی بخش دی ہے۔ اس عطیۂ بزرگانہ کے تشکر کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں، دعا فرمایئے اللہ مجھے عمل کی توفیق دے''۔ چنانچہ یہ مجلس نہایت تزک و احتشام سے ختم ہوئی اور ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ مجھے اس مجلس کے محبت آمیز و ولولہ انگیز تاثرات مدام الحیات (مرتے دم تک) فراموش نہیں

ہوں گے۔ اسی دوران میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا اور نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی مگر بقول ظہیر الدین' اقبال نے کہا کہ:

''نادر! مَیں نے اپنی عمر کسی شاہِ عادل کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی تمنّا میں گزار دی۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے پورا کرنے کے اسباب مہیّا کر دیے ہیں تو کیا آپ مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتے ہیں؟ آج مَیں آپ کی اقتداء میں نماز پڑھوں گا۔ امامت آپ کو کرنی ہوگی''۔

۲۶/اکتوبر۱۹۳۳ء کی رات کو سید سلیمان ندوی' اقبال اور راس مسعود سے آ ملے۔ اس شب سردار ہاشم خان صدرِ اعظم کے ہاں کھانا تھا۔ سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں کہ سردار ہاشم خان ہندوستانی مہمانوں کو کھانے کے کمرے میں لے گئے۔ کھانا میزوں پر لگا تھا اور ہر چیز یورپین طریقے سے آراستہ تھی۔ میز پر مختلف قسم کی باتیں شروع ہوئیں۔ سرور خان گویا (مشیرِ ادبی مطبوعات حکومتِ افغانستان) نے سیّد سلیمان ندوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مولانا پوچھ رہے ہیں کہ افغانستان کے اربابِ کمال کے حالات تو رسالہ ''کابل'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن جس شخص نے سب سے پہلے اہلِ کابل کو اسلام کی دعوت دی، اس کا ذکر ابھی تک نہیں کیا گیا۔ سب نے پوچھا کہ وہ کون بزرگ تھا؟ سیّد سلیمان ندوی نے بتایا، خراسان کے مقاتل بن حیان، بعد ازاں سردار فیض محمد خان وزیرِ خارجہ نے افغانستان کی تاریخ پر گفتگو شروع کی اور پنجاب کی قدیم سلطنتوں اور افغانستان کے تعلقات کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا۔ سیّد راس مسعود نے اپنے جاپان کے سفروں (جو تعلیمی معاملات سے متعلق تھے) کی رُوداد سنائی اور اقبال نے فلسفہ وسیاست کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مہمان ملاقات کے کمرے میں اکٹھے ہوئے اور چائے، کافی، سگریٹ وغیرہ سے اُن کی تواضع کی گئی۔ سردار ہاشم خان نے دریافت کیا کہ گانا سننے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ سیّد سلیمان ندوی نے فرمایا کہ بلا ساز کوئی مضائقہ نہیں، لیکن سردار ہاشم خان نے لفظ ساز کو سمجھے بغیر ارشاد کیا۔ ہمارے یہاں رَنڈی مَنڈی نہیں ہوتی مرد گاتے ہیں۔ اقبال نے ان کی تائید کیا۔ اسی اثنا میں لوگوں کا ایک دستہ آداب بجالا کر قالین پہ بیٹھ گیا اور نغمہ طرازی شروع کر دی انھوں نے حافظ اور بیدل کی غزلیں سنائیں۔ رات کے گیارہ بجے تک محفلِ سماع گرم رہی۔

۲۷/ اکتوبر ۱۹۳۳ء جمعہ کا دن تھا۔ نادر شاہ معمول کے مطابق مختلف مساجد میں نماز جمعہ ادا کرنے جایا کرتے تھے، مگر اس روز شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد پلِ خشتی میں نماز پڑھنے آ رہے تھے۔ اقبال اپنے رفقا سمیت اسی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے گئے۔ نمازی مسجد کے صدر دروازے سے لے کر محراب تک بھرے ہوئے تھے اور غریب مسلمانوں کی کمی نہ تھی۔ منبر پر ایک مولوی فارسی میں وعظ فرما رہے تھے، مہمانوں کو مقصورہ یعنی مسجد کے اُس حفاظتی حصّے میں لے جایا گیا جو بادشاہ کے نماز پڑھنے کے لیے مخصوص تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سب سنّتیں پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو خطیب نے عربی زبان میں خطبہ شروع کیا۔ آخر میں جب خطیب نے شاہ غازی ومجاہد شاہ نادر خان کا نام لیا تو نادر شاہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تواضع کے طور پر اپنے سر کو جھکا دیا۔ خطبے کے بعد دوگانہ جمعہ اور اس کے بعد معمول کی نماز ادا ہوئی۔ دعا کے بعد نادر شاہ نے مہمانوں سے کہا کہ مَیں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے اور اگر آپ لوگ پسند فرمائیں تو میرے ساتھ چل کر کھانا تناول کریں مگر دیگر ضروری کاموں کے سبب سب نے معذرت چاہی اور اس کے بعد نادر شاہ اُن سے مل کر رخصت ہوئے۔

واپسی پر اقبال اور سید سلیمان ندوی کے ساتھ کار میں ایک اور شخص بیٹھ گئے جن سے چینی ترکستان کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران اقبال نے فرمایا:

> ''یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت پر صَرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمد و رفت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے انھی جہازوں کے ذریعے سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا، لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی۔ اب آئندہ مشرق وسطیٰ (سنٹرل ایشیا) کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کی بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا۔ تجارتی قافلے اب موٹروں اور لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعے مشرق و مغرب میں آئیں گے اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا، اِس لیے اس انقلاب سے اِن اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا، اور اس وقت پہلے کی طرح پھر افغانستان کو دنیا کی شاہراہ بننے کا موقع ملے گا۔ اس لیے ابھی سے اس کی تیاری کرنی چاہیے''۔

مُلّا شور بازار سے ملاقات

چار بجے شام مجدّدی سلسلے کے روحانی پیشوا ملا شور بازار نور المشائخ سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ مّلا شور بازار کا اصلی نام فضل عمر تھا اور کابل شہر، قبائل اور فوج میں بکثرت اُن کے مرید

تھے۔ ۱۹۱۸ء کی جنگ افغانستان میں وہ جرنیل محمد نادر خان کے ساتھ شریکِ جہاد رہ چکے تھے، لیکن جب امان اللہ خان نے اصلاحات کے اجراء کے معاملے میں حدِ اعتدال سے تجاوز کیا تو وہ افغانستان چھوڑ کر ہندوستان آ گئے۔ محمد نادر خان کی کامیابی کے بعد وہ واپس افغانستان گئے اور انہیں وزیرِ عدالت مقرر کیا گیا۔ انھوں نے کچھ عرصے تک وزارتِ عدل کا کام انجام دیا لیکن پھر اسے اپنی درویشی یا صوفیانہ مسلک کے خلاف تصوّر کرتے ہوئے عملاً اس سے دست کش ہو گئے۔ اقبال کے ساتھ سید سلیمان ندوی بھی انہیں ملنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ ملا شور بازار ایک بار اقبال سے لاہور میں مل چکے تھے۔ اُن کا مکان ایک تنگ گلی کے اندر تھا اور ہر قسم کے تزک و احتشام اور ظاہری آراستگی سے خالی تھا۔ باہر نشست گاہ بھی نہ تھی۔ زنانہ مکان تھا۔ جہاں پردہ گرا کر ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت ملی۔ انہیں ایک لمبے کمرے میں لے جایا گیا، جس میں ایک طرف ایک پلنگ اور باقی زمین پر سادہ فرش بچھا تھا۔ پلنگ پر ملا شور بازار تشریف رکھتے تھے۔ اقبال اور سیّد سلیمان ندوی فرش پر جا کر بیٹھ گئے۔ ملا شور بازار کے پاؤں میں کوئی تکلیف تھی، جس کے سبب وہ چلنے سے معذور تھے، ہندوستان کے حالات اور افغانستان میں بچہ سقّہ کے ہنگامے کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ چائے نوشی کے بعد انھوں نے اقبال کو خشک میوے (بادام اور انجیریں) تحفے کے طور پر پیش کیے۔

برِّصغیر کے مسلمانوں کا استقبالیہ

ملا شور بازار کی قیام گاہ سے اقبال اور سیّد سلیمان ندوی، اللہ نواز خان کے مکان پر گئے، جہاں افغانستان میں مقیم برِّصغیر کے تقریباً ڈیڑھ سو باشندوں نے اُن کے اعزاز میں دعوتِ چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ سیّد راس مسعود وہیں پہنچ گئے۔ یہ دعوت باغ میں دی گئی تھی، کسی نے باغ کا فوارہ کھول دیا۔ چونکہ خاصی سردی تھی اور سیّد راس مسعود کو زکام تھا، اس لیے اُن کے کہنے پر وہ بند کر دیا گیا۔ اس موقع پر سردار فیض محمد خان (وزیرِ خارجہ افغانستان) نے برجستہ یہ شعر پڑھا:

گوہر شہوار می سازد نثارِ مقدمت
ورنہ از فوارہ مقصود دگر کے دارد آب

پہلا مصرع کسی اور شاعر کا تھا، لیکن دوسرا مصرع اُن کا اپنا تھا۔ اقبال نے احباب کے اصرار پر پہلے

مصرع میں تبدیلی کر دی۔ مگر سیّد سلیمان ندوی کو پورا مصرع یاد نہ رہ سکا۔ فرماتے ہیں کہ شاید یوں تھا:

می شمارد قدرِ احسانِ شما !

ورنہ از فوارہ مقصودِ دگر کے دارد آب

سرور خان گویا نے فی البدیہہ عرض کیا:

عقدِ مروارید می سازہ نثارِ مقدمت

ورنہ از فوارہ مقصودِ دگر کے دارد آب

حضرت علاّمہ اُن کا یہ شعر سن کر ایک منٹ خاموش رہے پھر فرمایا گویا صاحب

مے شمارد مہربانی ہا کہ بر ما کردہ ای

دانم از فوارہ مقصودِ دگر ہم دارد آب

چائے سے فراغت کے بعد تصاویر اتاری گئیں اور تقریریں ہوئیں۔ میز بانوں کی طرف سے مولانا محمد بشیر نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور انہیں مدعو کرنے پر حکومتِ افغانستان کا شکریہ ادا کیا۔ نیز ہندوستان کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ مصیبت کے بعد راحت آتی ہے۔ مہمانوں کی طرف سے سیّد سلیمان ندوی نے تقریر کی اور کہا کہ تاریخ میں ہندوستان نے افغانستان کے معاملے میں کئی دفعہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور اب وقت ہے کہ ہمارے بھائی اپنے حُسنِ خدمت سے اِن گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔ اس کے بعد اقبال نے ایک مختصر سی تقریر کی اور اسی پر جلسہ برخاست ہوا۔

نادر شاہ سے ملاقات

۲۸/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو سردار محمد ہاشم خان صدرِ اعظم مہمانوں کو ملنے کے لیے شاہی مہمان خانے میں آئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سیّد راس مسعود نے معدنیات اور سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا اور فرمایا کہ آئندہ تجارتی آمد و رفت کے سلسلے میں وسطی ایشیا اور افغانستان کی مرکزیت یقینی ہے۔ سردار محمد ہاشم خان نے کھانا اُن کے ساتھ کھایا۔

سردار فیض محمد خان وزیرِ خارجہ اور اللہ نواز خان تقریباً ہر روز انہیں ملنے کے لیے آتے تھے اور افغانستان کے انتظامی و تعلیمی امور پر گفتگو ہوتی تھی۔ اقبال اور سیّد راس مسعود تو ایک مرتبہ

اکٹھے نادر شاہ سے قصرِ دلکشا میں مل آئے تھے۔ سیّد سلیمان ندوی بھی ان سے ملاقات کی خاطرُ قصرِ دلکشا' گئے۔ نادر شاہ نے زیادہ گفتگو اردو میں کی اور انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ ''معارف'' کو ہمیشہ پڑھتے ہیں۔ سیّد سلیمان ندوی نے مسلۂ تعلیم کے متعلق انہیں اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور نوجوان افغانوں میں مذہبی شیفتگی و پابندی کے فروغ کے سلسلے میں کابل میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسی درسگاہ کے قیام کا مشورہ دیا۔ نادر شاہ نے آخر میں اُن سے گذارش کی وہ ہندوستان جا کر مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچادیں کہ آج ہم کو اور ان کو اتفاق اور اتحاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی کی بجائے ایک دوسرے کی حالت کو درست کرنے میں معاونت کی جائے تو بہتر ہے۔ پھر فرمایا:

''میری کوشش ہے کہ افغانستان میں دین و دنیا کو جمع کردوں اور ایک ایسے اسلامی ملک کا نمونہ پیش کروں، جس میں قدیم اسلام اور جدید تمدّن کے محاسن یکجا ہوں...... مَیں دین و ملّت کا خادم ہوں اور افغانستان کو صرف افغانوں کا ملک نہیں بلکہ مسلمانوں کا ملک سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی اس کو اپنا ملک سمجھیں...... میرے بھائیوں کو کہہ دیجیے گا کہ دنیا میں ایک نئے انقلاب کا مواد تیار ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی تعدادی، اقتصادی اور تعلیمی استعداد اس کے لیے پہلے سے تیار کرلیں''۔

سیّد سلیمان ندوی، نادر شاہ کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرّات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ نہایت شیریں اخلاق، منکسر المزاج، پُرمحبت اور رقیق القلب تھے۔ اور ان کی آنکھیں مولانا محمد علی جوہر کی طرح اشکباری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔

اسی روز یعنی ۲۸/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو چار بجے شام شاہ محمود خان وزیرِ جنگ کے ہاں چائے کی دعوت تھی، جس میں چیدہ چیدہ حضرات بلائے گئے تھے۔ چائے پر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ سید سلیمان ندوی نے افغانستان میں مذہبی عربی تعلیم کے متعلق اپنی اسکیم کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا۔

رائل اکادمی کا عشائیہ

ساڑھے سات بجے رات کابل کی انجمنِ ادبی یا یہاں کی رائل اکادمی نے اُن کے اعزاز میں کابل ہوٹل میں عشائیہ کا انتظام کیا۔ چنانچہ سب کابل ہوٹل پہنچے۔ ادبی انجمن سے منسلک

کابل کے اربابِ علم، اہلِ قلم اور تعلیم یافتہ نوجوان یہاں موجود تھے۔ انجمن کے سیکرٹری شہزادہ احمد علی خان درانی تھے جو اسلامیہ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ تھے اور شاہی سیکرٹریٹ میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ یہ انجمن ماہنامہ ''کابل'' بقول سیّد سلیمان ندوی، بہت آب وتاب سے شائع کرتی تھی۔ اور اقبال کے قیامِ کابل کے دوران میں اس ماہنامے میں ایک نظم بعنوان ''پیام اقبال بملّتِ کوہسار'' بھی چھپی تھی۔

جب سارے مہمان تشریف لے آئے تو صدرِ انجمن نے فارسی میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا، جس میں ہندوستان کے فضلاء اور سخنوروں کی تعریف وتوصیف کے بعد اقبال کی علمی خدمات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا تھا:

''ان کے قیمتی آثار وتالیفات جن میں سے ہر ایک نے اخلاق، سعی وعمل، اجتماع، جذبات شوق ودوستی اور احساساتِ اسلام پرستی کی اہل ایشیا کے جسموں میں روح پھونکی ہے''۔

خطبۂ استقبالیہ کے بعد افغانستان کے معروف شاعر عبداللہ خان نے مہمانوں کے اعزاز میں ایک طویل نظم پڑھی، جس میں بہت سے اشعار اقبال سے متعلق تھے۔ پھر مہمانوں کی طرف سے پروفیسر ہادی حسن نے فارسی میں تقریر کی۔ بعد ازاں سیّد راس مسعود اٹھے اور اپنی برجستہ تقریر میں سیّد سلیمان ندوی کا بحیثیتِ عالم ذکر کرنے کے بعد اقبال کے متعلق فرمایا:

''میرے معزز دوست علاّمہ اقبال اس گروہ کے نمائندے ہیں جس نے قدیم وجدید عناصر کو ملا کر ان سے ایک رُوح پرور معجُون تیار کیا ہے۔ مَیں نہ تو علماء کی جماعت سے ہوں اور نہ ہی شعراء کے فرقہ سے، بلکہ مَیں نے اپنی تعلیم کا دور زیادہ تر یورپ کے ممالک میں ختم کیا ہے لیکن میرا دل ان دونوں گروہوں کی عظمتِ احترام سے سرشار اور لبریز ہے...... افغانستان کے نوجوانوں کو چاہیے کہ سفید بال والوں کی عزت واحترام کا ہر وقت خیال رکھیں، ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے سے ان کی قومی وحدت میں رخنہ پیدا ہو جائے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں کے تمام نقصانات آپس میں نفاق اور تفرقہ کے نتیجہ میں ہُوئے ہیں''۔

سیّد سلیمان ندوی نے اپنی جوابی تقریر میں فرمایا:

''سیاسی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور سیاسی تعلقات ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں، لیکن علمی اور ادبی تعلقات دائم اور برقرار رہتے ہیں، سلطان محمود غزنوی کی تلوار عرصہ ہوا کہ ٹوٹ گئی اور اس کی فتوحات کے اوراق صدیوں میں بکھر گئے لیکن حکیم سنائی غزنوی کا قلم اب تک باقی اور

موجود ہے اور ان کی ادبی فتوحات کے اوراق کا شیرازہ اب تک منتشر نہیں ہوا ہے...... اہلِ سیاست کو ان کی شعبدہ بازیوں میں مصروف رہنے دیجیے۔ اور آیئے کہ ہم علم وفن کے نام سے پیمانِ محبت ودوستی کو تازہ اور عہدِ رفاقت وآشنائی کو مستحکم کریں اور ہم دونوں اپنے اپنے وطن کے اندر رہ کر علم وادب کے ایک جدید مشرق کی تعمیر میں دوش بدوش کام کریں''۔

سیّد سلیمان ندوی کے بعد اقبال نے تقریر کی جو بہت پُر اثر ثابت ہوئی فرمایا:

''میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوّری یا موسیقی یا معماری، ان میں سے ہر ایک زندگی کا معاون اور خدمت گار ہے۔ اسی بنا پر میں آرٹ کو ایجاد واختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔ اس وقت جبکہ حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانے میں افغانستان کی تاریخ ایک نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کی بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں، کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے، اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے۔ تو اس وقت وہ سخت خوفناک اور بربادکن ہو جاتا ہے۔ اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض پیامِ موت ہے:

دلبری بے قاہری جادوگری ست
دلبری با قاہری پیغمبری ست

ترجمہ: وہ دلبری جس میں سختی نہ کی جائے وہ جادوگری ہوتی ہے اور وہ دلبری جس میں سختی اصلاح کے لیے کی جائے وہ پیغمبری ہوتی ہے۔

علاّمہ نے مزید کہا کہ ''مَیں ایک نکتہ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے جو اس ملک کے گریبان کو اینگلو سیکسن اقوام کے قرضے سے نجات دلا سکے یا کسی دوسرے دانتے کو پیدا کرے جو نئی جنت پیش کرے، یا کسی نئے کولمبس کو پیدا کرے جو ایک نئے براعظم کا پتا لگائے، اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو مَیں کہوں گا کہ افغانستان کو ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملی کی زندگی سے آشنا کر سکے''۔

تقریروں کے بعد کھانا کھایا گیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد مجلس کچھ مدت تک قائم رہی۔ مہمانوں کی تواضع بھنے ہوئے بادام اور پستے سے کی گئی۔ چائے کے دور چلے جو بمطابق

رواج پہلی پیالی میٹھی اور پھر دوسری پیالیاں بے شکر یا تلخ پر مشتمل تھیں۔ اقبال کا حقہ اُن کا رفیق ِ سفر تھا اور وہ اسے دعوت میں بھی اپنے ساتھ لائے ہوئے تھے۔ رات گئے دارالامان واپسی ہوئی۔

ظہیرالدین بابر کے مقبرہ پر حاضری

اقبال، سرور خاں گویا اور خلیل اللہ خلیلی (دبیرِ اعلیٰ۔ صدرِ اعظم) کی معیّت میں بابر کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ بابر کا مقبرہ کابل سے باہر ایک ویران سی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے چھوٹی سی عمارت ہے اور قبر پر ایک بے گنبد سقف سی کھڑی کی ہوئی ہے۔ باغ میں چنار کے پُرانے اور گھنے درخت سایہ کیے ہوئے تھے اور عطر بیز آبشاروں کی روح کو تازگی بخشنے والی موسیقی میں سورج کی سنہری کرنیں ان چناروں کی چوٹیوں کو چُوم رہی تھیں اور سورج بھی آہستہ آہستہ کوہ ہندوکش کی چوٹیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ اقبال اور اُن کے دوست سر راس مسعود، سید سلیمان ندوی جو اپنی اپنی جگہ پر علم و ادب کے میدان میں چمکتے ستارے تھے۔ وہ ایک ایسے شخص کی قبر کی زیارت کے بے حد مشتاق تھے جس نے مغل بادشاہی کی بنیاد رکھی اور تین صدیوں کے قریب اُس کی اولاد اور عزیزوں نے اُن شہروں کی باگ ڈور سنبھالی جہاں کہ ابھی تک اُن کے بنائے ہوئے محل، باغات اور دیگر تائیسات شائقینِ مشرق و مغرب کی نگاہوں کے لیے ایک حیرت انگیز تحفے کی شکل میں اب بھی محفوظ تھیں۔ اقبال اپنے ساتھیوں اور ہمراہیوں کے ساتھ دُور سے ہی پہچانے جا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں عصا' بند گلے والا کوٹ (اچکن) پہن رکھا تھا اور ہندوستانی تنگ پاجامہ سفید رنگ کا مایہ لگا ہوا۔ براق کے کالے بوٹ اُنکے پاؤں میں دُور سے جگمگا رہے تھے۔ افغانی سیاہ قراقلی ٹوپی اُن کے سر پر ٹیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اُن کی نگاہوں اور چہرے کی کشش دیکھنے والے کا دل موہ لیتی تھی۔ اقبال نے بابر کے مزار کے لوحِ سنگ کو پڑھنے میں پہل کی۔ آپ نے ہر مصرعہ اپنے ہندوستانی لب و لہجہ میں انتہائی فصاحت سے یوں پڑھا گویا آپ نے خود ہی اشعار لکھے ہیں:

پادشاہی کز جنبش تافتی نور اللہ — آن ظہیرالدین محمد بود بابر پادشاہ
باشکوہِ دولت و اقبال و عدل و داد و دین — داشت از توفیق و فیض و فتح و فیروزی سپاہ
عالمِ اجسام را بگرفت وشد روشن روان — بہر فتح عالم ارواح چوں نور نگاہ

شد چو فردوسش مکاں رضواں زمن تاریخ جست
گفتمش فردوس دائم جای بابر پادشاہ

ترجمہ: بادشاہ جس کی حرکت سے اللہ کی یاد آتی ہے وہ محمد ظہیر الدین بابر ہے۔ وہ شان وشوکت ، رتبے اور عدل و انصاف اور دین والا ہے، جو خدا کی توفیق سے فتح مندی اور فیض رکھتا ہے۔ جس نے دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا اور روشنی کی طرح چلتا رہا۔ عالمِ ارواح کی فتح کے لیے وہ نورِ نظر تھا۔ جب وہ جنت میں اتر گیا تو جنت کے فرشتے رضوان نے مُجھ سے اس کی تاریخ چاہی۔ مَیں نے اس سے کہا خدا کرے فردوس ہمیشہ کے لیے بابر کا مکاں رہے۔

ایک ساتھی نے کہا:

اس باغ کی خوبصورتی اور عظمت نے بابر کو اس قدر مسحُور و متاثر کیا کہ اُس نے اپنے جدِّ بزرگوار کی میّت کو ہندوستان سے یہاں منتقل کرنے کی وصیّت کردی۔ جنابِ اقبال نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور چاہا کہ وصیّت کا سبب اپنے تجزیہ کے مطابق بتائیں۔ آپ نے اپنی پُرانی بیاض نکالی اور اُسے سنگِ مرمر کی تختی پر رکھا اور اپنے عصا کی بجائے پنسل ہاتھ میں تھامی اور لکھنے لگے۔ دورانِ تحریر خود کلامی میں مشغول رہے۔ کبھی غروب آفتاب کا نظارہ کر لیتے اور کبھی بابر کی آرام گاہ کی طرف دیکھتے، اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اقبال کہیں سے کچھ سُن رہے ہوں' کہاں سے؟ الہاماتِ آسمانی کی طرف سے یا اُس جسدِ خاکی سے جو قبر کے اندر بکھر گیا تھا۔ دس منٹ کے انتظار اور وقفہ کے بعد اقبال نے ایک تھکے ماندے مسافر کی طرح سانس لیا اور پھر اپنی لکھی ہوئی غزل کو مغل بادشاہ کے سرہانے اپنے شائقین کے سامنے پڑھنے لگے:

بیا کہ سازِ فرنگ از نوا بر اُفتاد است درونِ پردۂ او نغمہ نیست' فریاد است!
زمانہ کُہنہ بُتاں را ہزار بار آرا است! من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است
درفشِ ملّتِ عثمانیاں دوبارہ بلند چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ اُفتاد است!
خوشا نصیب کہ خاکِ تُو آرامید اینجا
کہ ایں زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاد است! (مثنوی مسافر......)

(آ کہ انگریز کے ساز کی آواز بے سُری ہوگئی ہے (بغیر نغموں کے پڑا ہے) اس کے سُر تال میں نغمہ نہیں (بلکہ) فریاد ہے۔ دُنیا نے ہزاروں بار پرانے بتوں کو سجایا ہے۔ (لیکن) مَیں حرم

سے باہر نہیں نکلا مَیں نے حرم کو نہیں چھوڑا کیونکہ اس کی بنیادیں مضبوط ہیں۔ عثمانیوں (تُرکوں) کا پرچم دوبارہ بلند ہوا تجھے مَیں کیا بتاؤں کہ تیموریوں پر کیا مصیبت پڑی۔ تو کیسا خوش نصیب ہے کہ تیرا جسدِ خاکی اس سرزمین میں آرام کر رہا ہے کیونکہ یہ سرزمین (کابل) انگریز کے طلسم سے محفوظ ہے۔)

چند افغان جو وہاں کھڑے تھے اقبال کے اِن اشعار سے حیران و ششدر رہ گئے اور داد دینے لگے کہ اقبال نے اپنے اتنے مختصر اور بلیغ الفاظ میں افغانستان کے عوام کے افتخارِ تاریخی، ملّی کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔

مہمان بادشاہوں کے اس قبرستان سے مسجد کی طرف بڑھے اور پتھروں کی سیڑھیاں قدم بقدم اُترے۔ سر راس مسعود نے اذان دی۔ اقبال نے اقامت کہی' اور سیّد سلیمان ندوی نے امامت کرائی اور سب نے اُن کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ نماز کی اس لذّت کو اور اُس سوز و گداز کو کون فراموش کر سکتا ہے جو گھنے چناروں کے بیچ میں سنگِ مرمر کی بنی ہوئی مسجد میں نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔ اس سجدۂ نیاز میں بہت سے لوگوں کی آنکھیں نمناک تھیں۔ اے کاش مغل بادشاہ بابر بھی تکبیر کی اس آواز پر لبیک کہتا ہوا اپنی صدیوں پُرانی خوابگاہ سے سر اُٹھا کر ہمارے درویش شاعر کے ساتھ کھڑا ہو جاتا اور بارگاہِ ایزدی، جس کی بادشاہی کو زوال نہیں ہے' مَیں سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی تلافی کرتا۔

نادر شاہ سے الوداعی ملاقات

۲۹/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کی شام کو اقبال دوسری اور آخری بار سردار فیض محمد خان وزیرِ خارجہ کی معیّت میں نادر شاہ سے ملنے کے لیے قصرِ دلکشا گئے۔ اِس ملاقات میں کیا گفتگو ہوئی؟ اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ اقبال کے رفقاء کابل سے اٹھارہ میل دور پغمان کی سیر کے لیے چلے گئے۔ رات کو کئی لوگ رخصتانہ ملاقات کے لیے آئے۔ کیونکہ اگلے روز اقبال، سیّد راس مسعود اور سیّد سلیمان ندوی کی کابل سے غزنین کو روانگی تھی۔

غزنیں کے لیے روانگی

۳۰/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو صبح آٹھ بجے وہ سرور خان گویا کی معیت میں غزنیں روانہ ہوئے۔ حکومتِ افغانستان نے مہمانوں کے قیام و انتظام کے لیے متوقع رہائش گاہوں میں پہلے ہی

احکام بھجوا رکھے تھے۔ سواری اور بار برداری کے لیے دو موٹروں اور دو لاریوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ایک موٹر میں اقبال، سیّد سلیمان ندوی اور غلام رسول بیرسٹر اور دوسری میں سیّد راس مسعود، پروفیسر ہادی حسن، سرور خان گویا اور عبدالمجید نمائندہ سفارت خانہ افغانستانِ دہلی سوار تھے۔ ایک لاری کھانے کے سامان اور کھانا پکانے اور کھلانے والے ملازموں کے لیے تھی اور دوسری لاری میں مہمانوں کا سامان واسباب تھا۔ اس کے علاوہ مہمانوں کی حفاظت کے لیے دس بارہ سپاہی اور ان کے افسر بھی انھی لاریوں پر سوار تھے۔ کابل سے غزنیں بیاسی میل ہے۔ راستہ بہت حد تک صاف اور سڑکیں اچھی حالت میں تھیں۔ زمین زیادہ تر ہموار تھی۔ گو دور دور پہاڑ بھی نظر آتے تھے۔ موٹریں ایک بجے دوپہر غزنیں پہنچ گئیں۔ مہمانوں کو سرکاری مہمان خانے میں اتارا گیا، لیکن پہلے سب بازار کی سیر کو گئے اور مسلم، ہندو اور سکھ دکانداروں سے ملے۔ واپس آ کر کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا۔ اور پھر چار بجے شام غزنین کے مزارات اور بقیّہ عمارات کی زیارت کو نکلے۔ پرانا غزنین جسے علاؤ الدین جہانسوز نے جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا تھا، اس کا اب نام ونشان بھی باقی نہیں۔ علاء الدین نے غزنیں پر قبضے کے بعد قتلِ عام کا حکم دیا تھا اور شہر کو آگ لگا دی تھی۔ شہر سات دن تک لگاتار جلتا رہا۔ تاریخ کی کتب میں درج ہے کہ جب شہر میں قتلِ عام ہو رہا تھا اور عمارتیں جل کر خاک ہو رہی تھیں تو علاء الدین جو تیغ زن کے ساتھ سخنور بھی تھا، مجلس عشرت میں بیٹھا قوالوں کی زبان سے اپنا کلام سن رہا تھا:

جہاں داند کہ من شاہِ جہانم
چراغِ دودہٗ عباسیانم
علاء الدیں حسین ابن حسینم
کہ دائم باد ملکِ خاندانم

ترجمہ: دنیا جانتی ہے خلافتِ عبّاسیہ میں روشنی میرے چراغ سے ہے۔ مَیں علاء الدین حسین ابنِ حسین ہوں۔ دعا کرو کہ میرے خاندان کی حکمرانی ہمیشہ رہے۔

نیا غزنیں احمد شاہ ابدالی کے بڑے فرزند اور جانشین تیمور شاہ نے تعمیر کرایا تھا، جو دراصل مٹی کا ایک بلند حصار ہے، جس کے اندر موجودہ شہر آباد ہے۔ قدیم غزنیں جو سلطان محمود کا پایۂ

تخت تھا، اس سے چند میل دور ہے۔ موجودہ شہر کی دوسری سمت غزنین کا پرانا قبرستان اور بعض کھنڈر ہیں۔ شاہی عمارتوں میں صرف چند مینار کھڑے نظر آتے ہیں۔ مزارات میں جو باقی رہ گئے ہیں وہ حکیم سنائی، سلطان محمود، سلطان مسعود، سلطان ابراہیم، حکیم بہلول دانا اور غالباً بعض دوسرے بزرگوں کے ہیں۔ غزنیں کے آثارِ قدیمہ کی سیر کے لیے سرور خان گویا نے ایک نوے سالہ بزرگ ملا قربان کو بلایا جو غزنیں کے کونے کونے اور گوشے گوشے سے واقف تھے اور بقول سیّد سلیمان ندوی، اس خضر کی رہنمائی میں وہ قدیم غزنیں کی سیر کو نکلے۔

حکیم سنائی کے مزار کی زیارت

آپ کا نام: مجدود بن آدم متخلص بہ سنائی، ۵۴۹ھ میں غزنی میں اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ وہ ایک عظیم شاعر اور معروف عارف و حکیم تھے۔ مولانا جلال الدین بلخی رومی نے مثنوی معنوی میں کئی بار اس کی تعریف و ستائش کی ہے اور اُسے امام الغیب اور فخر العارفین کے خطابات سے یاد کیا ہے اور نہایت انکسار سے کام لیتے ہوئے مثنوی کو الٰہی نامہ سنائی کے مقابلے میں کمتر اور ناپختہ قرار دیا ہے اور اس کی کئی داستانوں اور مطالب کی مثنوی میں تضمین و تشریح کی ہے۔ مّلا قربان پہلے سب کو مجذوب فقیر لائے خوار کی تربت پر لے گئے جو بازار کی ایک گلی کے اندر تھی۔ لائے خوار کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے حکیم سنائی کو دیکھ کر حقارت سے کہا تھا کہ سنائی سے بڑھ کر بے وقوف کون ہوگا جو اپنے ہی جیسے انسانوں کی مدح و ستائش میں خرافات نظم کرتا ہے اور اُن کو جا کر سناتا ہے۔ مجذوب کے اس فقرے سے حکیم سنائی بے حد متاثر ہوئے اور توبہ کی۔ علّامہ محمد اقبال کو سنائی سے خاص وابستگی اور عقیدت تھی۔ علّامہ اقبال حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کے لیے اس قدر بے تاب تھے کہ وہ رفقاء سمیت 'مہمان خانے سے پیدل ہی نکل کھڑے ہوئے۔ آقائے محمد سرور خان گویا جو افغانستان کی سیّاحت کے دوران اقبال کے ساتھ تھے فرماتے ہیں کہ:

''حکیم سنائی کے مزار پر جو حالت ہوئی اسے مَیں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ ابھی مزار ایک فرلانگ کے فاصلہ پر تھا کہ علّامہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ سیّد سلیمان ندوی اور سر راس مسعود مرحوم بھی ساتھ تھے۔ مزار پر پہنچے تو حضرت نے فرمایا کہ دس منٹ کے لیے مجھے سنائی کے

پاس تنہائی میں ٹھہرنے کی اجازت دیجیے۔ سیّد سلیمان ندوی، سر راس مسعود اور مَیں آپ کا یہ اشارہ سن کر باہر نکل آئے۔ مَیں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ علاّمہ مرحوم اس زور سے رو رہے تھے کہ ہمیں باہر کھڑے اُن کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دس بارہ منٹ بعد مَیں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ حضرت علاّمہ بچوں کی طرح زار و قطار رو رہے تھے اور بڑی عاجزی سے خدائے تعالیٰ کے حضور میں ملّتِ اسلامیہ کی بہتری کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔ اس دن شام تک آپ نے کسی سے گفتگو نہ کی اور گہرے فکر میں ڈوبے رہے‘‘۔

اس کیفیت کا اظہار انھوں نے ’’مثنوی مسافر‘‘ میں کیا ہے:

خفتہ در خاکش حکیمِ غزنوی از نوای او دلِ مرداں قوی
آں حکیمِ غیب ، آں صاحب مقام ’ترک جوش‘ رومی از ذکرش تمام
من ز ’پیدا‘ او ز ’پنہاں‘ در سرور
ہر دو را سرمایہ از ذوقِ حضور
(مثنوی پس چہ باید کرد)

(اس کی خاک میں حکیم غزنوی جیسا بلند مرتبہ سویا پڑا ہے۔ (ایسی شخصیت) جس کے ترانے سے بہادروں کے دل (اور بھی) قوی ہوتے ہیں۔ وہ حکیم غیب (اور) وہ بلند مرتبہ شخصیت (ایسی ہے) جس کے ذکر سے مولانا روم جیسی ہستی کی نیم پختگی کمال کو پہنچی۔ مَیں ظاہر کی بات کرتا ہوں اور وہ (سنائی) پوشیدہ سے سرور میں ہے ہم دونوں کا سرمایہ ذوقِ حضوری سے ہے۔)

سیّد سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں ’’حکیم سنائی کی جلالتِ شان سے کون واقف نہیں۔ ہم سب اس منظر سے متاثر تھے، مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا۔ وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے‘‘۔

اقبال نے سنائی کے لیے اس مطلع کے ساتھ قصیدہ کہا ہے:

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دُونست و آں والا
قدم زیں ہر دو بیروں نہِ ! نہَ این جاباش ، نی آنجا

(جسم و جان کے خیال (صحت) کو اپنی منزل نہ سمجھ۔ ان دونوں سے باہر قدم رکھ ان کا ہو کر نہ رہ جا۔)

اقبال کے اس عزائیہ قصیدہ کو فارسی زبان کے شعرا اساتذہ نے بے حد سراہا اور انھوں نے اپنے اپنے اشہبِ قلم کو اس راستے پر آزمایا ہے۔ جناب اقبال نے بالِ جبریل میں کہا ہے:

''نومبر ۱۹۳۳ء میں حکیم سنائی غزنوی کے مزار کی زیارت کا موقع نصیب ہوا' تو یہ قصیدہ اسی مشہور حکیم و عارف کی تقلید میں اس کے مزار مبارک کی مناسبت سے مَیں نے کہا۔''

سلطان محمود غزنوی کے مزار کی زیارت

سیّد سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق فقیروں کے جھونپڑے سے نکل کر قافلے نے قریب کھڑی موٹروں میں بادشاہوں کے محل یعنی سلطان محمود کے مزار کا رُخ کیا۔ رستے میں اپنے رہبر ملا قربان کی نشاندہی پر مختلف ٹیلوں پر انھوں نے بہلول دانا، سلطان ابراہیم اور سلطان محمود کے والد سبکتگین کے مزار دیکھے۔ سلطان محمود کا مزار ایک چھوٹے سے باغ میں ہے۔ سب اندر داخل ہوئے۔ سیّد سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں:

''اندر داخل ہوئے تو سلطان کی قبر نظر آئی۔ آہ! یہ اُس سلطان کی قبر ہے جو دیوارِ چین سے لیکر سومنات گجرات تک کے ملکوں پر فرمانروا تھا۔ جس کی ہیبت و جلالت سے بڑے بڑے گردن کش سرِ اطاعت جھکا دیتے تھے۔ آج وہ سلطان کسی بیکسی و بیچارگی کے عالم میں ایک سنسان باغ کے اندر یکہ و تنہا بسترِ خاک پر دراز ہے''۔

آقائے محمد سرور خان گویا نے شب و روز علاّمہ کے ساتھ گزارے وہ فرماتے ہیں کہ:

جب ہم سلطان محمود غزنوی کے مزار پر پہنچے تو آپ نے بوٹ اتار دیے اور آہستہ آہستہ قبر کی طرف بڑھے۔ مجھ سے فرمایا کہ ''مَیں ایک سلطان کے حضور میں جا رہا ہوں۔ ادب کا تقاضا ہے کہ جُوتے اتار کر جاؤں''۔ جب قبر کے نزدیک پہنچے تو مؤدبانہ طریق پر دونوں ہاتھ اس طرح باندھ کر کھڑے ہو گئے جس طرح نماز میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی عالم میں کھڑے آہستہ آہستہ اپنے آپ سے کچھ کہہ رہے تھے۔ مَیں نے غور سے سنا تو وہ مشہور غزل پڑھ رہے تھے جس کا مطلع یہ ہے:

خیز و نقاب بر کشا پردگیانِ ساز را
نغمۂ تازہ یاد دہ مرغِ نوا طراز را

(اٹھ اور ساز کے پردے میں چھپے ہوؤں کا گھونگھٹ کھول (نقاب اٹھا) خوشنوا پرندوں کو نیا نغمہ یاد کرا (سکھا) دین اسلام کے اعلیٰ اور پاکیزہ حقائق نوجوانوں کے سامنے پیش کرتا کہ ان میں جدو جہد کا ولولہ پیدا ہو۔ اُن حقائق سے روشناس کر جو قرآن مجید کے الفاظ میں پوشیدہ ہیں۔)

اور مقطع یہ ہے:

برہمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر
تو کہ صنم شکستہ ای بندہ شدی ایاز را

(برہمن نے غزنوی سے کہا، میری کرامت دیکھ۔ تو نے جس (پتھر کے) بت توڑ دیے تھے۔ ایاز اُن کا پرستار بن گیا ہے۔)

علاّمہ نے سلطان محمود غزنوی کو ''مثنوی'' میں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

آہ غزنی آں حریمِ علم و فن   مرغزارِ شیر مردانِ کُہن
دولتِ محمود را زیبا عروس   از حنا بندانِ او دانائے طوس!
خیزد از دل نالہ ہا بے اختیار   آہ! آں شہرے کہ این جا بود پار
آں دیار و کاخ و کُو ویرانہ ایست   آں شکوہ و فال و فر افسانہ ایست
وا رہیدم از جہانِ چشم و گوش   فاش چوں امروز دیدم صبحِ دوش
شہر غزنیں! یک بہشتِ رنگ و بُو
آبجو ہا نغمہ خواں در کاخ و کو

(مثنوی پس چہ باید کرد)

(افسوس وہ غزنی (جو کبھی) علم وفن کا گہوارہ (اور) پرانے شیر مردوں کا مرغزار تھا۔ جو محمود غزنوی کی سلطنت کے لیے حسین دلہن (دارالخلافہ) تھی جس کے ہاتھوں پہ مہندی لگانے والوں میں سے ایک دانا طوس (فردوسی طوسی) بھی تھا (فردوسی اس کی زیب و زینت میں اضافے کا سبب بنا)۔ دل سے بے اختیار نالے سر اُٹھانے لگتے ہیں کہ افسوس وہ شہر جو یہاں کل (قدیم میں) آباد تھا (کہاں گیا)۔ وہ شہر اور محل اور کوچے سب ویرانے بن گئے ہیں۔ وہ شان وشوکت اب قصیدہ کہانی بن گئی ہے۔ مَیں اس حواس کی دنیا سے بہت دور نکل گیا جہاں مَیں نے ماضی کی صبح کو حال کی مانند (اپنے سامنے) دیکھا۔ غزنیں کا شہر رنگ اور خوشبو کی بہشت ہے جس کے گلی کوچوں اور محلاّت میں ندیاں نغمہ خواں ہیں۔)

حضرت علی ہجویری کے والدین کے مزار پہ حاضری

پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان علی ہجویری، داتا گنج بخش کے نام سے

مشہور ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے انہیں مخدومِ امم، پنجاب کو زندہ رکھنے والا، قرآن کا پاسبان اور باطل کے گھر کو نابود کرنے والا کہا ہے۔ چنانچہ سلطان محمود کے مزار پر اقبال کو لاہور کی مناسبت سے حضرت علی ہجویری کے والدین کے مزارات کی تلاش شروع ہوئی۔ مُلّا قربان (رہبر) نے بتایا کہ ہجویری کے والدین غزنی کے قبرستان (اربابا) میں دفن ہیں جہاں پر اس کے عقیدت مند حاضری دیتے ہیں۔ داراشکوہ جو مغل شہزادہ تھا، نے بھی اس جگہ کی زیارت کی ہے اور اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال بھی غزنی میں آمد پر علی ہجویری کے والدین کی قبر پر گئے اور فاتحہ خوانی کی اور اُن کے مزار کی مٹی کو تبرکاً اپنے ساتھ لائے، اور کہا:

''اِس ماں کی گود میں ایک ایسے بیٹے نے پرورش پائی ہے جو کہ میرے شہر کے لوگوں کے لیے مرّبی کا درجہ رکھتا ہے، اور اِس خاتون کا فرزند ہندوستان کے جملہ مسلمانوں کا باپ کہلانے کا مستحق ہے۔''

اقبال نے اسرارِ خودی کی مثنوی میں ہجویری کی داستان کو نظم کیا ہے:

سیّدِ ہجویر مخدومِ اُمم مرقدِ اُو پیر سنجر را حرم
بند ھائی کوہسار آساں گسیخت در زمینِ ہند تخمِ سجدہ ریخت
عہدِ فاروق از جمالش تازہ شد حق ز حرفِ او بلند آوازہ شد
پاسبانِ عزتِ اُم الکتاب از نگاہش خانۂ باطل خراب

خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت
صبحِ ما از مہرِ اُو تابندہ گشت

(ہجویر کے سیّد اور مسلمانوں کے مخدوم (حضرت علی ہجویری) جن کا مزار حضرت معین الدین چشتی کے لیے ایک مقدس مقام تھا (انھوں نے ادھر چلّہ کشی کی)۔ انھوں نے پہاڑوں کے کٹھن راستے آسانی سے طے کیے اور ہندوستان کی سرزمین میں سجدے کا بیج بویا (اسلام کی تبلیغ کی)۔ اُن کے جمال سے حضرت عمرؓ کے عہد کی یاد تازہ ہوگئی۔ اُن کی باتوں (تبلیغ) سے دینِ حق کا شہرہ عام ہوگیا۔ حضرت، قرآنِ کریم کی عزت کے محافظ تھے اِن کی نگاہ سے باطل (شرک) کے گھروندے ویران ہوتے گئے۔ پنجاب کی سرزمین اُن کے دم سے زندہ ہوگئی۔ ہماری صبح اُن کے آفتاب سے منور ہوگئی۔)

قندھار آمد

یکم نومبر ۱۹۳۳ء کو صبح آٹھ بجے ناشتا کے بعد پھر سفر شروع ہوا۔ سردی کا وہی عالم تھا۔ تقریباً بارہ بجے قندھار پہنچے۔ یہاں موسم نسبتاً گرم تھا۔ شاہی قیام گاہ میں اترے۔ شہر کے بعض ممتاز افراد

ملاقات کے لیے آئے۔ اُن میں قابل ذکر عبدالحیٔ خان تھے جو قندھار میں وزارتِ خارجہ افغانستان کے نمائندے، یہاں کی ادبی انجمن کے ناظم اور پشتو رسالہ ''طلوعِ افغان'' کے مدیر تھے۔ وہ سندھ اور کراچی میں مقیم رہ چکے تھے۔ اس لیے اردو خاصی روانی سے بولتے تھے۔ وہ اس تحریک کے، کہ افغانوں کی قومی زبان پشتو کو ترقی دے کر تعلیمی، علمی و سرکاری زبان بنایا جائے، علمبردار تھے۔ انھوں نے آتے ہی اقبال کے ساتھ اس موضوع پر بحث شروع کی۔ اقبال نے زبانوں کی نشوونما اور ترقی کے اصولوں پر اظہارِ خیال کیا اور اس بات پر زور دیا کہ زبان ایک قوم کے مختلف افراد کی باہم پیوستگی کا سب سے ضروری اور مؤثر ذریعہ ہے۔ لیکن اگر اس تحریک سے قوم میں اتحاد کی بجائے اختلاف رونما ہونے کا خدشہ ہو تو وہ پیوستگی کا پیغام ہونے کی جگہ تنازعات اور اختلافات کا ترانۂ جنگ ہے۔ ابھی گفتگو جاری تھی کہ گورنر قندھار اپنے عملے سمیت مہمانوں کی ملاقات کے لیے تشریف لائے اور پھر دیر تک مختلف امور پر باتیں کرتے رہے۔

خرقہ شریف کی زیارت

سینا است کہ فاران است؟ یارب چہ مقامست این؟
ہر ذرۂ خاکِ من چشمی است تماشا مست!

(یہ وادیٔ سینا ہے یا وادیٔ فاران۔ اے اللہ یہ کونسا مقام ہے۔ یہاں میری خاکِ بدن کا ہر ذرہ آنکھ بن کر مستِ تماشا ہے۔)

یہ خرقہ یعنی رسول پاک ﷺ کا پشمی لباس تھا جو قندھار شہر میں ہے۔ یہ مقدس تحفہ عثمانی سلطان سلیم کے ذریعے ترکی لایا گیا تھا اور امیر تیمور فتحِ ترکی اور سلطان بایزید یلدرم کو شکست دینے کے بعد اُسے بخارا لے آیا تاکہ سمرقند پہنچایا جائے۔ احمد شاہ بابا ابدالی بادشاہ نے اِسے قندھار میں منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر اقبال نے قندھار میں خرقۂ مبارک کی زیارت کی۔

احمد شاہ ابدالی کے مزار پہ حاضری

خرقۂ شریف کی زیارت کے بعد اہلِ ایمان کا یہ مختصر سا گروہ سلطان احمد شاہ ابدالی کے مقبرے پر حاضر ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے مزار پر جو (قندھار میں ہے) پہنچے تو علاّمہ نے گویا صاحب سے فرمایا۔ ''مَیں بھی انارِ قندھار کی خاطر یہاں تک آیا ہوں''۔ اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ احمد

شاہ ابدالی نے انارِ قندھار کو ہندوستان کی بادشاہت پر ترجیح دی اور مرہٹوں کو شکستِ فاش دینے کے باوجود محض انارِ قندھار کے لیے ہندوستان چھوڑ کر واپس افغانستان چلا آیا۔ احمد شاہ ابدالی دیندار، انصاف پسند اور پُرجوش مجاہد تھے اور تاریخِ اسلام کے آخری حصے میں اس کی شخصیّت بہت نمایاں ہے۔ قبر پر عظیم الشان مقبرہ اس کے بڑے فرزند تیمور شاہ نے بنوایا۔ افغانوں میں اس مقبرے کا اس قدر احترام تھا کہ خونی مجرم بھی اگر بھاگ کر اس میں پناہ لیتا تو امان پاتا۔ قبر کے سرہانے قدرے بلندی پر قرآن مجید کا وہ نسخہ رکھا تھا جو خاص احمد شاہ ابدالی کی تلاوت کا تھا۔

اقبال، افغان عوام کے دلوں میں

برِّصغیر کا محترم و مشہور شاعر اور مفکّر کچھ دن کے لیے بقولِ خویش شاہبازوں اور شاہینوں کی سرزمین میں مہمان ہوا۔ ایسا مہمان جو میزبانوں کے غم اور خوشی دونوں میں خود کو شریک سمجھتا تھا۔

مشہور افغان مفکّر، مصنّف، شاعر جناب خلیل اللہ خلیلی جو افغانستان کے چیف سیکرٹری اور وزیرِ منصوبہ بندی بھی رہ چکے ہیں فرماتے ہیں کہ مجھے کبھی نہیں بُھولے گا کہ افغانستان میں آخری مسلمان فلسفی مرحوم علاّمہ صلاح الدین سلجوقی ہروی جو افغانستان کے وزیرِ اطلاعات اور قاہرہ میں افغان سفیر رہ چکے ہیں، نے جب اقبال کی مرقد کے لیے سنگِ وخام بھیجنے کی تجویز پیش کی تو آپ نے کہا تھا: ''لیکن اقبال کی قبر کے پتھر کو ڈھانپنے کے لیے مَیں اپنی آنکھوں کے پردے بھیجوں گا''۔ استاد کے یہ الفاظ کافی عرصے تک زبان زدِ عام رہے تھے۔

وطن واپسی

سیّد راس مسعود کو واپسی کی جلدی تھی اور وہ رات ہی کو قندھار سے رخصت ہو کر چمن پہنچنا چاہتے تھے تاکہ کوئٹہ سے دوپہر کی گاڑی پکڑ کر جلد سے جلد علی گڑھ پہنچ جائیں۔ اتفاق سے قندھار میں انگریزی حکومتِ ہند کی طرف سے قونصل سیّد صدیق حسن تھے، جو اقبال کے پرانے دوست سیّد غلام بھیک نیرنگ کے بھائی تھے۔ وہ عصر کے وقت انہیں ملنے آئے۔ سیّد راس مسعود نے اُن سے اپنے سفر کی مشکل کے حل کرنے میں مدد چاہی۔ سیّد صدیق حسن نے اُن کی مشکل آسان کر دی۔ چنانچہ سیّد راس مسعود اپنے شبینہ سفر پر روانہ ہو گئے اور باقی رفقاء نے رات قندھار ہی میں گزاری۔

۲/نومبر ۱۹۳۳ء کو صبح آٹھ بجے ناشتے سے فارغ ہوئے اور روانگی سے قبل گورنر قندھار نے

خشک میوؤں اور قندھاری انار کے ٹوکرے مہمانوں کو تحفے کے طور پر بھیجے۔ نو بجے کے قریب قندھار سے چمن کی طرف روانگی ہوئی۔ بارہ بجے قلعۂ جدید پہنچے جو افغانستان کی آخری چوکی تھی۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا۔ یہاں سرور خان گویا اور دیگر شاہی ملازمین نے اقبال اور اُن کے رفقا کو الوداع کہی اور موٹریں چند منٹ کے اندر افغانستان کی سرحد کو پار کر کے انگریزی علاقے میں داخل ہو گئیں۔

چمن میں اقبال اور ان کے رفقا کے آنے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ شہر کے دروازے پر ہی مسلمانوں نے اُن کا استقبال کیا اور ایک ریستوران میں لا کر بٹھایا۔ اہالیانِ شہر کا تقاضا تھا کہ اقبال اور سیّد سلیمان ندوی ایک شب چمن میں قیام کریں اور مسلمانوں کے سامنے تقاریر کریں، لیکن اِن حضرات نے معذرت کی۔ ریستوران میں مختلف خیال کے مسلمان جمع تھے، جو سیاسیات کی مختلف راہوں سے آشنا تھے۔ وہ اقبال اور سیّد سلیمان ندوی سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ اگرچہ چمن سے ریل شروع ہو جاتی ہے لیکن انھوں نے ایک دن بچانے کی خاطر چمن سے کوئٹہ تک موٹروں پر سفر کیا۔ وہ چار بجے شام چمن سے روانہ ہوئے۔ رستہ پہاڑی نشیب و فراز کے سبب بڑا دشوار گزار تھا اور موٹر کے پہیے خود بخود دھِسلے جاتے تھے، ڈرائیور موٹر کو بے تکان دوڑا رہا تھا تاکہ رات ہونے سے قبل وہ دشوار راہ کے خطروں سے باہر ہو جائے۔ اس جلدی پر بھی شام ہو گئی۔ سیّد سلیمان ندوی کچھ خوفزدہ سے تھے اور اقبال نے روحانیت کے ذاتی مشاہدات و تجارب اور ایک سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی۔ انھوں نے مختلف شیوخ اور بزرگانِ سلاسل کی باتیں کرتے ہوئے اپنے آغازِ زندگی اور طالب علمی کے عہد کا ذکر چھیڑا۔ پھر اپنے والد ماجد کا تذکرہ کیا اور اُن کی زندگی کے واقعات بیان کرتے رہے۔ پہاڑی رستہ اب ختم ہو چکا تھا اور میدان میں سے گزر رہے تھے۔ رات کی تاریکی خوب پھیل چکی تھی اور بجلی کے چراغوں کی روشنی دور سے قطار در قطار نظر آنے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ کوئٹہ میں تھے۔ کوئٹہ میں خاصی سردی تھی۔ انہیں ڈاک بنگلہ میں ٹھہرایا گیا۔ کھانا یہیں کھایا اور رات ڈاک بنگلے میں بسر کی۔

۳ر نومبر ۱۹۳۳ء کو کوئٹہ ریلوے اسٹیشن سے گیارہ بجے صبح کی گاڑی پکڑی۔ ریل دن بھر اور رات بھر چلتی رہی۔ ۴ر نومبر ۱۹۳۳ء کو بارہ بجے صبح ملتان پہنچی۔ یہاں تک سیّد سلیمان ندوی اور اقبال کا ساتھ رہا۔ سیّد سلیمان ندوی ملتان ٹھہر گئے۔ اقبال ملتان سے لاہور کی گاڑی میں بیٹھے

اوراسی روز رات کواپنے گھر پہنچ گئے۔افغانستان کے نادرشاہ اور دیگر زعماء نے انہیں بہت سے تحفے دیے تھے۔سردے، انگور، انار اور خشک میووں کی پیٹیوں کے علاوہ افغانی پتھر کی بنی ہوئی اشیاء، قالین اور خدا جانے کیا کیا کچھ ساتھ لائے تھے۔ جاوید (فرزندِ اقبال) کے لیے نادرشاہ نے ایک سونے کی گھڑی بھیجی تھی۔ کابل سے سردوں، انگوروں، اناروں اور خشک میووں کی پیٹیاں توان کے لیے بعد میں بھی کئی سالوں تک آتی رہیں۔

سفرِ افغانستان پہ اخباری بیان

۶رنومبر۱۹۳۳ء کو اقبال نے سیّد راس مسعود اور سیّد سلیمان ندوی کی معیّت میں سفرِ افغانستان کے متعلق ایک اخباری بیان دیا جس میں فرمایا:حکومتِ افغانستان کا ارادہ ہے کہ سارے محکمۂ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغانستان اور ہمسایہ ممالک کے درمیان والی سڑکوں کی مرمت کی جائے۔نئی یونیورسٹی بتدریج ترقی کررہی ہے اور اس کے لیے پہلے ہی ایک خوبصورت اور وسیع محل مخصوص کر دیا گیا ہے۔سب سے پہلے میڈیکل شعبہ قائم کیا گیا اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہوگئی ہے۔ دوسرا شعبہ جس کا قیام زیرِ غور ہے وہ سول انجینئرنگ کا ہوگا۔افغانستان آج ایک متحد ملک ہے، جہاں ہر طرف بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں اور حُکّام کافی سوچ بچار کے بعد نئے پروگرام بنا رہے ہیں۔

☆☆☆

باب:۱۷

حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری

علامہ اقبال ماضی کے صوفیائے کرام کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُن کی روحانی تعلیمات، نیز ہندوستان میں اشاعت وتبلیغ اسلام کے سلسلہ میں اُن کی گرانقدر خدمات کے معترف تھے بعض اوقات وہ روحانی فیض کی خاطر مزارات اور درگاہوں پہ حاضری بھی دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال نے جابجا خانقاہوں اور خانقاہ نشینوں پر اعتراضات بھی کیے ہیں۔ اسرارِ خودی کے شائع ہونے پر اُنہیں تصوّف اور سلاسلِ تصوّف کا مخالف سمجھا گیا تھا، مگر اُن کے کلام کے وسیع مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا اعتراض ریاکار، دکاندار، دنیا طلب صوفیوں پر ہے اور وہ تصوّف سے اِن دُور از کار عقائد و مسائل کو خارج کرنا چاہتے ہیں جو عجمیت کے زیرِ اثر اسلامی تصّوف میں در آئے ہیں۔ اقبال کے تصوّف کی بنیاد گھر میں پڑ چکی تھی۔ اُن کے والد ماجد ایک صوفی منش بزرگ تھے، خود اقبال سلسلۂ قادریہ میں بیعت کیے ہوئے تھے۔ اکابر طریقت سے اُن کی عقیدت کا حال اسی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ وہ مولانا جلال الدین رومی کی نظم سے بے حد متاثر تھے۔ پیرِ رومی کا ذکر ہر جگہ بڑی تعظیم سے کرتے ہیں اور خود کو اُن کا مریدِ ہندی کہتے ہیں۔ بزرگوں کے مزارات پر بالقصد بغرضِ زیارت وطلب برکت حاضر ہوتے تھے۔ بانگِ درا میں اُن کی نظم ''التجائے مسافر'' میں حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء سے انتہائی عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اقبال کی جوانی اور انگلستان جانے سے پیشتر کا واقعہ ہے۔ اور پھر واپسی پر بھی اُن کے مزار پر حاضر ہوئے۔ لیکن اگر بالفرض یہ جوانی کی خام کاری تھی تو بعد کی پختہ کاری بھی قابل غور ہے۔ بالِ جبریل ملاحظہ ہو۔ جس میں ایک نظم کا پہلا شعر یوں ہے:

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

شیخ احمد سرہندی (المعروف حضرت مجدّد الف ثانی) اور علاّمہ اقبال کے زمانوں میں تقریباً تین سو سال کی مدت کا فاصلہ ہے۔ جس طرح شیخِ مجدّد کی تحریک احیائے اسلام کی مخالفت علمائے سوء نے کی تھی اسی طرح بعض لوگ علاّمہ اقبال اور اُن کی اسلامی تحریک کے بھی خلاف کمر بستہ رہے۔ درج ذیل شعر میں اقبال نے ان واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی (بالِ جبریل)

اسی طرح فارسی میں کہتے ہیں:

از سہ قرن این اُمّتِ خوار و زبوں
زندہ بے سوز و سرورِ اندروں (پس چہ باید کرد)

(تین سو سال سے تیری اُمت خوار وزبوں ہے کیونکہ یہ باطن کے سوز وسرور کے بغیر زندہ ہے۔)

شیخ احمد سرہندی کا ایک واضح اور باقاعدہ نظامِ فکر ہے جس نے کئی مسلمان ممالک میں گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس لیے اقبال نے ان کی تعلیمات کو عموماً پیشِ نظر رکھا۔ ۱۹۳۳ء میں انگلستان کے ایک علمی حلقے میں بھی ان کے خیالات کو متعارف کرایا۔ اس ضمن میں ۸/اگست ۱۹۳۳ء کو پیر سیّد مہر علی گولڑوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''مَیں نے گزشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں ایک تقریر کی تھی جو وہاں کے اداشناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اب پھر اُدھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے۔ اقبال اپنے خطبے ''کیا مذہب کا امکان ہے'' میں مذہبی زندگی کے واردات ومشاہدات سے حضرت مجدد کی کمال آ گاہی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''نفسیاتِ حاضرہ نے مذہبی زندگی کا گویا قشر تک بھی نہیں چھوا۔ وہ اس تنوّع اور گونا گونی سے بالکل بے خبر ہے جو مذہبی واردات اور مشاہدات میں پائی جاتی ہے لیکن جس کا تھوڑا بہت اندازہ شاید آپ سترھویں صدی کے ایک بہت بڑے مرشدِ کامل حضرت شیخ احمد سرہندی کی ایک عبارت سے کرسکیں گے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے تصوف کا تجزیہ جس بیبا کی اور تنقید وتحقیق سے کیا وہ سلوک وعرفان کا ایک نیا طریق ہے جس نے ہندوستان کی حدود سے نکل کر باہر کا رخ کیا اور جواب بھی پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس میں ایک بہت بڑی اور زندہ قوت کی شکل میں موجود ہے (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ)۔

اقبال نے جس طرح اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ کاش نطشے شیخ احمد کے دَور میں ہوتا۔اس طرح اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہے کہ کاش وہ میرے زمانے میں ہوتا اور مَیں اس سمجھاتا کہ مقام کبریا کیا ہے۔

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

(کاش وہ حضرت مجدد الف ثانی کے زمانے میں ہوتا تاکہ وہ دائمی سرور میں رقص پیرا ہوتا۔)

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے (بال جبریل)

حضرت مجدّد الف ثانی اور علاّمہ اقبال برِّصغیر میں مسلمانوں کے دو نہایت خطرناک ادوار میں پیدا ہوئے۔ دونوں اپنے اپنے دور کے خلاف شدید ردِّعمل تھے۔ دونوں براہ راست وقت کی مخالف قوتوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ حضرت مجدد کو جس باطل ماحول کا مقابلہ کرنا پڑا وہ اکبر کی لادین حکمت عملی سے پیدا ہوا۔

اس نظم کے شروع میں جو تمہیدی عبارت ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

''نومبر ۱۹۳۳ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنوی کے مزارِ مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ چند افکار پریشان جن میں حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے، اس روزِ سعید کی یادگار میں سپردِ قلم کیے گئے۔'' الفاظ، مزارِ مقدس اور 'روزِ سعید' اپنی کہانی خود کہہ رہے ہیں۔

اس پختہ کاری کے زمانے میں غالبًا (اوائل) ۱۹۲۴ء میں حضرت امامِ ربانی شیخ احمد سرہندی المعروف مجدّد الف ثانی کے مزارِ پاک کی زیارت کے لیے اقبال لاہور سے چل کر سرہند آئے۔ اپنے دوست غلام بھیک نیرنگ کو لکھا جو انبالہ میں تھے کہ سرہند پہنچو۔ وہ وہاں سے آئے اور پھر سرہند ریلوے جنکشن سے دونوں دوست اکٹھے روضہ شریف پہ پہنچے۔ مزار پر حاضری ہوئی اور فاتحہ خوانی کے بعد اقبال دیر تک مراقبے میں رہے۔ زیارت کے بعد کچھ عرصہ روضہ شریف میں ٹھہرے۔ سجادہ نشین سے ملے اور پھر اقبال لاہور روانہ ہو گئے اور غلام بھیک نیرنگ انبالہ چلے گئے۔ حالتِ مراقبہ میں اقبال نے کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا؟ یہ ایک روحانی سر گزشت ہے جسے بیان کرنا مشکل ہے۔

دوسری دفعہ اقبال ۲۹/جون ۱۹۳۴ء کی شام سرہند تشریف لے گئے۔ رات وہاں قیام کیا

اور ۳۰ / جون ۱۹۳۴ء کو لاہور واپسی ہوئی۔ اس سفر میں چودھری محمد حسین، حکیم طاہر الدین، علی بخش اور جاوید اقبال (جن کی عمر اُس وقت تقریباً دس برس تھی) بھی ہمراہ تھے۔ غلام بھیک نیرنگ، ان کے پرانے دوست انبالہ سے سرہند پہنچے۔ اور سب نے اکٹھے مزار پہ حاضری دی۔ جاوید اقبال بھی اپنے والد کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہُوئے۔ اقبال تربت کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور جاوید کو بھی ساتھ بٹھالیا۔ قرآن مجید کا پارہ کھولا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے۔ جاوید کہتے ہیں ''اُس وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں اُن کی رندھی ہُوئی مدھم آواز گونج رہی تھی۔ اُن (اقبال) کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ کر رخساروں پر آرہے تھے''۔

مزار پر حاضری دینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جاوید کی پیدائش پر اقبال نے عہد کیا تھا کہ وہ اسے ساتھ لے کر حضرت مجدّد الف ثانی کے مزار پر حاضر ہوں گے۔ دوسری وجہ کے متعلق انھوں نے نذیر نیازی کو ایک خط مورخہ ۲۹ / جون ۱۹۳۴ء میں تحریر کیا۔ ''چند روز ہوئے صبح کی نماز میں میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے پیغام دیا، ہم نے جو خواب تمھارے اور شکیب ارسلان (شام کے معروف دروزی رہنما، اتحادِ ممالکِ اسلامیہ اور احیائے اسلام کے بہت بڑے داعی) کے متعلق دیکھا تھا، وہ سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے خدا تعالیٰ تم پر بہت بڑا فضل کرنے والا ہے۔ پیغام دینے والا معلوم نہیں ہوسکا کون ہے۔ اس خواب کی بنا پر وہاں کی حاضری ضروری ہے''۔

اقبال کو سرہند کا خطہ بہت پسند تھا۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے بعد کے خطوط میں تحریر کرتے ہیں۔ ''نہایت عُمدہ اور پُر فضا جگہ ہے۔ ان شاء اللہ پھر بھی جاؤں گا...... مزار نے میرے دل پہ اثر کیا ہے بڑی پاکیزہ جگہ ہے پانی اس کا سرد اور شیریں ہے شہر کے کھنڈرات دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آ گیا جس کی بنیاد حضرت عمرو بن العاصؓ نے رکھی تھی۔ اگر سرہند کی کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کے تہذیب وتمدن کے کیا کیا انکشافات ہوں، یہ شہر فرخ سیر کے زمانے میں بحال تھا اور موجودہ لاہور سے آبادی اور وسعت میں دُگنا تھا''۔

اقبال کا لاہور سے اتنی دُور دو دفعہ چل کر جانا ہی ثابت کرتا ہے کہ اُن کو حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ سے کس قدر عقیدت تھی۔ بالِ جبریل میں ایک نظم کا عنوان ہے ''پنجاب کے پیرزادوں سے''۔

اس کے چند اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ وہ مجدّد صاحب کو کیا سمجھتے تھے:

حاضر ہوا مَیں شیخِ مجدّد کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے — اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمئ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

☆☆☆

باب:۱۸

دارالاقبال-بھوپال

بھوپال کی اہمیت

آج کل بھوپال شہر بھارت کی ریاست مدھیہ پردیش کا دارالحکومت ہے۔جس کا رقبہ تقریباً ۳لاکھ مربع کلومیٹر ہے اور یہ بھارت کی دوسری بڑی ریاست ہے۔جبکہ بھوپال شہر کا رقبہ تقریباً ۶۵۰ مربع کلومیٹر ہے۔ایک وقت میں یہ ریاست کا نام تھا اور اس کا رقبہ تقریباً ساڑھے سات ہزار مربع میل تھا۔ یہاں مسلم تہذیب وتمدّن بڑے عروج پر تھی۔صرف شہر میں چار سو مساجد تھیں۔اس کی سب سے بڑی مسجد ''تاج المساجد'' کے نام سے مشہور ہے جس میں ایک لاکھ نمازیوں کی گنجائش ہے۔اس کی تعمیر ۱۸۶۸ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۷۱ء میں مکمل ہوئی۔ایک اور مشہور مسجد ''موتی مسجد'' ہے جسکی تعمیر بیگم سکندر جہاں نے کی اور یہ جامع مسجد دہلی کی طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔

برصغیر میں پانچ سو باسٹھ ریاستیں تھیں ان میں گیارہ اہم ریاستیں ایسی تھیں جن کے سربراہ کو وائسرائے کی دعوت پر دہلی آنے پر ۱۹ توپوں کی سلامی دی جاتی تھی، ریاست بھوپال اُن میں شامل تھی۔ ریاست بھوپال مرہٹوں اور راجپوتوں کے درمیان گھری ہوئی تھی اس کی بنیاد اٹھارویں صدی کے شروع میں تیرہ بستی (جو پاکستان کے قبائلی علاقہ میں ہے) کے افغان اورکزئی سردار دوست محمد خان نے رکھی۔

دوست محمد خان کے جلد انتقال ہو جانے کی وجہ سے حکومت اس کے بیٹے یار محمد کو منتقل ہوگئی۔ یار محمد نے حکومت سنبھالنے کے بعد ایک ہندو حسینہ ممولہ بائی سے شادی کر لی۔یار محمد کی وفات کے بعد ممولہ بائی نے یار محمد کی مسلمان بیوہ اور اس کے مسلمان بچوں کی طرف سے حکومت سنبھالی۔کوئی پچاس برس تک اس نے کامیاب حکومت کی۔شاید ایسی ہی صورت حال کے بارے میں کہا گیا ہے۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔

ممولہ بائی نے کچھ ایسی طرح ڈالی کہ ریاست کی ۲۴۰ سالہ تاریخ کے ۱۵۰ سال ایسے ہیں جب وہاں کسی نہ کسی خاتون فرماں روا کی حکمرانی تھی۔ یکے بعد دیگرے چار بیگمات (قدسیہ بیگم، سکندر بیگم، شاہ جہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم) کی باری آئی۔

یوں تو ریاست بھوپال کے سب حکمران مسلم کالج علی گڑھ کے سلسلہ میں سرسید احمد خان کی سرپرستی کرتے رہے۔ مگر بیگم سلطان جہاں نے اس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے ریاست کے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ بیگم سلطان جہاں کسی طور بھی تماشا پسند حکمران اور چانسلر نہیں تھیں۔ وہ ایک سنجیدہ مزاج خاتون تھیں۔ قوم پرور، فیاض، منتظم، امانت دار، شہ سوار، نیزہ باز، قرآن پر عبور رکھنے والی، نماز قضا نہ کرنے والی، عید گاہ کے زنانہ حصے میں سب کے ساتھ مل کر عیدین ادا کرنے والی، برقع پہن کر تقریر کرنے والی، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور تہذیبی پسماندگی پہ آزردہ رہنے والی، رسومات اور اسراف کو گناہوں اور افلاس کا سبب ٹھہرانے والی، انگریزی تعلیم بالخصوص سائنس و ٹیکنالوجی کو ترقی کے لیے اساسی اہمیت دینے والی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں ایک خاص امتیاز رکھنے کو اپنی سب سے بڑی آرزو اور تمنا قرار دینے والی خاتون تھیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بھوپال کی حکمراں (۱۸۴۴ء تا ۱۸۶۸ء) بیگم سکندر جہاں نے نہایت عقلمندی سے بھوپال کو اس افراتفری سے بچایا آس پاس کے علاقوں سے بہت سی فرنگی خواتین اور بچوں نے بھوپال میں پناہ حاصل کی۔ اس حُسنِ سلوک پر انگریز بہت شکر گزار رہے چنانچہ ۱۸۶۱ء میں وائسرائے لارڈ کیننگ (Lord Canning) نے بیگم صاحبہ کو دہلی آنے کی دعوت دی تو انہیں ۱۹ توپوں کی سلامی دی گئی۔ بیگم صاحبہ کو معلوم ہوا کہ دہلی کی جامع مسجد میں انگریزوں نے اصطبل بنایا ہوا ہے اور وہاں غلاظت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ تو انہیں بہت دکھ ہوا اور وائسرائے سے بات کر کے اُس کو قائل کیا کہ یہ نہ صرف اسلام بلکہ مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز قدم ہے، مسلمان ایک بہادر قوم ہیں اور ان کی ہمدردی حاصل کر کے انگریز فائدے میں رہیں گے۔ وائسرائے نے یہ بات مان لی اور مسجد کو خالی کرنے کا اسی وقت حکم دے دیا۔ بیگم خود جھاڑو اور ماشکی لے کر جامع مسجد پہنچی اور مسجد کو دھونا شروع کر دیا بعد میں دوسرے لوگوں نے بھی مدد کی۔ مسجد کی پاکیزگی کے بعد اذان دینے کا حکم دیا اور خود نماز میں شرکت کی بیگم کے اس

کارنامے نے انہیں نہ صرف بّرِصیغر بلکہ دنیائے اسلام میں ہر دلعزیز بنا دیا۔ یہ کارنامہ نظام حیدرآباد، بہاولپور، رام پور اور ٹونک کے نواب بھی انجام نہ دے سکے تھے۔اس کے بعد سکندر بیگم نے حج کا فریضہ ادا کیا۔

سلطان جہاں بیگم نے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۶ء تک حکومت کی ۔انھوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لاتعداد سکول، کالج کھلوائے، اعلیٰ جدید ہسپتال بنوائے، پکی سڑکیں تعمیر کروائیں اور روشنی کا انتظام کیا۔ مسافروں کے لیے سرائے خانے اور مفت قیام و طعام کا انتظام کیا کئی اہم صنعتی ادارے قائم کیے لوگوں کو کبھی بے روزگاری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔۱۹۰۳ء میں سلطان جہاں بیگم نے حج کا ارادہ کیا تو ایک بہت بڑا جہاز چارٹر کیا تمام شہر میں اعلان کیا گیا کہ جو بھوپالی مسلمان ساتھ جانا چاہے جا سکتا ہے اس کے تمام مصارف بیگم صاحبہ کے ذمہ ہوں گے۔کتنی حیرانی کی بات ہے کہ ایک فرد نے بھی اس پیشکش کو منظور نہیں کیا سب نے کہا کہ حج عبادت ہے اور اللہ توفیق دے تو خود کرنا چاہیے۔ مفت میں جائز نہیں۔ بیگم سلطان جہاں نے سرسیّد کی فراخدلانہ مدد کی اور علی گڑھ یونیورسٹی کی تعمیر مکمل کرائی۔ آپ علی گڑھ یونیورسٹی کی پہلی چانسلر بھی تھیں۔ سلطان جہاں نے روضہ رُسول ﷺ کے دروازے کے سامنے ایک کشادہ مکان خرید کر بھوپال کے حاجیوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد نواب بھوپال نے یہ پاکستان کو تحفے میں دے دیا اور یہ ''پاکستان ہاؤس'' بن گیا۔

سلطان جہاں بیگم ریاست بھوپال کی آخری خاتون حکمران تھیں۔ اپنے دو بڑے صاحبزادوں کے انتقال کے بعد، ۱۹۲۶ء میں وہ اپنے بیٹے حمید اللہ خاں کے حق میں دستبردار ہو گئیں۔ حمید اللہ خاں علی گڑھ کے گریجویٹ اور بہت ذہین و فطین تھے۔ وہ اعلیٰ منتظم ثابت ہوئے۔ عنانِ حکومت سنبھالتے ہی نواب حمید اللہ خاں کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ وہ نہ صرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چانسلر مقرر ہوئے بلکہ چیمبر آف پرنسز کے چانسلر بھی منتخب ہوئے۔

نواب حمید اللہ خاں (نواب بھوپال) کے بارے میں یہ عام تاثر ہے کہ وہ ایک بیدار مغز والئی ریاست تھے۔ انھوں نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیمی و ثقافتی ترقی کے لیے بہت کام کیا۔ ان کا دور ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا اور ۱۹۴۹ء میں ختم ہو گیا جب ریاست انڈین یونین میں

ضم ہوگئی (یا یوں کہیے زبردستی ضم کر لی گئی)۔

نواب بھوپال قائداعظم کے بھی بہت اچھے دوست تھے۔ اہلِ علم حضرات مثلاً چودھری خلیق الزماں، سر عبدالرحمٰن صدیقی، سیّد سلیمان ندوی، علاّمہ اقبال، سر راس مسعود، سر جوزف بھور وغیرہ کو بھوپال بلا کر استفادہ کرتے رہے۔ قائداعظم کی خواہش تھی کہ یہ پاکستان آ جائیں، وزیراعظم بن جائیں یا اُن کے بعد گورنر جنرل بن جائیں۔ لیکن انھوں نے اپنی رعایا کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ مگر ہر طرح سے پاکستان کی مدد کرتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم کی زندگی میں وہ پاکستان بھی آئے تھے۔ اس سلسلے میں ائرفورس کی طرف سے گورنر جنرل کے پہلے ایڈی کانگ میاں عطاء ربانی لکھتے ہیں:

''نواب بھوپال قائداعظم کے ذاتی دوست تھے اور قائداعظم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ (قیامِ پاکستان کے بعد) گورنر جنرل ہاؤس میں میرے سات مہینے کے قیام میں صرف تین اہم ترین شخصیتوں کو گورنر جنرل ہاؤس میں مہمان بننے کا شرف حاصل ہوا: جارج ششم کے بھائی ڈیوک آف گلوسٹر (Duke of Gloucester)' ان کی اہلیہ اور نواب بھوپال سر حمید اللہ خاں۔ نواب بھوپال لندن جاتے ہوئے دو راتوں کے لیے قائداعظم کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے گورنر جنرل ہاؤس میں ٹھہرے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے اور گھنٹوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ قائداعظم اپنا سگار پیتے رہے اور نواب بھوپال اپنا چاندی کے دستے والا حقہ۔ مَیں نے قائداعظم کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا جتنا ان دنوں''۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو لوگ بھوپال سے ہجرت کر کے پاکستان آئے انھوں نے بہت گرانقدر خدمات سرانجام دیں جن میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں ایٹمی سائنسدان اور شہر یار محمد خاں سابق سیکرٹری جنرل وزارتِ خارجہ نمایاں ہیں۔

مسلم رہنماؤں کی کانفرنس

برِّصغیر کی سیاست میں ایک وقت وہ آیا کہ جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے مسئلے میں مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے نواب بھوپال نے ۱۰رمئی ۱۹۳۱ء کو دونوں طریقوں کے حامی مسلمانوں کی کانفرنس بھوپال میں بلا لی۔

۷رمئی کو سیّد نذیر نیازی کا خط اقبال کے نام موصول ہوا۔ اسی روز آپ نے انھیں جواب

میں لکھا کہ مَیں پرسوں بھوپال جا رہا ہوں۔ دو چار روز وہاں قیام رہے گا۔

۹رمئی کو اقبال بھوپال کے لیے روانہ ہو گئے۔ غلام رسول مہر آپ کے ہمراہ تھے۔ نواب بھوپال، حمیداللہ خان صاحب کے ذاتی عملے میں سے ایک ندیمِ خاص، اقبال حسین نے بھوپال اسٹیشن پر علاّمہ کا استقبال کیا۔ آپ جب گاڑی سے اترے تو اقبال حسین نے آگے بڑھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور اپنا نام اور عہدہ بتایا۔ علاّمہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''خوب''۔ ندیمِ خاص انھیں لے کر قصرِ راحت منزل احمد آباد روانہ ہو گئے۔ کار میں سفر کرتے ہوئے راستے میں اقبال بھوپال کی بابت مختلف معلومات دریافت کرتے رہے۔ دورانِ گفتگو اقبال نے فرمایا: ''بھئی ہمارے خیال سے تو کشمیر، نواب صاحب بھوپال کو دے دیا جائے اور بھوپال مہاراجا کشمیر کو کیوں کہ وہاں مسلمانوں کی کثرت ہے اور یہاں ہندوؤں کی''۔

قصرِ راحت پہنچ کر تھوڑی دیر مہمانوں نے اپنے اپنے کمروں میں آرام کیا۔ آٹھ بجے ناشتہ ہوا۔ اسی دن گیارہ بجے نواب حمیداللہ خان صاحب سے ملاقات کا وقت طے تھا۔ اقبال حسین آپ کو وقتِ مقررہ پر قصر راحت منزل سے قصر سلطانی لے گئے۔ مسلمانانِ ہند کے دونوں بڑے رہنماؤں کے مابین ایک گھنٹہ تک ملاقات جاری رہی۔ واپسی پر اقبال نے کہا: ''مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ ہندوستان کا ایک والیِٔ ریاست ایسا عالی دماغ بھی ہوسکتا ہے۔ نواب صاحب قوم وملک کی قابلِ فخر ہستی ہیں''۔

بھوپال کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں ڈاکٹر انصاری، نواب محمد اسمٰعیل خان، شعیب قریشی اور نواب حمیداللہ خان نمایاں تھے۔ ۱۰رمئی کو نواب صاحب کی صدارت میں کانفرنس شروع ہوئی۔ واپسی پر ۱۲رمئی کو علاّمہ محمد اقبال، سر محمد شفیع، مولانا شوکت علی اور مسٹر شروانی نے یہ بیان اخبارات میں دیا:

> ''ہم ۱۰رمئی کو بھوپال میں ایک غیر رسمی جلسے میں جمع ہوئے تاکہ وہ اختلافات مٹا سکیں جن کی بنا پر مسلمان اس وقت دو سیاسی طبقوں میں تقسیم ہیں۔ ہم خوشی سے بیان کرتے ہیں کہ طرفین کے درمیان انتہائی خوش گوار اور دوستانہ ماحول میں گفتگو ہوتی رہی۔ جون کا پہلا ہفتہ مزید گفت و شنید کے تجربے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔''

بھوپال میں اقبال بیمار ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے علاج کرایا۔

۱۳رمئی کو آپ اور نواب محمد اسمٰعیل خان بھوپال سے روانہ ہو گئے۔ دہلی ریلوے اسٹیشن

پر اخبار اسٹیٹس مین کے نمائندے کو آپ نے ایک انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ بھوپال کانفرنس کے متعلق اخبارات میں جو اطلاعات شائع ہوئی ہیں، وہ اصولِ اساسی کے اعتبار سے درست ہیں۔ ہم دہلی قراردادوں کے موجد تھے لیکن ہم مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو کر متضاد مقاصد کی خاطر جدوجہد نہیں کر رہے۔ دونوں فریقوں میں تھوڑا بہت اختلاف رائے ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جب جون کے پہلے ہفتے میں کانفرنس کا اجلاس دوبارہ ہوگا تو تب تک کوئی ایسا اصول تیار ہو جائے گا، جو سب مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ تب موجودہ خفیف اختلاف بھی معدوم ہو جائے گا۔

۱۴ مئی کو صبح اقبال لاہور پہنچے۔ اسی روز آپ نے مولوی صالح محمد کو خط کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ نواب صاحب کی دعوت پر میں اس واسطے بھوپال گیا تھا تاکہ مسلمانوں کے سیاسی اختلاف دور کرنے کی کوشش کر کے انھیں ایک مرکز پر متحد کر دیا جائے۔

۱۵ مئی کو بھوپال کانفرنس کے سلسلے میں اقبال نے ایسوسی ایٹڈ پریس کے ایک پیغام سے متعلق ایک وضاحتی بیان دیا کہ کانفرنس میں عارضی میثاق قسم کی کوئی خبر حاضرین جلسہ کے خیال میں بھی نہیں آئی۔ اس جلسے میں صرف یہی کارروائی ہوئی کہ نام نہاد نیشنلسٹوں کو آل انڈیا کانفرنس کے فیصلوں کے قریب تر لانے کے لیے بعض تجاویز پیش کی گئیں تاکہ یہ لوگ پھر مسلم قوم میں شامل ہونے کے قابل ہو سکیں۔ کانفرنس نے جداگانہ انتخابات کا طریقہ بدستور بحال رکھنے کا ایسا فیصلہ صادر کیا ہے جس میں کسی قسم کے مغالطے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

جب سر راس مسعود نے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے سے استعفٰی دیا تو نواب بھوپال کے کہنے پر اُن کی ریاست میں وزیرِ تعلیم وصحت وامور عامہ کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس کے بعد علاّمہ اقبال اور نواب بھوپال کے تعلقات میں جو فروغ ہوا، اس میں سر راس مسعود کا کلیدی کردار رہے۔

بغرضِ علاج بھوپال آمد

اقبال اور سر راس مسعود کے تعلقات کا آغاز ۱۹۲۹ء میں ریاست حیدرآباد میں ہُوا جب راس مسعود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تھے اور اقبال توسیعی لیکچروں کے سلسلہ میں وہاں دوسری بار گئے۔ یہ روابط آہستہ آہستہ دوستی اور محبت میں تبدیل ہو گئے۔ ۱۹۳۳ء میں علاّمہ اقبال، راس مسعود اور سیّد

سلیمان ندوی کے ساتھ افغانستان گئے جہاں یہ رشتے اور مستحکم ہو گئے۔نومبر۱۹۳۳ء میں بھوپال آنے کے بعد راس مسعود کو اقبال کی علالت کا علم ہو چُکا تھا۔ دیگر احباب اور نیاز مندوں کی طرح انہیں بھی اقبال کی مسلسل علالت سے پریشانی تھی۔حمیدیہ ہسپتال کے ماہر ڈاکٹروں سے مشورہ کے بعد انھوں نے اقبال سے بھوپال آ کر علاج کرانے پر اصرار کیا۔خود نواب بھوپال بھی اقبال کی علالت سے فکر مند تھے اور اُن کی بھی یہ خواہش تھی کہ اقبال بھوپال آ کر اپنا علاج کروائیں۔ راس مسعود اور اقبال کے درمیان نومبر۔دسمبر۱۹۳۴ء کے دوران اس موضوع پر خط وکتابت رہی۔ بالآخر اقبال نے بھوپال جانے کا قصد کر لیا۔لیکن کوشش کے باوجود جنوری ۱۹۳۵ء سے پہلے بھوپال نہ جا سکے۔ بھوپال جانے کی غرض سے اقبال، علی بخش کے ساتھ ۲۹/جنوری ۱۹۳۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور ۳۰/جنوری کی صبح دہلی پہنچے۔دن بھر صلاح الدین سلجوقی کے ہاں افغان قونصل خانے میں قیام کیا۔شام کو جامعہ ملّیہ میں ترکی کی ادیبہ خالدہ ادیب خانم سے ملاقات ہوئی مگر اُن کے خیالات پر تبصرہ نہ کیا۔ بعد میں رات کی گاڑی سے بھوپال روانہ ہو گئے اور ۳۱/جنوری کی صبح وہاں پہنچے۔

راس مسعود کے پرسنل سیکرٹری ممنون حسن خاں لکھتے ہیں:

”مجھے یاد ہے سر راس مسعود بڑی بے چینی سے ریلوے سٹیشن پہ علاّمہ کا انتظار کر رہے تھے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کا منتظر ہو۔ جب گاڑی آئی تو ایک صاحب افغانی ٹوپی، شلوار اور پنجابی کوٹ میں ملبوس پلیٹ فارم پر اُترے۔ سر راس مسعود کی نظر اُن پر پڑی تو اس طرف تیزی سے آگے بڑھے اور اُن کے منہ پر اس قدر بوسے لیے کہ لوگ حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگے۔ جلد ہی سر راس مسعود میری طرف متوجہ ہوئے اور علاّمہ اقبال سے کہا۔ اس لڑکے سے ملو یہ میرا سکریڑی ہے۔ اگرچہ اقبال شاہی مہمان کی حیثیت سے نہیں آ رہے تھے، پھر بھی نواب بھوپال نے اپنے ملٹری سیکرٹری کرنل اقبال محمد خاں کو اپنے نمائندے کے طور پر اُن کے استقبال کے لیے بھیجا تھا۔کرنل اقبال محمد خاں نے آگے بڑھ کر کہا کہ نواب بھوپال نے سلام کے بعد کہا ہے کہ اگر آپ اور سر راس مسعود اجازت دیں تو آپ کے قیام کا انتظام شاہی مہمان خانے میں کیا جائے۔ آپ کے وہاں قیام سے نواب صاحب کو بے حد خوشی ہوگی۔ علاّمہ اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا کہ مَیں تو اس وقت اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔نواب صاحب سے ضرور ملوں گا۔ان کو میرا سلام اور شکریہ پہنچا دیجیے گا۔

ریاض منزل میں قیام

علاّمہ کا قیام سرراس مسعود کی رہائش گاہ ریاض منزل میں ہوا۔ ریاض منزل شہر سے دُور پُرفضا مقام پر واقع ہے۔ اس کوٹھی کے بالکل سامنے بھوپال کا بڑا تالاب ہے۔ رات کے کھانے کا انتظام سرراس مسعود نے خاص طور پر کیا تھا۔ علاّمہ اقبال نے سرراس مسعود کے ساتھ ہی ڈائننگ روم میں کھانا کھایا۔ کھانے کے درمیان ہی علاّمہ اقبال نے کہا کہ میرا کھانا سادہ ہونا چاہیے اور مَیں ڈائننگ روم میں کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ کھانے کے بعد ممنون حسن علاّمہ اقبال کا کمرہ دیکھنے گئے تو انہیں حیرت ہوئی کہ وہ بستر جو سرراس مسعود نے اپنے مہمانِ عزیز کے لیے بچھوایا تھا اُسے اُن کے ملازم نے اٹھا دیا تھا اور اُس کی جگہ اقبال کا معمولی بستر لگا دیا تھا۔ ممنون حسن نے دیکھا کہ علاّمہ اقبال کے بستر پر دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوانِ غالب۔ اُن کے پلنگ کے قریب ہی ایک پنجابی حقّہ رکھا ہوا تھا۔

''ریاض منزل'' کے زمانۂ قیام کے ایک اور غیر معمولی واقعے کا تذکرہ سیّد نذیر نیازی کے مضمون بہ عنوان ''علاّمہ اقبال کی آخری علالت'' میں ہمیں ملتا ہے وہ لکھتے ہیں......

''بھوپال میں حضرت علاّمہ کا قیام پہلی بار سرراس مسعود مرحوم ہی کے یہاں ''ریاض منزل'' میں رہا۔ اور سرراس مسعود اُن کے آرام و آسائش کا اتنا خیال رکھتے کہ خود حضرت علاّمہ کو بھی تعجب ہوتا۔ اُنھوں نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک روز جب انھیں پیٹھ کے درد کا ہلکا سا دورہ ہوا تو ڈاکٹروں نے سرراس مسعود سے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس درد کا اصلی سبب ضعفِ قلب ہے لہٰذا اُنھیں چاہیے کہ نقل وحرکت میں احتیاط رکھیں۔ حضرت علاّمہ کہتے ہیں:

''ریاض منزل'' میں میرا قیام بالائی کمروں میں تھا۔ جب مَیں اوپر جاتا تو سیّد صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ دونوں ہاتھوں سے مجھے سہارا دیتے تاکہ زینہ چڑھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک آدھ روز تو خیر مَیں نے اپنے شفیق دوست کی پاسداری کے خیال سے کچھ نہ کہا لیکن تیسری مرتبہ جب پھر یہی صورت پیش آئی تو مَیں نے کہا۔ آپ اور لیڈی صاحبہ ناحق تکلیف کرتے ہیں۔ اسی دن یا شاید اگلے روز مَیں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ سرراس مسعود دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور گھبرا کر کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کیا غضب کرتے ہیں، آرام سے لیٹے رہیے۔ مَیں نے پوچھا کیوں؟ تو اُنھوں نے بتلایا کہ ڈاکٹروں کے نزدیک میری بیماری کس قدر خطرناک ہے۔''

ریاض منزل میں اقبال نے ایک محفل میں اپنی وہ نظم سُنائی جس کا عنوان ہے ’’سلطانی‘‘ اس نظم کا ایک شعر ہے:

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سُلطانی

سیّدراس مسعوداس شعرکو بار بار پڑھنے لگے اور فلسفۂ خودی پر گفتگو شروع ہوگئی، جس میں ڈاکٹر عابد حسین اور غلام سیّدین نے نمایاں حصہ لیا۔آخر میں اقبال نے ایک شعر پڑھا۔

دلبری بے قاہری جادوگری ست
دلبری با قاہری پیغمبری ست

(وہ دلبری جس میں سختی نہ کی جائے وہ جادوگری ہوتی ہے اور وہ دلبری جس میں سختی اصلاح کے لیے کی جائے وہ پیغمبری ہوتی ہے۔)

اس کے بعد محفل برخاست ہوگئی۔

ایک رات اقبال ریاض منزل میں رونق افروز تھے۔سر راس مسعود، ممنون حسن اور علی بخش اُن کی خدمت میں حاضر تھے،علاّمہ اُس رات بہت شگفتہ موڈ میں تھے فرمایا:

’’بھوپال بہت خوبصورت شہر ہے۔حُسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے حقیقت بین نظر کی ضرورت ہے‘‘ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد دو اشعار لکھوائے پھر سیّدراس مسعود کو وہ پوری نظم سُنائی جس کا عنوان ہے ’’نگاہ‘‘۔اس کے چند اشعار یہ ہیں:

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرور رعنائی!
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی!

بھوپال سے متعلق اقبال کی اس نظم نے تاریخِ ادب میں بھوپال کو اسی طرح امر کر دیا جس طرح گوئٹے نے ویمر کو کیا ہے۔فقیر سیّد وحید الدین لکھتے ہیں کہ علاّمہ اقبال جب علاج کے لیے پہلی بار بھوپال گئے تو ان دنوں اکثر یہ فقرہ دہراتے تھے: قوم کا تاریک مستقبل خود اپنی ہی غلطیوں سے ایک مستقل حقیقت بنتا جا رہا ہے اور افراد کی بے حسی دیکھ کر میری مایوسی بڑھتی

جارہی ہے۔ لیڈی مسعود گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ علاّمہ اقبال نے ایک دفعہ کہا کہ ''انگریز نے اپنی سلطنت کی بنیاد مسلمانوں کی ہڈیوں پر رکھی ہے''۔

نواب بھوپال سے ملاقات

یکم فروری ۱۹۳۵ء کو نواب بھوپال سے ملاقات کے لیے علاّمہ اقبال ''قصرِ سلطانی'' روانہ ہوئے۔ گاڑی محل میں آ کر رکی تو نواب صاحب نیچے کی سیڑھی پر علاّمہ اقبال کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ وہ (نواب بھوپال) ان سے بڑے احترام اور محبت سے ملے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے کسی بزرگ سے مل رہے ہیں۔ پھر نواب صاحب علاّمہ (اقبال) کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ ممنون حسن لکھتے ہیں کہ ''کمرے میں ہم صرف چار آدمی تھے۔ مَیں سب سے پیچھے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جلد ہی کافی کا دور چلا۔ نواب صاحب نے صحت کے بارے میں پوچھا تو علاّمہ اقبال نے بیماری اور علاج کی تفصیل بتائی۔ اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

نواب صاحب نے An Interpretation of Holy Quran in the Light of Modern Philosophy (جدید فلسفہ کی روشنی میں قرآنِ مجید کی تشریح) کے بارے میں دریافت کیا۔ علاّمہ اقبال نے بتایا کہ اس کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں ہے۔ کچھ تیار بھی کر لیا ہے۔ لیکن کچھ کتابیں بیرونِ ملک ہیں، انہیں دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ یہ بھی کہا کہ مجھے آکسفورڈ اور کیمبرج میں توسیعی خطبات کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ اگر مَیں وہاں گیا تو ان کتابوں کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ نواب صاحب نے کہا کہ اگر یہ کتاب مکمل ہو جائے تو ساری ملتِ اسلامیہ بلکہ ساری دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھے گی نواب صاحب نے کہا اگر اس سلسلے میں کچھ امداد کی ضرورت ہو تو جیسا کہ مَیں نے مسعود سے کہا ہے مَیں ہر طرح کی امداد کے لیے تیار ہوں۔ پھر دوسری باتوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اس کے بعد علاّمہ اقبال نے نواب صاحب سے اجازت چاہی۔ نواب صاحب انہیں گاڑی تک چھوڑنے آئے''۔

اقبال ۷؍مارچ ۱۹۳۵ء کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۸؍مارچ کو دہلی پہنچے حسبِ معمول افغان قونصل خانہ میں قیام فرمایا۔ اگلے روز حکیم عبدالوہاب انصاری (المعروف حکیم نابینا) کی خدمت

میں حاضر ہوئے اپنی نبض دکھائی اور والدۂ جاوید (سردار بیگم) کی علالت سے متعلق مشورہ کیا۔ رات کو واپس لاہور روانہ ہوئے اور ۱۰/ مارچ ۱۹۳۵ء کی صبح لاہور پہنچے۔

بھوپال میں مُسلم آبادی کی تجویز

اقبال جب پہلی مرتبہ علاج کرانے بھوپال گئے تو انھوں نے نواب بھوپال کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ بھوپال میں مسلمانوں کی آبادی کے اضافے کے لیے مسلمانوں کو باہر سے بلا کر ریاست بھوپال کے غیر آباد علاقوں میں آباد کیا جائے۔ انہیں ریاست کی جانب سے آباد کاری کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ مسلمان آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ غیر آباد زمینوں کی کاشت سے پیداوار اور عوام کی خوش حالی میں اضافہ ہو سکے۔ اس تجویز کو نواب بھوپال نے پسند کیا اور اس سلسلے میں ضروری احکام جاری کر دیے۔

اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے حسن عزیز جاوید اخبار سٹیٹس مین کے نمایندہ کی حیثیت سے بھوپال گئے تھے۔ ان کی کراچی میں صہبا لکھنوی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا۔ کہ علاّمہ اقبال اس وقت ریاض منزل (بھوپال) میں قیام پذیر تھے۔ وہ اُن سے بھی ملے تھے۔ اقبال نے انہیں بتایا کہ مسلم ریاستوں میں اگر مسلمان اکثریت کی کوشش نہ کی گئی تو آئندہ یہ ریاستیں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ مَیں نے نواب بھوپال کو آمادہ کر لیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو باہر سے بُلا کر ریاست میں آباد کرائیں۔ حسن عزیز اسی ضمن میں نواب بھوپال سے بھی ملے۔ نواب صاحب نے انہیں بتایا کہ میری حکومت نے اقبال کا مشورہ بطیبِ خاطر قبول کیا ہے اور اب زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ریاست میں آ کر آباد ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ طے ہوا کہ ریاست میں آنے والوں کو سلطان پور نیل گڈھ کے علاقے میں آباد کرنا ہے۔ یہ پہاڑوں کے دامن میں سر سبز و شاداب وسیع و عریض خطۂ ارض تھا۔ اس علاقے میں ایک دریا بھی بہتا تھا۔ مسلمانوں کے قافلے شمالی ہند سے آ رہے تھے۔ کوئی ٹرین آباد کاروں سے خالی نہ آتی تھی۔ پلیٹ فارم پر ٹرین رکتی تو اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوتے۔ اِن لوگوں کا شاندار اور پرتپاک استقبال کیا جاتا اور وہ منتخب علاقوں میں پہنچا دیے جاتے۔ جب یہ قافلے اور جماعتیں وہاں پہنچ جاتیں اور اُن کے لیے اراضی اور جائے مسکن کی نشان دہی کر دی

جاتی تو یہ لوگ سب سے پہلے درختوں کو کاٹ کر اُن کی لکڑی کے ستون کھڑے کر کے اور پتّوں سے چھّپر بنا لیتے اور پھر اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی۔ باقاعدہ نماز ادا کی جاتی۔ اس کے بعد آبادی کے لیے مسجد کے اطراف میں لوگ اپنے جھونپڑے بنا لیتے۔ حکومت انھیں سال بھر کی خوراک کے لیے غلّہ، بونے کے قابل بیج، جوتنے کے لیے بیل اور ضروریات کے لیے مختص رقم دیتی۔ آبادکاری کی یہ اسکیم جو علاّمہ اقبال کی تحریک پر نواب صاحب نے شروع کی تھی ایک عرصہ تک کامیابی سے جاری رہی۔ لیکن کچھ مدت کے بعد بھوپال کے متعصّب ہندوؤں نے کانگریس کی پشت پناہی سے اس کی شدید مخالفت شروع کر کے ایک مخالفِ آبادکاری جماعت کھڑی کردی۔ بھوپال کے وہ مسلمان بھی جو کانگریس کے ہم خیال تھے اس جماعت میں شامل ہوگئے۔ اور انھوں نے ''بھوپال صرف بھوپالیوں کے لیے'' کا نعرہ لگا کر احتجاج شروع کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں فسادات ہوئے اور سیاسی فضا مکدّر ہوگئی۔ آخر کار آبادکاری کی یہ اسکیم کانگرسیوں اور شوریدہ سروں کے ہاتھوں ناکام ہوگئی۔

نواب بھوپال کی مراسلت

اقبال پہلی بار ۳۱/جنوری سے ۷/مارچ ۱۹۳۵ء تک بھوپال میں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں اپنے مالی معاملات کے بارے میں اُن کی سر راس مسعود سے بات ہوئی۔ چنانچہ ۲۰/مارچ ۱۹۳۵ء کو علاّمہ اقبال نے سر راس مسعود کو مالی امداد کے سلسلے میں پہلا خط لکھا۔ خط وکتابت جاری رہی اور راس مسعود نے انھیں لکھا کہ کوئی شخص بھی نواب بھوپال سے زیادہ اُن کی بہتری کا خواہش مند نہیں۔ علاّمہ اقبال کے علم میں لائے بغیر راس مسعود اس کوشش میں تھے کہ نواب بھوپال کے علاوہ کئی ایک دوسرے والیانِ ریاست اور سر آغا خاں سے اقبال کے لیے وظیفے جاری کرائے جائیں اور ان سب کی منظوری آنے کے بعد ہی اقبال کو اس کی اطلاع دی جائے۔ یہاں اس مراسلے کا ایک حصہ نقل کیا جا رہا ہے جو نواب بھوپال نے علاّمہ اقبال کے لیے وظیفہ مقرر کرنے کے واسطے بعض مسلم والیانِ ریاست اور سر آغا خاں کو بھیجا:

''دورِ حاضر کے سب سے بڑے مسلم زندہ شاعر سر محمد اقبال کے نام نامی سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ ان کا نہ صرف ہماری قوم کی ذہنی وفکری زندگی میں بلند ترین مقام ہے بلکہ مغربی دنیا

بھی آج انہیں ادب وفلسفہ ہردو کے میدان میں مسلمانانِ ہند کی ثقافت کا عظیم نمائندہ تسلیم کرتی ہے۔ بدقسمتی سے گزشتہ بارہ ماہ سے وہ حلق کے ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہیں اوراس کی کوئی اُمید نہیں کہ وہ آئندہ کبھی اپنی بیرسٹری کی پریکٹس جاری کرسکیں گے جو اُن کی معاش کا واحد وسیلہ تھی۔ جب تک اردو زبان ہمارے ملک میں بولی جاتی رہے گی، آئندہ نسلیں اقبال کا نام ایک ایسے صاحبِ کمال کی حیثیت سے جس نے ہماری شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی اور جس کے سبب ہماری مادری زبان کے ثقافتی معیار اوراس کی شہرت میں اضافہ ہوا، محبت وافتخار کے ساتھ لیتی رہیں گی......ہمیں دنیا کو دکھانا چاہیے کہ ایسے افراد کو جنھوں نے ہماری ثقافت کی خدمت کی ہے، ہر امکانی امداد کے سلسلے میں آج کے مُسلم والیانِ ریاست اپنے معزز پیش روؤں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں''۔

تاحیات پنشن کا اجراء

ادھر اقبال کو بہاول پور سے نواب بھوپال کی ان کوششوں کے بارے میں کچھ اطلاع ملی تو انھوں نے ۱۴/اپریل کو راس مسعود سے استفسار کیا۔ ۱۶/اپریل کے خط میں راس مسعود نے اس اطلاع کی تصدیق کی۔ ۲۶/اپریل کو علاّمہ اقبال نے راس مسعود کو لکھا: ''(اگر میری حالت بہتر ہو جاتی تو) مَیں قرآنِ کریم پر عہدِ حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹس (Notes) تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیرِغور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسّر آئے تو مَیں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے ان نوٹس (Notes) سے بہتر مَیں کوئی پیشکش مسلمانانِ عالم کونہیں کرسکتا۔ بہرحال ہراَمر اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اگر عالمِ اِسلام کی اِس خدمت کا شرف میرے لیے مُقدّر ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لیے ضروری ذرائع بہم پہنچا دے گا''۔ راس مسعود کے خطوط اور بہاول پور کی اطلاع سے علاّمہ اقبال نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ نواب بھوپال اور راس مسعود اس کوشش میں ہیں کہ علاّمہ اقبال کو بہت سی ریاستوں کی طرف سے وظیفہ مل جائے تو پھر انہیں مطلع کیا جائے۔ لیکن علاّمہ کی مالی حالت اتنی خراب اور جسمانی حالت اتنی خستہ ہو چکی تھی پھر اُن کی بیگم کی مسلسل بیماری کی وجہ سے اُن کی پریشانیاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ وہ چاہتے تھے کہ صرف نواب بھوپال کی طرف سے کوئی وظیفہ مل

جائے تاکہ وہ یکسُو ہو کر قرآن مجید پر اپنے نوٹس (Notes) لکھ سکیں۔ چنانچہ ۱۲رمئی ۱۹۳۵ء کو انھوں نے راس مسعود کو لکھا ''میری خواہش ہے کہ اعلیٰ حضرت (نواب بھوپال) خود میرے لیے اپنی ریاست سے پنشن منظور کر دیں تاکہ مَیں اس قابل ہو جاؤں کہ قرآن پر اپنی کتاب لکھ سکوں۔ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ بے نظیر کتاب ہوگی اور اُن کے نام اور شہرت کو بقائے دوام بخشے گی۔ یہ جدید اسلام کے لیے ایک بہت بڑی خدمت ہوگی اور مَیں شیخی نہیں بگھارتا جب یہ کہتا ہوں کہ آج، دنیائے اسلام میں، مَیں ہی وہ واحد شخص ہوں جو اس کام کو کر سکتا ہے۔''

۳۰رمئی کو انھوں نے راس مسعود کو پھر لکھا ''چراغِ سحر ہوں، بُجھا چاہتا ہوں۔ تمنّا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے، اسے اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ (قیامت کے دن) آپ کے جدِّ امجد (حضور نبی کریم ﷺ) کی زیارت مُجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضور ﷺ نے ہم تک پہنچایا، کوئی خدمت بجالا سکا''۔

حُسنِ اتفاق ہے کہ اس خط کو سپردِ ڈاک کرنے کے فوراً بعد انہیں راس مسعود کا خط ملا جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ نواب بھوپال نے ان کے لیے تاحیات پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ نواب بھوپال کا یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ اُس عظیم اسلامی مفکر کو مالی پریشانیوں سے نجات دلائیں گے جس کی عظمت کو سارا عالمِ اسلام خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔

نواب بھوپال نے اقبال کی بیماری اور مالی مشکلات کے پیشِ نظر پانچ سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کیا تو سر آغا خاں اور دوسرے احباب نے بھی اقبال کو مالی اعانت کی پیش کش کی۔ اقبال نے سر راس مسعود کے نام ۱۱ردسمبر ۱۹۳۵ء کو خط تحریر کیا ''اعلیٰ حضرت نواب صاحب نے میرے لیے جو رقم مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہو تو مَیں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں ہوں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس اور روپے کا لالچ کسی طرح بھی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے اور حالات پہ نظر رکھتے ہوئے مجھے اس رقم کو قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے''۔

شیش محل میں قیام

علاّمہ اقبال نواب بھوپال کی دعوت پر تشریف لاتے تو انھی کے مہمان بنتے تھے۔ اُن کا قیام زیادہ تر شیش محل میں ہوتا تھا۔ شیش محل میں صرف مقتدر اور معزز شخصیات ہی قیام کرتی تھیں ورنہ زیادہ تر یہ محل مُقفّل ہی رہتا تھا۔ محل کی تاریخ میں پہلی بار اِسے حکیم الامت اور مُفکّرِ مشرق ایسی باعظمت شخصیت کے مکین ہونے کا شرف ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کی شان و شوکت بھی دو چند ہوئی یعنی بقول مرزا اسد اللہ غالب کہ ''ہر اک مکاں کو مکیں سے ہے شرف اسد'' اور پھر اُن شاہکار کی تخلیق سے جو اقبال نے شیش محل، قیام کے دوران کیے، اسے ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ریاست بھوپال کو یہ فخر اور اعزاز بھی ہے کہ اُس نے اقبال جیسے آفاقی شاعر کو جسم و جاں کی راحتوں کا سامان ہی مہیّا نہیں کیا بلکہ فکر و تحقیق کے نئے گوشے اُجاگر کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ شیش محل ہی وہ مقام ہے جہاں اقبال نے باقاعدہ قرآن مجید کے حواشی لکھنے کے کام کا آغاز کیا۔ اقبال نے بھوپال کو دارالاقبال۔ بھوپال کہا ہے۔ اقبال کے بھوپال میں قیام اور پھر اُن لافانی و لاثانی عظیم نظموں کی بدولت جو انھوں نے بھوپال میں تخلیق کی تھیں، بھوپال کا نام عالمی ادب کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔

برقی علاج کا دوسرا کورس پورا کرنے کی خاطر اقبال کو پھر بھوپال جانا تھا۔ سو وہ ۱۵ر جولائی ۱۹۳۵ء کو مع علی بخش اور جاوید لاہور سے روانہ ہوئے۔ (یاد رہے ۲۳ر مئی ۱۹۳۵ء کو والدہ جاوید عدمِ آباد کو سدھار گئی تھیں)۔ جاوید کو اس لیے ہمراہ لے گئے کہ کہیں اُن کی عدم موجودگی میں وہ اپنی بہن منیرہ سے لڑتا نہ رہے۔ ۱۶ر جولائی ۱۹۳۵ء کی صبح دہلی پہنچے اور اقبال جاوید کو ساتھ لیے تمام دن تاریخی مقامات کی سیر کرتے رہے۔ پہلے لال قلعہ لے گئے۔ پھر نظام الدین اولیاء کے مزار پر گئے۔ ہمایوں کا مقبرہ دیکھا اور پھر قطب مینار پہنچے۔ جاوید کا دل قطب مینار کے اوپر چڑھنے کو چاہا اور انہیں بھی ساتھ آنے کو کہا، لیکن وہ بولے کہ تم جاؤ۔ مَیں اتنی بلندی پر نہیں چڑھ سکتا اور جب اوپر پہنچو تو نیچے کی طرف مت دیکھنا، کہیں دہشت سے گر نہ پڑو۔ اسی رات گاڑی پر سوار ہوکر بھوپال روانہ ہوگئے۔ معلوم ہوتا تھا، بڑا لمبا سفر ہے۔ رات کو علی بخش' جاوید کو اوپر کی برتھ پر سلا دیتے اور اقبال نیچے کی برتھ پر سوتے۔ ناشتا، دوپہر اور رات کا کھانا وہیں منگوا کر کھایا

گیا۔ ۷؍جولائی ۱۹۳۵ء کو جب بھوپال پہنچے تو اسٹیشن پر شعیب قریشی اور چند دیگر اصحاب استقبال کے لیے موجود تھے۔ موٹر کار پر سب لوگ ''شیش محل'' لے جائے گئے، جہاں نواب بھوپال کی خواہش پر ان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ شیش محل کے سامنے والے میدان میں (جسے اب اقبال میدان کا نام دیا گیا ہے) جاوید، ڈاکٹر باسط انصاری (حضرت علاّمہ کے معالج) کے نواسے زین العابدین کے ساتھ بھوپال میں قیام کے دوران کھیلا کرتے تھے۔ (زین العابدین بعد میں ڈاکٹر زین العابدین بنے اور شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدّہ کے ''ادارہ مسلم مائینارٹیز'' کے ڈائرکٹر رہے)۔ بھوپال میں قیام کے دوران علاّمہ کے علاج کے ساتھ ساتھ اُن کا علمی کام بھی جاری رہا۔ چنانچہ انھوں نے شاعری کی، رّدِ قادیانیت کے بارے میں مضمون تیار کیا اور قرآنِ کریم کے حواشی کی تیاری بھی کرتے رہے۔ ۲۸؍اگست ۱۹۳۵ء تک اقبال کا بھوپال میں قیام رہا۔ ۲۸؍اگست کی شام کو بھوپال سے روانہ ہوئے۔ اگلے روز دہلی پہنچے۔ حکیم نابینا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبض دکھائی۔ رات کو گاڑی پکڑی اور ۳۰؍اگست ۱۹۳۵ء کو واپس لاہور پہنچ گئے۔ بھوپال میں انھوں نے اپنی مشہور نظم ''مسولینی'' (۲۲؍اگست ۱۹۳۵ء) بھی لکھی۔ جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے!

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم　　تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زُجاج
تم نے لُوٹے بے نوا صحرانشینوں کے خیام تم نے　　لُوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لُوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے مَیں رَوا رکھتا ہوں آج

اپنی علالت، علمی اور شعری کوششوں کے باوجود جن میں علاج کے اوقات کو چھوڑ کر علاّمہ ہر اُس شخص سے ملتے جو اُن سے ملنے آتا تھا۔ بھوپال میں ممنون حسن کے ساتھ بہت سے بزرگوں اور علماء کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ ممنون حسن سے فرمایا ''اگر بجنوری کو اللہ عمر دراز عطا کرتا تو وہ اپنی خداداد قابلیّت سے دُنیائے علم و ادب میں انقلاب پیدا کر دیتا''۔ ممنون حسن خاں جو سیّد راس مسعود کے معتمد خاص تھے۔ اُن کے حکم پر وہ اقبال کے قیام کے دوران میں سائے کی طرح اقبال کے ساتھ رہتے تھے۔ ممنون حسن نے اقبال کی قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ

جلال، اُن کا سوز، اُن کی حقیقت بین نگاہ اور اُن کی شعری کاوشوں کو بہت قریب سے دیکھا۔

اقبال کے قیامِ بھوپال میں جو شخصیات باہر سے انہیں ملنے آئیں اُن میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر غلام السیّدین، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر ظفر الحسن، بابائے اردو مولوی عبدالحق، سر تیج بہادر سپرو، محترمہ سروجنی نائیڈو، مسٹر غلام محمد، علاّمہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا شوکت علی وغیرہ نمایاں ہیں۔ ممنون حسن خاں دو تین فیضانی صحبتوں کا حال اس طرح سناتے ہیں۔

ایک دن صبح کے وقت اقبال شیش محل کے سامنے والے میدان میں ٹہل رہے تھے۔ اس تاریخی میدان کے چاروں طرف مساجد ہیں۔ ممنون حسن کہتے ہیں مَیں علاّمہ کے ساتھ تھا۔ یکا یک علاّمہ بہت بے چین نظر آئے۔ فرمایا، اندر چلو، شیش محل پہنچ کر وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے اور کافی دیر خاموش رہنے کے بعد یہ اشعار لکھوائے۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

جب راس مسعود تشریف لائے تو ممنون حسن نے علاّمہ کی موجودگی میں یہ اشعار انہیں سنائے۔ راس مسعود نے کہا ''یہ حقیقت ہے لیکن افسوس اب تو اذاں کی صرف رسم باقی رہ گئی ہے''۔ اور پھر اقبال کا یہ شعر پڑھا۔

تری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال
تیری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

بھوپال میں اقبال سے ملنے کے لیے آنے والوں میں ایک شاعر عبدالحکیم نامی بھی تھا جو اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت کی وجہ سے 'چرکی' کے نام سے مشہور تھا۔ علاّمہ اُن سے خاصے مانوس تھے وہ بھی علاّمہ سے بہت عقیدت و محبت کا اظہار کرتے تھے۔ یہ وہی 'چرکی' تھے جنھوں نے بھوپال میں جیسے ہی علاّمہ کے انتقال (۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء) کی خبر سُنی تو دھاڑیں مار مار کر روئے اور اقبال کو ایصالِ ثواب کے لیے اپنے گھر کا سارا سامان راہِ خُدا میں غریبوں، محتاجوں، مسکینوں اور بے سہارا لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

برقی علاج کا تیسرا کورس پورا کرنے کے لیے اقبال ۲۹رفروری ۱۹۳۶ء کولاہور سے بھوپال روانہ ہوئے، علی بخش بھی ساتھ تھا۔ یکم مارچ کو دہلی پہنچے تو دن بھر وہیں قیام کیا کچھ وقت ریلوے اسٹیشن اور کچھ سردار صلاح الدین سلجوقی کے ساتھ افغان قونصل خانے میں رہے۔

اپنی مہتاب سے تابندہ زندگی کے آخری ایّام میں جب تیسری اور آخری بار اقبال ۲رمارچ ۱۹۳۶ء کو بھوپال تشریف لائے تو ۶راپریل ۱۹۳۶ء تک شیش محل میں آپ کا قیام رہا۔ ممنون حسن کہتے ہیں کہ میں ۴راپریل ۱۹۳۶ء صبح کے وقت حسبِ معمول اُن کی خدمت میں حاضر ہوا فرمایا ''مجھے تمھارا ہی انتظار تھا، اچھا ہوا تم آ گئے''۔

اسی شیش محل میں قیام کے دوران حضرت علاّمہ نے جناب راس مسعود کے دادا سر سیّد احمد خاں کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس خواب کا ذکر حضرت علاّمہ نے جناب سیّد راس مسعود کے نام ایک خط میں بھی کر رکھا ہے۔ ''مثنوی پس چہ باید کرد'' اسی خواب کے نتیجہ میں تحریر کی گئی۔ دراصل حضرت علاّمہ نے سر سیّد احمد خاں سے اپنی علالت اور معذوری کی شکایت کی تھی اور انھوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ حضورﷺ کی خدمتِ اقدس میں اپنی صحت یابی کے لیے درخواست کریں۔ خواب میں ہی اشعار کا تلاطم اُمڈ آیا اور انھی اشعار نے بعد میں ''مثنوی پس چہ باید کرد'' کی صورت اختیار کر لی۔ علاّمہ کی زبان پر یہ شعر تھا:

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز

(اے خدا تُو جانتا ہے) مَیں شب کے پوجنے والوں کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ اس لیے تُو میرے چراغ میں تیل ڈال دے۔ مطلب یہ کہ مَیں غلامی کے خلاف جنگ پر ہوں تُو میرے عقیدہ وحوصلہ کو فروغ دے۔)

۸راپریل ۱۹۳۶ء کو برقی علاج کا آخری کورس ختم ہوا۔ اقبال اسی روز لاہور کے لیے روانہ ہو کر ۹راپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور واپس پہنچ گئے۔

نواب بھوپال اور اقبال کا ایک دوسرے کو خراجِ تحسین

علاّمہ اقبال نے ''ضربِ کلیم'' کو، جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی، نواب حمید اللہ خاں کے نام معنوَن کرتے ہوئے لکھا: (یہ کتاب علاّمہ نے نواب بھوپال کو ہدیۂ بھجوائی تھی)

زمانہ با امم ایشیا چہ کرد و کند
کسے نہ بُود کہ ایں داستاں فروخواند
تو صاحبِ نظری آنچہ در ضمیر من است
دل تو بیند و اندیشۂ تو می داند
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار ازمن
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

(زمانے نے ایشیا کی قوموں کے ساتھ کیا کیا اور کیا کر رہا ہے۔کوئی ایسا نہیں کہ اس داستاں کو بیان کرے۔تو وہ صاحبِ نظر ہے کہ جو کچھ میرے ضمیر میں ہے تیرا دل دیکھتا ہے اور تیری فکر جانتی ہے۔مجھ سے یہ سب سرمایہ بہار لے کہ تیرے ہاتھ میں پھُول شاخ سے تازہ تر ہے۔)

نواب حمید اللہ خاں کو جب یہ تحفہ علاّ مہ اقبال کی طرف سے موصول ہوا تو انھوں نے اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر ان کا شکریہ ادا کیا۔صہبا لکھنوی لکھتے ہیں کہ یہ ایک مخلص دوست کا دوسرے مخلص دوست کو خراجِ تحسین ہے۔ یاد رہے کہ علاّ مہ اقبال نے ''ضربِ کلیم'' کی کئی ایک نظمیں قیامِ بھوپال کے دوران لکھی تھیں۔جن میں سلطانی، تصوف، وحی، مقصود، حکومت، نگاہ، اُمید، مسولینی، صُبح، مومن، اُمرائے عرب سے، جمعیتِ اقوامِ شرق، ابلیس کا فرمان سیاسی فرزندوں کے نام، نمایاں ہیں۔

صہبا لکھنوی لکھتے ہیں کہ ۹؍جنوری ۱۹۳۸ء کو اقبال کی زندگی ہی میں حیدر آباد دکن میں ''یومِ اقبال'' منایا گیا۔تقریب کی صدارت ولی عہد شہزادہ برار نے کی۔ اس موقع پر نواب بھوپال نے اپنے پیغام میں کہا: ''اقبال کے نغموں میں ہندوستانی قومیّت کے راز مضمر ہیں۔اس فلسفی شاعر نے اہلِ ہند کو خوابِ غفلت سے چونکا کر اُن میں احساسِ بیداری پیدا کر دیا''۔

صہبا لکھنوی نے نواب بھوپال کی دختر شہزادی عابدہ سلطان سے اُن کی کوٹھی واقع ملیر سٹی (کراچی) میں ملاقات کی۔شہزادی عابدہ نے بتایا کہ جب نواب صاحب علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے وہ اقبال کے پیام وکلام سے متعارف ہو چکے تھے۔علی گڑھ کے قیام کے دوران انھوں نے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔شہزادی صاحبہ نے بتایا کہ نواب صاحب اقبال کی بڑی عزت وتکریم کرتے تھے۔انھوں نے بھوپال میں ان کی آمد پر

قیام وطعام اور علاج ومعالجہ کی تمام سہولتیں فراہم کرنے کے لیے خصوصی ہدایات دی تھیں۔ایک دو بار میری زندگی میں اقبال، نواب صاحب سے ملنے کے لیے، محل میں تشریف لائے تھے۔ زیادہ تر گفتگو مسلمانوں کے عام حالات اور سیاسی مسائل پر ہوئی۔ نواب صاحب اور اقبال کے سیاسی مسلک میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ دونوں مسلمانوں کی جُداگانہ مملکت کے حامی تھے۔

۱۲ر جون ۱۹۷۶ء کو صہبا لکھنوی سے ایک ملاقات کے دوران بیگم راحت سعید چھتاری (سابق لیڈی مسعود) نے انھیں بتایا کہ قیامِ بھوپال کے دوران علاّمہ اقبال اکثر و بیشتر راس مسعود کے ہمراہ نواب صاحب سے ملاقاتیں کرتے اور گھنٹوں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں غور وفکر اور مشورے کرتے تھے۔ نواب صاحب کو علاّمہ سے بے حد عقیدت اور محبت تھی۔ اسی طرح علاّمہ، نواب صاحب کو اسلام اور مسلمانوں کا سچا ہمدرد اور بہی خواہ تصور کرتے تھے۔ یہ سب کچھ راس مسعود کی مخلصانہ مساعی کا نتیجہ تھا کہ علاّمہ نے ''ضربِ کلیم'' ان کے نام معنون کر کے انھیں حیاتِ دوام عطا کی۔

علاّمہ اقبال کی صحت کچھ بہتر ہوئی تو انھوں نے ۷راگست ۱۹۳۶ء کو مولانا سیّد سلیمان ندوی کو لکھا کہ ان شاء اللہ موسمِ سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کردوں گا جس کا وعدہ مَیں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اس میں آپ کے مشورے کی ضرورت ہے۔ ''البدور البازغہ'' بھی اسی مطلب کے لیے منگوائی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانینِ اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے متعلق جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں مہربانی کر کے ان کے ناموں سے مجھے آگاہ فرمایئے اور یہ بھی فرمایئے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی۔ لیکن افسوس نہ تو ان کی صحت اتنی اچھی ہوئی کہ وہ اس کام کو سرانجام دے سکتے اور نہ ہی زندگی نے زیادہ دیر تک وفا کی۔

بھوپال میں معالجینِ اقبال

علاّمہ کا شمار برصغیر کے اُن چند خوش نصیب اہلِ علم حضرات میں کیا جا سکتا ہے۔ جنھیں اپنے زمانے کی بہترین طبی سہولتیں میسّر رہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق تیس (۳۰) کے قریب حکیموں اور ڈاکٹروں کے نام آپ کے معالجین میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ان معالجین میں

ہندوستانی، انگلش، جرمنی، فرانسیسی اطباء کے زمرہ میں مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی شامل تھے۔
علاّمہ اقبال اپنی صحت کے بارے میں خود بہت محتاط تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں تقریباً ۱۲۵۰ خطوط لکھے۔ اِن میں ۲۵۱ اپنی بیماری سے متعلق تھے۔ اُردو ادب میں شاید ہی کوئی ایسا ادیب یا شاعر ہو جس نے اپنے خطوط میں علاّمہ اقبال کی طرح مفصل و مجمل اپنی بیماریوں کی رُوداد لکھی ہو۔ کہ اس میں بول و باز (اُس کی کثافت، نرم/سخت سمیت) سے لے کر گلے کے مدّ و جزر، دردِ معدہ کے اوقات، بلغم کی مقدار/ رنگت اوقات' کم خوابی وغیرہ سب کا احوال ہو۔ حکیم/ڈاکٹر کو بہت کم مزید جاننے کی احتیاج ہوتی۔

جنوری ۱۹۳۴ء سے آواز میں مسلہ شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ آواز کشائی کی دوسری تمام ادویہ آزمانے کے بعد جب اُن میں ناکامی ہوئی تو برقی علاج کی تجویز دی گئی۔ کہا جاتا ہے بڑے شخص کی چھوٹی بیماری بھی بڑی ہوتی ہے۔ اقبال کی بیماری کی خبر تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور اطراف و اکناف سے نسخہ اور دواؤں کے شرطیہ علاج پہنچ رہے تھے۔ اقبال اپنے علاج کے لیے جب بھوپال گئے تو لوگوں نے وہاں بھی خیریت دریافت کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ یہ خطوط عام لوگوں سے لے کر والیانِ ریاست تک کے ہوتے تھے۔ خصوصاً علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کے خطوط زیادہ ہوتے۔ بیرونِ ملک سے بھی اسی سلسلے میں خطوط آتے۔ آل انڈیا ریڈیو سے علاّمہ کی صحت کے بارے میں بھی وقتاً فوقتاً خبریں نشر ہوتی تھیں۔

علاّمہ پہلی بار ۳۱/جنوری ۱۹۳۵ء سے ۷/مارچ ۱۹۳۵ء' دوسری بار ۱۷/جولائی ۱۹۳۵ء سے ۲۸/اگست ۱۹۳۵ء اور تیسری بار ۲/مارچ ۱۹۳۶ء سے ۸/اپریل ۱۹۳۶ء تک بغرضِ علاج بھوپال میں رہے پہلی دفعہ ''ریاض منزل'' (رہائش گاہ سر راس مسعود) قیام رہا اور اس کے بعد دونوں دفعہ شیش محل میں قیام رہا اور نواب بھوپال کے مہمانِ خاص رہے۔ بھوپال کے ممتاز ہسپتال ''پرنس آف ویلز ہسپتال'' میں جس کا بعد میں ''حمیدیہ ہسپتال'' نام رکھا گیا۔ علاّمہ کا علاج کیا گیا۔ قیامِ بھوپال میں جن ڈاکٹروں نے علاّمہ کا طبی معائنہ کیا اُن میں ڈاکٹر عبدالباسط انصاری چیف ریڈیالوجسٹ، ڈاکٹر رحمٰن، ڈاکٹر بوس، ڈاکٹر احمد بخش خان بہادر، ڈاکٹر سلطان، ڈاکٹر حسن محمد حیات، کے علاوہ مشہور حکیم سیّد ضیاء الحسن اور حکیم سلطان محمود شامل تھے۔ اس علاج کی سر پرستی ڈاکٹر عبدالباسط انصاری کی تھی۔ جب ایک دفعہ ڈاکٹر انصاری اور خان بہادر

ڈاکٹر احمد بخش کی تشخیصوں میں اختلاف ہُوا تو اقبال کی میڈیکل ہسٹری اور سینے کے ایکس ریز (X-Rays) کو ویانا (آسٹریا) ماہرین کی رائے کے لیے بھیجا گیا۔ وہاں ڈاکٹر انصاری کے بھانجے ڈاکٹر مظفرعلی گوش وحلق و بینی کے متخصّص (ENT Specialist) تھے۔اقبال کا بھوپال میں تین بار علاج ہوا ہر بار ۱۲ یا ۸ دفعہ (Ultra voilet Rays) دیے گئے۔بجلی کا یہ علاج اُن کے گلے کے درد اور خصوصاً آواز کے بڑھاوے کے لیے ہُوا۔

۲۶ رجنوری ۱۹۳۵ء کو سیّد نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

''مَیں ۲۹ رجنوری کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۳۰ کی صبح دہلی پہنچوں گا دہلی میں صرف ایک روز ٹھہرنے کا موقع ہوگا۔مزید دوا کے لیے اسٹیشن پر گفتگو ہوگی پھر آپ اِسے بھوپال ارسال کر دیں''۔

اقبال بھوپال پہنچ کر مختلف احباب کو خطوں میں علاج کے بارے میں لکھتے ہیں:

۵ رفروری ۱۹۳۵ء بنام سیّد نذیر نیازی

''طبّی معائنہ کل ختم ہوا۔ یہاں کے ڈاکٹر نہایت ہوشیار اور ہسپتال نہایت عمدہ ہے۔طبّی معائنہ سے جو نہایت مکمل تھا حکیم صاحب کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ بہر حال آج گیارہ بجے سے Ultra voilet Rays کا غسل شروع ہوگا جو ابتداء میں صرف ۷ منٹ روزانہ ہوگا''۔

۶ رفروری ۱۹۳۵ء کو ریاض منزل بھوپال سے راغب احسن کو لکھتے ہیں۔

''بجلی یعنی Ultra voilet Rays کے ذریعے علاج کل سے شروع ہے۔ چند روز تک معلوم ہوگا کہ کس قدر فائدہ اس سے ہوتا ہے''۔

۹ رفروری ۱۹۳۵ء کو سیّد نذیر نیازی کو لکھتے ہیں......

''بجلی اور Ultra voilet Rays سے علاج شروع ہے۔ایک آدھ ہفتے کے بعد معلوم ہوگا کہ اس سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں؟ ڈاکٹر صاحبان یقین دلاتے ہیں کہ ضرور ہوگا''۔

۱۳ رفروری ۱۹۳۵ء کو سیّد نذیر نیازی کو لکھتے ہیں......

''بجلی کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا ہے کچھ خفیف سا فرق آواز میں ہے مگر زیادہ وضاحت سے آٹھ دس دفعہ کے علاج کے بعد معلوم ہوگا''۔

برقی علاج کے سلسلے میں اقبال پہلی بار (۳۷) دن بھوپال میں رہے۔اس دوران انھوں نے ریاض منزل میں سات نظمیں لکھیں۔ضربِ کلیم میں موجود نظمیں سلطانی، تصوّف، وحی،

مقصود، حکومت، نگاہ اور اُمید اس علاج کی روداد کو تازہ کرتی رہیں گی۔

اسی قیام کے دوران اقبال نے ایک فارسی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کے نام سے لکھنی شروع کی جو لاہور جا کر تکمیل کی۔ اس مثنوی کی بابت ۲۹/ جولائی ۱۹۳۶ء کو سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:

''۳/ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا میں نے تمھارے دادا رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضورِ رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض کر۔ مَیں اسی وقت بیدار ہوگیا اور کچھ شعر عرضداشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کُل ساٹھ شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمدللہ''۔

علّامہ اقبال کے چند اشعار جو ان کی فارسی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کے ''در حضور رسالت مآب ﷺ'' کے زیرِ عنوان نظم میں بیماری، تندرستی اور تلخ دواؤں سے چھٹکارے کی دعا کرتے ہوئے لکھے گئے، یہاں پیش کرتے ہیں۔

من چو طفلاں نالم از داروئ خویش　　کار ایں بیمار نتواں بُرد پیش

تلخ و بویش بر مشامم ناگوار　　در نسازد باد واہا جان زار

با پرستارانِ شب دارم ستیز

باز روغن در چراغِ من بریز

(یعنی بیماری سے چھٹکارہ نہیں اور مَیں بچوں کی طرح کڑوی دواؤں سے گھبراتا ہوں۔ مَیں تاریکی پھیلانے والوں سے لڑ رہا ہوں کچھ اور تیل میرے چراغ میں ڈال دے۔)

اس تیسرے برقی علاج کے بعد بھی اقبال کی آواز ٹھیک نہ ہو سکی۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو سیّد محفوظ بدایونی کو لکھتے ہیں......

''مَیں گزشتہ ۱۸ ماہ سے علیل ہوں۔ سفر بہت کم کرتا ہوں۔ ہر تیسرے مہینے بھوپال جاتا ہوں۔ وہاں برقی علاج ہے جس سے کچھ فائدہ ہے اب ویانا جانے کی فکر میں ہوں۔ یہ ظاہری علاج ہے باطنی علاج صرف اس قدر ہے کہ آپ کے جدّ پر درود پڑھتا ہوں۔ آپ بھی دُعا فرمایئے۔ آپ عاشقانِ رسول ﷺ میں سے ہیں۔ اس واسطے ایک اور بات آپ کے گوش گزار کرنے کے لائق ہے''۔

''۳/ اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (مَیں اس شب بھوپال میں تھا) مَیں نے سر سیّد علیہ الرحمتہ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو۔ مَیں نے عرض کیا دو سال سے اوپر

مدّت گزر گئی۔ فرمایا حضورِ رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرضداشت کے چند شعر جواب طویل ہوگئی ہے۔ میری زبان سے جاری ہو گئے۔ ان شاء اللہ ایک مثنوی فارسی پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہوگی۔ ۴؍اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رنگ عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔ گو اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے جسم میں بھی عام کمزوری ہے زیادہ کیا عرض کروں''۔

۱۳؍جون ۱۹۳۷ء کو پروفیسر عبداللہ چغتائی کو لکھتے ہیں......

''لیکن بہ حیثیت مجموعی ایک دائم المریض کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ تاہم صابر اور شاکر ہوں۔ ان شاء اللہ جب موت آئے گی تو مجھے متبسّم پائے گی۔ قصد تو یہ تھا کہ زندگی کے باقی دن جرمنی اور اٹلی میں گزار دوں۔ مگر بچوں کی تربیت کس پر چھوڑ دوں۔ اگر توفیقِ الٰہی شامل حال رہی تو زیادہ سے زیادہ مکّہ سے ہوتا ہوا ممکن ہے مدینہ تک پہنچ سکوں۔ مجھ ایسے گناہگاروں کے لیے آستانۂ رسالت مآب ﷺ کے سوا اور کہاں جائے پناہ ہے''۔

بھوپال میں یادگارِ اقبال

جناب ممنون حسن جو سر راس مسعود وزیرِ تعلیم وصحت و امور عامہ کے معتمدِ خاص تھے اور جنہیں سر راس مسعود نے اقبال کے دورانِ قیام بھوپال اُن کی خدمت پہ مامور کیا تھا، وہ اقبال کی فیضانی صحبت میں اس قدر جذب اور سرشار رہے کہ وہ اپنے آپ کو علاّمہ کا ادنیٰ کفش بردار اور سفتہ گوش کہا کرتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف راس مسعود سے حقِ وفاداری نبھایا بلکہ علاّمہ کے مرنے کے بعد اُن سے عقیدت و محبت کو بھی اپنے دمِ آخر تک حرزِ جاں بنائے رکھا۔ ہمیشہ جاوید اقبال اور منیرہ کی خود جاوید منزل آ کر بھی اور بذریعہ خط وکتابت بھی خیریت دریافت کرتے رہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ ''زندگی کے آخری عہد میں مرحوم کا تعلق اور توسّل دربارِ بھوپال سے ہوگیا تھا۔ اس تعلق کے پیدا کرنے میں سیّد راس مسعود کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن دقتّوں کا سامنا تھا اب اُن سے نجات ہوگئی تھی۔ دورِ آخر کی بعض مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک اُن کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کرسکیں گی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کی کوئی

معاد ہے تو اسی نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجاتِ اُخروی متعیّن ہے‘‘۔

۱۹۴۹ء میں ریاست کے بھارت میں ضم ہونے کے بعد وہ چاہتے تھے کہ بھوپال میں کوئی ایسا کام کیا جائے جو علاّمہ کے قیامِ بھوپال کو اَمر کردے اور تاریخ کا حصہ بن جائے چنانچہ اُن کی سالہا سال کی مسلسل محنت رنگ لائی۔ جس کے نتیجہ میں عزیز قریشی ممبر پارلیمنٹ مدھیہ پردیش اور ممنون حسن کی کاوش سے ارجن سنگھ وزیرِ اعلیٰ مدھیہ پردیش نے احکام جاری کیے اور شیش محل کے سامنے والے میدان کا نام ’’اقبال میدان‘‘ رکھا گیا۔ بھوپال ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے اِس میدان میں ایک کلچرل پارک (ثقافتی سیرگاہ) تعمیر کر کے وہاں ایک شاندار ’’اقبال میموریل‘‘ (یادگار) تعمیر کی ہے۔ اقبال ادبی مرکز تعمیر کیا گیا اور اس مرکز کو شیش محل کے وہ کمرے دیے گئے جس میں اقبال نے قیام فرمایا تھا۔ اس کے بعد مدھیہ پردیش کے ایک اور ادب نواز وزیرِ اعلیٰ شری موتی لال دورا نے ممنون حسن کی درخواست پر ’’آل انڈیا اقبال ایوارڈ‘‘ (کل ہند اقبال انعام) بھی منظور فرمایا۔ جس کی مالیّت ۱۹۸۰ء میں پچاس ہزار روپے سالانہ تھی۔ ہندوستان اور بیرونی ممالک کے فن کاروں، مجسمہ سازوں اور ادیبوں نے بھی اقبال میموریل بھوپال کی دل کھول کر تعریف کی۔

☆☆☆

باب:۱۹

حالی کے صد سالہ جشنِ ولادت میں شرکت

پانی پت شہر دہلی سے ۹۰ کلومیٹر شمال میں ریاست ہریانہ میں ضلع پانی پت کا ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے اس شہر کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں تین اہم جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ ۲۱/اپریل ۱۵۲۶ء کو ظہیر الدین بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان ہوئی جس میں بابر فاتح رہا اور اس طرح برِّصغیر میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑی، دوسری جنگ ہندو راجہ ہیمو اور جلال الدین اکبر کے درمیان ۵/نومبر ۱۵۵۶ء کو ہوئی جس میں اکبر فاتح رہا، تیسری جنگ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان ۱۴/جنوری ۱۷۶۱ء کو ہوئی جس میں احمد شاہ ابدالی کو فتح نصیب ہوئی۔ اسی شہرِ پُر آشوب میں مولانا الطاف حسین حالی ۱۸۳۴ء (یا اس کے لگ بھگ) پیدا ہوئے۔ اور اسی شہر میں اُن کا مدفن ہے۔ مولانا حالی کو یہ اعزاز بھی ہے کہ یہ مرزا اسداللہ خاں غالب کے آخری شاگردِ رشید تھے۔ شہر میں یادگار کے طور پر ''حالی جھیل'' اور حالی ٹرسٹ ہیں۔

حالی کی تصانیف ''یادگارِ غالب'' (حیاتِ مرزا غالب)، ''حیاتِ جاوید (سر سیّد احمد خاں کے حالاتِ زندگی)، ''حیاتِ سعدی (شیخ سعدی شیرازی کے حالاتِ زندگی)، مقدمۂ شعر و شاعری اور ''مسدّسِ حالی'' ہیں۔ مگر جو حیاتِ دوام اور قبولِ عام 'مسدّسِ حالی' کو نصیب ہوا ہے وہ کسی اور تصنیف کو نہیں حاصل ہو سکا۔ اور پھر مسلمانانِ ہند مولانا الطاف حسین حالی کے زیرِ بار ہیں کہ اُس پُر آشوب دور میں سر سیّد احمد خاں کی تحریک کے بعد مسلم بیداری میں سب سے زیادہ کردار ''مسدّسِ حالی'' کا نظر آتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ شعری مجموعہ بلکہ اُمت کی بیداری کا کلام بھی سر سیّد احمد خاں کی تحریک پر حالی نے لکھا۔ ''مسدّسِ حالی'' جس کا دوسرا نام ''مدّ و جزرِ اسلام'' بھی ہے اس کی اشاعت ۱۸۷۹ء میں ہوئی سر سیّد احمد خاں کہا کرتے تھے کہ قیامت کے

روز اگر باری تعالیٰ مُجھ سے سوال کرے گا کہ دُنیا میں کون سا اچھا کام کر کے آئے ہو۔ تو مَیں انکساری سے جواب دُوں گا ''اے باری تعالیٰ مَیں نے ''مسدّسِ حالی'' لکھوائی ہے''۔

مولانا حالی سے اقبال کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے حاؔلی لاہور تشریف لاتے ہیں تو وہ پیرانہ سالی کے باعث اپنی نظم سُنا نہیں پاتے پھر قرعۂ فال اقبال کے نام نکلتا ہے کہ وہ حالی کی نظم سُنائیں گے۔ چنانچہ اقبال سٹیج پر تشریف لاتے ہیں اور حالی کی نظم سُنانے سے پہلے مندرجہ ذیل اشعار فی البدیہہ حالی کی تحسین میں پڑھتے ہیں:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہُوں گویا
نازل ہے مرے لب پر کلامِ حالی

اس کے بعد اقبال نے اپنی دلکش اور شیریں آواز میں حالی کی پُوری نظم ''مادرِ پنجابِ انجمن'' حاضرین کو سُنائی۔ اس جلسہ میں حالی اور اقبال کے علاوہ دوسری سرکردہ شخصیات مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، سر فضل حسین، سر عبدالقادر شیخ، ارشد گورگانی، سر محمد شفیع، سر راس مسعود، ڈاکٹر ذاکر حسین تھیں۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی جیسی سربرآوردہ شخصیّات یکے بعد دیگرے ہی برِّصغیر کے مسلمانوں کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ اس پر اقبال نے بانگِ درا میں ایک خوبصورت نظم ''شبلی و حاؔلی'' کے نام سے تحریر کی ہے جس کے دو اشعار یہ ہیں۔

خاموش ہو گئے چمنستاں کے راز دار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سُوئے فردوس رہ نورد

ملّت کا درد رکھنے والی اس ہستی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ''صد سالہ جشنِ ولادتِ حاؔلی'' کا پانی پت میں اہتمام کیا گیا تو اقبال کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اگرچہ اقبال کی صحت خود بھی گرتی جارہی تھی اور پھر والدہ جاوید کے چند ماہ پہلے (۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو) انتقال کر جانے سے وہ بہت آزردہ تھے مگر پھر بھی انھوں نے شرکت ضروری سمجھی۔

۲۵/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اقبال مع چودھری محمد حسین، راجہ حسن اختر، نذیر نیازی، علی بخش اور جاوید (فرزندِ اقبال) مولانا حالی کے صد سالہ جشنِ ولادت کی تقریبات میں شرکت کے لیے پانی پت پہنچے اور دو دن وہیں قیام کیا۔ نواب حمید اللہ خان اور سر راس مسعود بھی بھوپال سے تشریف لائے۔ نیز ہندوستان کے مختلف حصوں سے مولانا حالی کے بے شمار شیدائی پانی پت پہنچے ہوئے تھے۔ اقبال نے پانی پت پہنچتے ہی حضرت شاہ بوعلی قلندر کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت شیخ کا اسم گرامی شرف الدین، لقب بوعلی قلندر تھا آپ امامِ اعظم ابوحنیفہ کی اولاد سے تھے۔ آپ کے والد محترم ۶۰۰ ھ (۴-۱۲۰۳ء) میں عراق سے ہندوستان آئے، وہ علم و فضل کے بلند مرتبہ پہ فائز تھے۔ انھوں نے یہاں آنے کے بعد حضرت بہاء الدین زکریا کی صاحبزادی سے شادی کی۔ اقبال نے ''اسرارِ خودی'' میں انہیں یُوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

با تو می گویم حدیثِ بوعلی — در سوادِ ہند نامِ او جلی
آں نوا پیرائے گلزار کہن — گفت با ما از گلِ رعنا سخن

خطہ ایں جنت آتش نژاد
از ہوائی دامنش مینو سواد

''مَیں تجھ سے بُوعلی (قلندر پانی پتی) کی بات کرتا ہوں جن کا نام ہندوستان کی سرزمین میں بہت مشہور ہے۔ قدیم باغ کے اس نغمہ الاپنے والے (قلندر) نے ہمیں شگفتہ وحسین پھول کی بات سُنائی۔ بہشت کا یہ خط جو کبھی اپنی اصل کے لحاظ سے آگ (کفرستان) تھا۔ حضرت بوعلی کے دامن کی ہوا سے واقعی بہشت کا ٹکڑا بن گیا۔''

اگلے روز یعنی ۲۶/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو نواب بھوپال کی زیرِ صدارت حالی مسلم اسکول میں تلاوت قرآنِ مجید سے جلسے کا آغاز ہوا۔ مولانا حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے سپاس نامہ پڑھا۔ حفیظ جالندھری نے اپنی نظم سنائی۔ اس کے بعد خواجہ غلام السیدین نے اعلان کیا کہ گلے کی خرابی کے سبب اقبال اپنے اشعار خود نہ سنائیں گے۔ بلکہ کوئی اور صاحب ان کے اشعار سنائیں گے۔ اقبال سے درخواست کی گئی کہ شعر خوانی کے دوران وہ ڈائس پر تشریف لے آئیں۔ ان کے اس موقع پر لکھے ہوئے اشعار جو انھوں نے پہلے ہی خواجہ سجاد حسین کو بھیج رکھے تھے، حالی مسلم اسکول کے ایک استاد نے خوش الحانی کے ساتھ پڑھ کر سنائے:

مزاج ناقہ را مانند عرفی می بینم چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم
حمیداللہ خاں اے ملک وملت را فروغ از تو ز الطافِ تو موج لالہ خیزد از خیابانم
طواف مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم
تو برخاکش گہرا فشاں و من برگ گل افشانم

(عرفی کی طرح مَیں بھی مزاجِ ناقہ سے واقف ہوں اگر محمل بھاری ہوتو مَیں حدی خوانی کو تیز تر کرتا ہوں۔ اے حمیداللہ خاں کہ ملک وملّت کو تجھ سے فروغ ہے، تیری مہربانی سے میرے باغ میں موجِ لالہ پیدا ہوتی ہے۔ حالی کی قبر کا طواف اربابِ معنی کو سزاوار ہے۔ اس کی نواؤں سے دلوں میں وہ شور ہوتا ہے کہ مَیں جانتا ہوں۔ آ، تا کہ فقر و شاہی اس کے حضور اکٹھے ہو کر چلیں۔ تو اس کی خاک پر موتی بکھیر اور میں پھول کی پیتاں بکھیروں۔)

خود نواب بھوپال جُھک کر ڈاکٹر صاحب کو داد دیتے جاتے تھے۔ لوگ اس بات پر نازاں تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں اُن کا کلام سننے کا موقع ملا۔

اس کے بعد جمیل نقوی، غلام السیدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا حالی سے متعلق اپنے اپنے مقالات پڑھے۔ پھر سر راس مسعود کا تحریر کردہ ''مسدّسِ حالی'' صدی ایڈیشن کا دیباچہ پڑھا گیا۔ آخر میں نواب بھوپال نے خطبہ صدارت پڑھا اور جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ اقبال حبسِ صَوت کے سبب نہ تو اپنے اشعار خود پڑھ سکے اور نہ تعریفی کلمات کے جواب میں بطور تشکّر ہی کچھ کہہ سکے جو نواب بھوپال اور دیگر حضرات نے اُن کی شان میں کہے تھے۔ جلسے کے اختتام پر سب لوگ مزارِ حالی پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گئے۔ شام کے اجلاس میں اقبال ضعف و اضمحلال کے باعث شریک نہ ہوئے اور اگلے روز یعنی ۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو واپس لاہور پہنچ گئے۔

☆☆☆

باب: ۲۰

سفرِ آخرت

اس عالمِ رنگ و بُو میں ہر ذی رُوح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ہم سب کو ایک نہ ایک دن رزقِ خاک ہونا ہے۔ اقبال کو بھی اس راہِ عمل سے گزرنا تھا کیونکہ بقولِ میر انیس:

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب سرورِ عالم نہ رہے کون رہے گا

حقیقت اور خوبصورتی تو یہ ہے کہ آپ نے زندگی کیسے گزاری، اقبال نے ایک بھرپُور مصروف اور علمی معرکے سَر کرتے ہوئے زندگی بسر کی۔ وہ اپنے زمانے کے خوش قسمت اہلِ علم میں سے تھے جنھیں اُن کی زندگی میں بھرپُور پذیرائی ملی۔ دُنیا کی بہترین یونیورسٹیوں سے انتہائی اعزاز (تین سال میں تین ڈگریاں یعنی فلسفہ میں پی۔ ایچ ڈی، بارایٹ لا اور ایم اے) کے ساتھ مکمل کیں۔ دُنیا کے نامور فلاسفرز، اہلِ علم، سیاستدانوں، علماء سے ملاقاتیں پھر اُن کی حیات میں بہت دفعہ یومِ اقبال منائے گئے۔ اُنہیں یہ دھڑ کا لگا رہتا تھا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے زیادہ عمر نہ ہو جائے۔ اللہ نے شاید اُن کی یہ خواہش پوری کر دی۔ ورنہ ان کے خاندان میں عمروں کا تناسب ستر سال سے اوپر ہی ہے۔ اقبال کو اپنے زمانے کے بہترین اطباء اور ڈاکٹر علاج معالجہ کے لیے میّسر رہے جن کی تعداد تقریباً تیس ہے۔ اِن میں ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلمان سب تھے۔ انہیں برصغیر کی بہترین طبی سہولتیں میسّر رہیں۔ علاّمہ کے تیمارداروں میں عام شخص سے لے کر والیانِ ریاست تک شامل تھے بیرونِ ملک سے بھی اس سلسلے میں خطوط آتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی علاّمہ کی صحت کے بارے میں خبریں نشر ہوتی تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی بیماری (۱۵راگست ۱۹۰۴ء سے ۱۹راپریل ۱۹۳۸ء تک) سے متعلق تقریباً ۲۵۱ کے لگ بھگ خطوط اپنے احباب، حکماء اور ڈاکٹروں کو لکھے۔ اِن خطوط میں اپنی طبی اور طبعی حالت و

بیماری کی منظر کشی اس انداز سے کیا کرتے تھے۔ کہ ڈاکٹر یا طبیب کو مزید جاننے کی کم ہی ضرورت پڑتی۔ بہ امر مجبوری اگر ضروری ہوتا تو خود بھی معائنہ کے لیے حاضر ہو جاتے۔

علالت کی ابتدا

اگرچہ علاّمہ کی علالت کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے چل رہا تھا مگر وسط مارچ ۱۹۳۸ء سے اُن کی حالت تشویش انگیز ہوتی چلی گئی۔ وہ ایلو پیتھک دوائیں پسند نہ کرتے تھے اور ان سے انہیں کوئی فائدہ بھی نہ ہوتا تھا۔ دَمے کے دورے پڑتے تھے۔ شانے اور کمر کا درد بدستور تھا۔ قلب، گردے اور جگر سب ماؤف ہو چکے تھے۔ نیند آتی نہ تھی اور مسلسل بے خوابی کا عالم طاری تھا۔ وقت کاٹنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ پاس بیٹھے احباب سے کہتے کہ باتیں کیے جائیں۔ کبھی دیوان علی سے بُلّھے شاہ کی کوئی کافی، ہدایت اللہ کی سہ حرفی یا یوسف زلیخا سنتے اور کبھی سیّد نذیر نیازی کو تاریخِ اسلام کا کوئی واقعہ بیان کرنے یا کوئی ایسا افسانہ سنانے کی ہدایت کرتے جس میں بغداد، قاہرہ، غرناطہ یا قرطبہ کا ذکر آتا ہو۔ افسانہ سنتے سنتے سو جاتے۔ مگر پھر اچانک بے چینی سے جاگ اٹھتے۔ فرماتے نیند نہیں آتی۔ وقت کیوں نہیں گزرتا۔ کھانسی کا دورہ پڑتا۔ بعض اوقات کھانستے کھانستے غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ایک دفعہ تو بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے۔ انھی ایاّم میں دَمے کے پے در پے دوروں کے بعد نیم بے ہوشی کے عالم میں جاوید اقبال (ان کے فرزند) نے انہیں دو مرتبہ اپنی خوابگاہ میں مرزا اسد اللہ خان غالب اور مولانا جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ دونوں مرتبہ علی بخش کو بلوا کر پوچھا کہ مرزا غالب (یا مولانا رومی) ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔ دیکھنا کہیں چلے تو نہیں گئے اور علی بخش کے اس جواب پر کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا، فرمایا، چلو ٹھیک ہے۔

چند ہفتے گزرنے کے بعد پاؤں متورّم ہو گئے۔ یہ سب علامتیں اچھی نہ تھیں۔ ۱۹/اپریل ۱۹۳۸ء کو بلغم میں خون آنے لگا اور نبض خفیف ہو گئی تھی۔ حکیم محمد حسن قرشی اور ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے انہیں دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا۔ تاہم اُن کے حواس بالکل صحیح وسالم تھے اور بظاہر حالت میں کوئی خاص تغیّر معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُن کی اب بھی یہی خواہش تھی کہ پنجابی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم وتربیت کے لیے کسی نہ کسی طرح علمائے ہند میں سے چند ایک کو پنجاب میں بودو باش اختیار

کرنے پر رضا مند کیا جائے۔ غالباً اسی بنا پر ۱۸/اپریل ۱۹۳۸ء کو درج ذیل خط سیّد نذیر نیازی نے مولانا مودودی کے نام تحریر کیا:

''کچھ دن ہوئے سیّد محمد شاہ صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ آپ جمال پور تشریف لے آئے ہیں اور عنقریب لاہور بھی آئیں گے۔ اس وقت سے برابر آپ کا انتظار ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر آپ کا ارادہ فی الواقعی لاہور آنے کا ہے تو جلدی تشریف لایئے تاکہ ملاقات ہو جائے۔ میری اپنی طرف سے یہ گزارش ہے کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی حالت نہایت تشویشناک ہے۔ ایک لمحے کا بھی بھروسا نہیں (مگر اس بات کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔ کسی سے ذکر نہ کیجیے گا)۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ آپ جس قدر ہو سکے جلدی تشریف لے آئیں۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے دعا فرمایئے''۔ مگر شومئ قسمت کہ یہ ملاقات نہ ہو سکی۔

۱۹/اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال نے غالباً اپنا آخری خط سر راس مسعود کے سیکرٹری ممنون حسن خان کے نام تحریر کروایا جس میں فرمایا کہ دمے کے متواتر دوروں نے انہیں زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا ہے اور یہ کہ آنکھوں کا آپریشن مارچ ۱۹۳۸ء میں ہونے والا تھا، مگر ''دمے کی وجہ سے اسے ستمبر ۱۹۳۸ء تک ملتوی کرنا پڑا''۔

۲۰/اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو اُن کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ انھوں نے معمول کے مطابق دلیے کے ساتھ چائے کی پیالی لی۔ میاں محمد شفیع سے اخبار پڑھوا کر سُنے اور رشید حجام سے شیو بنوائی۔ دوپہر کو ڈاک میں نٹل (جنوبی افریقہ) کے کسی اخبار کے تراشے وصول ہوئے، خبر یہ تھی کہ وہاں کے مسلمانوں نے نمازِ جمعہ کے بعد اقبال، مصطفیٰ کمال اور محمد علی جناح کی صحت اور عمر درازی کے لیے دعا کی ہے۔ اقبال نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی مہربانی ہے کہ وہ مجھے اپنی دُعاؤں کا مستحق سمجھتے ہیں۔ ورنہ مَیں اپنا کام ختم کر چُکا۔ اب مسلمانوں کو مصطفےٰ کمال اور جناح کی درازیٔ عمر کے لیے دُعا کرنی چاہیے۔

ساڑھے چار بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب کے ایک پرانے جرمن دوست بیرن فان والتھیم ملنے کے لیے آئے۔ علّامہ گاؤ تکیہ پر سر ٹیکے بیٹھے تھے۔ جونہی ان کے دوست نے کمرہ میں قدم رکھا انھوں نے شیر کی طرح جو بڑھاپے میں بھی دم خم اور جلال و وقار سے تہی دست نہیں ہو جاتا دفعتہً گردن اٹھائی اور استفہامیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ بیرن نے اپنا تعارف

کرایا کہ ہم طالب علمی میں میونخ یونیورسٹی میں دوست ہوا کرتے تھے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اُن سے اپنی لینڈ لیڈی، اس کی بیٹی، فلاں آدمی، فلاں سکالر کے متعلق استفسارات کیے۔

اِن کی باہمی گفتگو سے پاس بیٹھے احباب نے اندازہ لگایا کہ نو وارد جرمنی کے بہت بڑے نواب ہیں اور اب مشرقی ممالک کی سیّاحت کی غرض سے گھر سے نکلے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات بڑی تعجب انگیز تھی کہ اِدھر تو وہ ابھی درد کی شدت سے تلملا رہے ہیں۔ اُدھر جونہی کوئی آدمی آیا جو اپنی باتوں سے اُن کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ سکتا تھا تو یہ گفتگو میں ایسے محو ہوتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں درد وغیرہ کی کبھی تکلیف ہوئی ہی نہیں۔

اب بھی وہ اسی انہماک سے بیرن سے محوِ گفتگو تھے۔ افغانستان میں موسم کیسا ہوگا۔ وہاں کس قسم کے پھل ملتے ہیں۔ وہاں گوشت کیسا ہوتا ہے۔ افغانستان میں شکار کے کون سے جانور ہیں۔ وہاں جانے کا راستہ کون سا اچھا ہے۔ راستے میں کون سے مقامات دیکھنے کے قابل ہیں۔ افغانستان میں کون سے تاریخی مقامات ہیں۔ موجودہ حکمران کون ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی بیسیوں عنوانات پر ڈاکٹر صاحب گفتگو کرتے رہے۔

جن لوگوں کو ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے یا جنھوں نے انہیں گفتگو کرتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ بے مثل (Conversationalist) تھے۔ وہ ہر مذاق اور ہر عمر کے آدمیوں سے بہت دلچسپ گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اگرچہ انہیں بولنے میں دقّت ہوتی تھی تاہم وہ بڑی گرم جوشی سے باتیں کیے جاتے تھے۔ موسم اور آب و ہوا کا موضوع بدلا تو جرمن فلاسفروں پر گفتگو شروع ہو گئی اور جرمن فلاسفی کے تازہ ترین رجحانات پر انھوں نے اظہارِ خیال فرمایا:

"These things are not to be talked openly"

محمد شفیع (م۔ش) لکھتے ہیں کہ مَیں محسوس کر رہا تھا کہ بیرن علاّمہ کی نازک صحت کے پیشِ نظر گفتگو کو طول دینے پر آمادہ نہیں اور اس نے کہا بھی کہ میری موجودگی سے شاید آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

It is just the other way. Your breath is like balm to me.

بالآخر کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بیرن والتھیم نے اجازت طلب کی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب

نے اپنا ہاتھ اُن سے ملانے کے لیے بڑھایا۔

محمد شفیع (م۔ش) فرماتے ہیں کہ ”عموماً ڈاکٹر صاحب آنے جانے والوں سے شاذ و نادر ہی ہاتھ ملایا کرتے تھے۔ صرف زبان سے سلام کا جواب دے دیا کرتے تھے۔ مگر انتقال سے چار پانچ روز پہلے مَیں نے قدرے حیرت سے دیکھا کہ جب کوئی آدمی اُن کے پاس سے اٹھ کر جاتا تھا تو یہ آپ ہی اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیتے تھے۔ شاید انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ اب چند دنوں میں مجھے یہاں سے رختِ سفر اٹھانا ہے“۔

شام کی فضا میں موسم بہار کے سبب پھولوں کی مہک تھی اس لیے پلنگ خوابگاہ سے اٹھوا کر دالان میں بچھوایا اور گھنٹہ بھر کے لیے وہیں لیٹے رہے پھر جب خنکی بڑھ گئی تو پلنگ گول کمرے میں لانے کا حکم دیا۔ گول کمرے میں ساڑھے سات سالہ منیرہ، آپا جان (جرمن خاتون مسزِ ڈورس احمد...... اقبال کے بچوں کی آیا) کے ساتھ ان کے پاس آ گئی۔ منیرہ ان کے بستر میں گھس کر ان سے لپٹ گئی اور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگی۔ منیرہ عموماً دن میں تین بار اقبال کے کمرے میں جاتی تھی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے، دوپہر کو اسکول سے واپس آنے پر اور شام کو سونے سے قبل۔ لیکن اس شام وہ اُن کے پہلو سے نہ اٹھتی تھی۔ دو تین بار آپا جان نے اسے چلنے کے لیے کہا، مگر وہ نہ مانی۔ یہی کہتی رہی۔ بس تھوڑی دیر اور۔ اس پر اقبال نے مسکراتے ہوئے آپا جان سے انگریزی میں کہا، اسے اس کی حس آگاہ کر رہی ہے کہ شاید باپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔ منیرہ اور آپا جان کے اندر چلے جانے کے بعد فاطمہ بیگم، پرنسپل اسلامیہ کالج برائے خواتین گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے آ بیٹھیں اور ان سے کالج میں درسِ قرآن کے انتظامات کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔

زندگی کے آخری لمحات

رات کو آٹھ بجے چودھری محمد حسین، سیّد نذیر نیازی، سیّد سلامت اللہ شاہ، حکیم محمد حسن قرشی اور راجہ حسن اختر آ گئے۔ ان ایّام میں میاں محمد شفیع اور ڈاکٹر عبدالقیوم ملک تو جاوید منزل میں ہی مقیم تھے۔ اقبال کے بلغم میں ابھی تک خون آ رہا تھا اور اسی بنا پر چودھری محمد حسین نے ڈاکٹروں کے ایک بورڈ کی میٹنگ کا انتظام جاوید منزل میں کیا تھا۔

اس زمانے کے معروف ڈاکٹر ز کرنل امیر چند، الٰہی بخش، محمد یوسف، یار محمد، جمعیت سنگھ وغیرہ سبھی موجود تھے اور انھوں نے مل کر اقبال کا معائنہ کیا۔ گھر میں ہر کوئی ہراساں دکھائی دیتا تھا، کیونکہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اگر رات خیریت سے گزر گئی تو اگلے روز نیا طریقِ علاج شروع کیا جائے گا۔ کوٹھی کے صحن میں مختلف جگہوں پر اقبال کے اصحاب دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کھڑے باہم سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اقبال سے ڈاکٹروں کی رائے مخفی رکھی گئی، لیکن وہ بڑے تیز فہم تھے۔ احباب کا بکھرا ہوا شیرازہ اور چہرہ دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اُن کی موت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ چند یوم پیشتر جب کسی نے اُن کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا تو فرمایا: مَیں موت سے نہیں ڈرتا۔ بعدازاں اپنا یہ شعر پڑھا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چُو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

(مَیں تجھے مردِ مومن کی نشانی بتاتا ہوں کہ جب اُسے موت آتی ہے تو اس کے لب پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔)

چنانچہ اس رات وہ ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ جاوید اقبال کوئی نو بجے کے قریب گول کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے۔ پوچھا: کون ہے؟ جاوید اقبال نے جواب دیا، جاوید۔

علاّمہ ہنس پڑے اور فرمایا، جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں۔ پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چودھری محمد حسین سے مخاطب ہو کر فرمایا، چودھری صاحب! اسے ''جاوید نامہ'' کے آخر میں وہ دعا ''خطاب بہ جاوید'' ضرور پڑھوا دیجیے گا۔ اتنے میں علی بخش اندر داخل ہوا۔ اسے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہا۔ علی بخش نے بلند آواز سے رونا شروع کر دیا۔ چودھری محمد حسین نے اُسے حوصلہ رکھنے کی تلقین کی۔ فرمایا ''چودھری صاحب آخر چالیس برس کی رفاقت ہے، اسے رو لینے دیں''۔ رات گیارہ بجے اقبال کو نیند آ گئی۔ سونے سے پہلے اقبال نے دیوان علی سے کہا کہ وہ انہیں پنجابی کلام سنائیں۔ یہ گویا سفرِ آخرت کو پُر لطف بنانے کی کوشش تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے سے چند گھنٹے پہلے وہ ذہنی طور پر پوری طرح چوکس اور مستعد تھے۔ دیوان علی کو کچھ سنانے کا کہا تو اس نے پنجاب کے مشہور شاعر بلھے شاہ کی کافی گا کر سُنائی جس کا

ایک بیت ہے:

بلّھیا دل دا کی سمجھانا ادھروں پٹنا ادھر لانا

اقبال کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور آنسو اُن کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اور رقت آمیز لہجے میں کہا ''کتنی سچی بات ہے'' پھر علاّمہ نے دیوان علی سے کہا ''تم سو جاؤ البتہ علی بخش جاگتا رہے کیونکہ اب اس کے سونے کا وقت نہیں'' راجہ حسن اختر کہتے ہیں مَیں دوسری طرف تھا مجھ سے کہا ''پیٹھ کے پیچھے کیوں بیٹھے ہو، سامنے آجاؤ''مَیں اُن کے متصل ہو بیٹھا کہنے لگے قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھ کر سُناؤ کوئی حدیث یاد ہے تو وہ سناؤ؟ مَیں نے قران پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد اُن پر غنودگی سی طاری ہوگئی راجہ صاحب کہتے ہیں مَیں نے دیا گل کر دیا اور باہر تخت پر آ بیٹھا۔

چودھری محمد حسین، حکیم محمد حسن قرشی، سیّد نذیر نیازی اور سیّد سلامت اللہ شاہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ البتہ میاں محمد شفیع اور ڈاکٹر عبدالقیوم کے علاوہ راجہ حسن اختر نے اس رات جاوید منزل ہی میں قیام کیا اور باہر دالان میں چارپائی بچھا کر لیٹ گئے۔

اقبال کوئی گھنٹہ بھر کے لیے سوئے ہوں گے کہ شانوں میں شدید درد کے باعث بیدار ہو گئے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اور میاں محمد شفیع نے خواب آور دوا دینے کی کوشش کی، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ فرمایا، دوا میں افیون کے اجزا ہیں اور مَیں بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا۔ علی بخش اور میاں محمد شفیع اُن کے شانے اور کمر دبانے لگے تا کہ درد کی شدت کم ہو، لیکن تین بجے رات تک اُن کی حالت غیر ہوگئی۔ میاں محمد شفیع، حکیم محمد حسن قرشی کو بلانے اُن کے گھر گئے، مگر اُن تک رسائی نہ ہوسکی اور ناکام واپس آ گئے۔ اقبال درد سے نڈھال تھے۔ میاں محمد شفیع کو دیکھ کر فرمایا، افسوس قرشی صاحب بھی نہیں پہنچ سکے۔ تقریباً پونے پانچ بجے راجہ حسن اختر اٹھ کر اندر آئے۔ انہیں بھی حکیم محمد حسن قرشی کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ بولے۔ حکیم صاحب رات بہت دیر سے گئے تھے اور اس وقت انہیں بیدار کرنا شاید مناسب نہ ہو۔ اس پر اقبال نے یہ قطعہ پڑھا:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

(جو سرود چلا گیا پھر آتا ہے یا نہیں آتا۔ عرب کے خطہ حجاز مقدس سے پھر ٹھنڈی ہوا آتی ہے یا نہیں آتی؟ اس فقیر کا آخری وقت آ گیا ہے (زندگی ختم ہوئی) کوئی دوسرا (میرے علاوہ) راز کو

سمجھنے والا آتا ہے یا نہیں آتا۔)

راجہ حسن اختر قطعہ کا مطلب سمجھتے ہی حکیم محمد حسن قرشی کو لانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اقبال کے کہنے پر اُن کا پلنگ گول کمرے سے اُن کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ انھوں نے فروٹ سالٹ کا گلاس پیا۔ صبح کی نماز کی اذانیں ہو رہی تھیں سب کا خیال تھا کہ فکر کی رات کٹ گئی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ملک اور میاں محمد شفیع صبح کی نماز ادا کرنے کی خاطر قریب کی مسجد میں پہنچ گئے تھے اور صرف علی بخش ہی اقبال کے پاس رہ گیا تھا۔ اسی اثناء میں اچانک اقبال نے اپنے دونوں ہاتھ دل پر رکھے اور اُن کے منہ سے ''ہائے'' کا لفظ نکلا۔ علی بخش نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں شانوں سے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ فرمایا: دل میں شدید درد ہے اور قبل اس کے علی بخش کچھ کر سکے، انھوں نے ''اللہ'' کہا اُن کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اور چہرہ خود بخود قبلہ رُو ہو گیا۔

۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء (جمعرات۔ ۱۹/صفر المظفر ۱۳۵۷ھ) کو صبح کی اذانوں کی گونج میں اقبال نے اپنے دیرینہ ملازم کی گود میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور یوں وہ زبان جس نے لاکھوں دلوں کو گرمایا تھا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ملک نے فون کر کے ریڈیو سٹیشن لاہور میں علاّمہ کے انتقال کی اطلاع دی۔

علاّمہ کی تجہیز و تکفین

اقبال کی رحلت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اخباروں کے ضمیمے چھپے۔ سرکاری دفاتر، اسکول، کالج، عدالتیں، اسلامی ادارے سب بند ہو گئے اور لوگ ہجوم در ہجوم جاوید منزل کا رُخ کرنے لگے۔ ہزاروں لوگوں نے باری باری اقبال کے چہرے کی آخری زیارت کی اور گزرتے چلے گئے۔ وہ سامنے گول کمرے میں سے اُن کی خوابگاہ میں داخل ہو کر بغلی غسل خانے سے باہر نکلتے تھے۔ یہ تانتا شام تک بندھا رہا۔

چودھری محمد حسین اور اقبال کے دیگر احباب صبح ہی آ گئے اور اقبال کی تجہیز و تکفین سے متعلق مسائل پر غور کرنے لگے۔ سب سے اوّل مسلہ یہ تھا کہ تدفین کہاں ہو۔ چودھری محمد حسین کی تجویز تھی کہ انہیں شاہی مسجد کے کسی حجرہ میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ وہ اور میاں نظام الدین، میاں امیر الدین، سیّد محسن شاہ، خلیفہ شجاع الدین، خان سعادت علی خان، مولانا غلام رسول مہر

اور عبدالمجید سالک شاہی مسجد گئے اور حجروں کے معائنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسجد کے جنوب مشرقی مینار کے زیر سایہ سیڑھیوں کی بائیں جانب کے خالی قطعۂ زمین کو مدفن کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس کے لیے حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ (جس کا صدر دفتر دہلی میں تھا) کی منظوری لینا ضروری تھا۔ سو اس ضمن میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات سے رابطہ قائم کیا گیا جو اُن دنوں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے کلکتے گئے ہوئے تھے۔ سر سکندر حیات نے مُجوّزہ مقامِ تدفین سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی گراؤنڈ کی متبادل تجویز پیش کی۔ مُجوّزہ مقامِ تدفین پر یونینسٹ پارٹی کے ہندو اور سکھ وزراء بھی معترض تھے۔ البتہ مسلم وزراء نے سر سکندر حیات کی تجویز کی تائید کی۔ بعض حلقوں کی طرف سے مسجد نیلا گنبد کے سامنے خالی پلاٹ کو مدفن بنانے کی تجویز بھی پیش کی گئی، مگر اقبال کے احباب نے اِن تجاویز کو کوئی اہمیت نہ دی اور اپنے فیصلے پر اَڑے رہے۔ بعد ازاں اِن میں سے پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد نے پنجاب کے گورنر سر ہنری کریک سے ملاقات کی، جس نے دوپہر تک مجوزہ قطعۂ زمین کے لیے دہلی سے اجازت دلا دی اور اس سلسلے میں چار بجے تک تمام کاغذی کارروائی بھی مکمل کر لی گئی۔

پانچ بجے شام جاوید منزل سے جنازہ اٹھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھ دیے گئے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان کندھا دے سکیں۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں پنجاب کے ہر شعبۂ زندگی کے لوگ بلاامتیازِ مذہب و ملّت شامل تھے۔ وزرائے حکومت، حکام، اعلیٰ عدالتوں کے جج، وکلا، کالجوں کے پروفیسر، اساتذہ، طلبہ، شعرا، ادبا، مشائخ، علماء تجّار، صناع غرضیکہ عام فرزندانِ اسلام باچشمِ گریاں کلمۂ شہادت کا ورد کرتے جا رہے تھے۔ جنازے پر کئی پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں۔ پیدل اور سوار پولیس، سرخ پوش رضا کار، نیلی پوش رضا کار، خاکساروں کے جیش، کامریڈ مسلم جیش، الہلال پارٹی اور کئی جیش اپنی اپنی وردیاں پہنے جنازے کے ہمراہ تھے۔ جنازہ قلعہ گوجر سنگھ اور فلیمنگ روڈ سے ہوتا ہوا اسلامیہ کالج کی وسیع و عریض گراؤنڈ پہنچا، اتنے میں شور ہوا کہ نمازِ جنازہ بادشاہی مسجد میں پڑھی جائے گی تاکہ شہر کے لوگ بھی شریک ہوسکیں۔ لوگوں نے افراتفری میں جنازہ اٹھایا اور مجمع ریلوے روڈ کی طرف بڑھا۔ عاشق حسین بٹالوی اپنی کتاب ''چند یادیں، چند تاثرات'' میں

فرماتے ہیں کہ جسٹس دین محمد نے سخت غصے میں کہا کہ ''یہ کیا بیہودگی ہے۔ وہاں نماز دوبارہ بھی تو پڑھی جاسکتی ہے''، لیکن ہنگامے میں اُن کی کسی نے نہ سنی۔ عاشق حسین بٹالوی مزید لکھتے ہیں:

بخشی سرٹیک چند...... اقبال کی عظمت پہچاننے میں کسی مسلمان سے پیچھے نہ تھے مجھ سے کہنے لگے۔ ''تمہیں تو اقبال کو دفن کرنا بھی نہیں آتا۔ تم اس کی قدر کیا پہچانو گے''۔ بعد ازاں جب جنازہ برانڈرتھ روڈ سے دہلی دروازے سے ہوتا ہوا شاہی مسجد کے قریب پہنچا تو جنازے کے آگے شہر کے مشاہیر اور معززین بڑی تعداد میں سر جھکائے چلے آرہے تھے۔ اُن کے بعد شہر کے مشہور ہندو، سکھ اور عیسائی معززین موجود تھے اور اُن کے پیچھے جنازہ اور جنازے کے پیچھے عوام الناس کا ایک سیلِ رواں تھا جنازے میں تقریباً ۵۰۔۶۰ ہزار افراد تھے سات بجے کے بعد جنازہ شاہی مسجد پہنچا۔ آٹھ بجے شاہی مسجد کے صحن میں مولانا غلام مرشد نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ بعد ازاں میّت کو مقامِ تدفین کے قریب لایا گیا، کیونکہ اقبال کے برادرِ اکبر شیخ عطا محمد اور چند دیگر اعزہ نے ابھی سیالکوٹ سے پہنچنا تھا۔ وہ لوگ تقریباً ساڑھے نو بجے رات وہاں پہنچے اور شیخ عطا محمد نے آخری بار اقبال کے چہرے کا دیدار کیا۔ دس بجے کے قریب اس عاشقِ رسول ﷺ اور داعیِ احیائے اسلام کے جسمِ خاکی کو تابُوت میں رکھ کر سپردِ خاک کر دیا گیا۔ خواجہ عبدالمجید لکھتے ہیں ''اقبال کے جلوسِ جنازہ کی تین باتیں میرے ذہن پہ ہمیشہ نقش رہیں گی۔ ایک اُس روز شہر میں ایسی خاموشی تھی جسے بھلایا نہیں جاسکتا، دوسرے شہر کی سڑکوں پہ کوئی سواری نظر نہیں آتی تھی کیونکہ سب عوام جنازے میں شریک تھے، تیسرے یہ جلوس آغاز سے انجام تک انتہائی وقار اور امن کے ساتھ منظّم طور پر اختتام پذیر ہوا''۔

مزارِ اقبال

مزارِ اقبال کی تعمیر کے لیے اپریل ۱۹۳۸ء ہی سے چودھری محمد حسین کی زیرِ صدارت مرکزی مجلس اقبال قائم ہو گئی تھی، مگر آٹھ سال تک تعمیر کا کام شروع نہ ہو سکا اور اس مدت میں کچی قبر پر ایک پختہ تعویذ ہی اقبال کا مدفن تھا۔ بہر حال مزار کی تعمیر کا آغاز ۱۹۴۶ء کے اَواخر میں ہوا۔ اور چار سال بعد ۲۲ر فروری ۱۹۵۰ء کو اس کی تکمیل ہوئی۔

اس پر خرچ آنے والی رقم خاصانِ بارگاہِ اقبال نے فراہم کی اور عطیّات کے لیے اپیل نہ کی گئی۔ مزار کمیٹی نے پہلے ہی دن سے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ مزار کی تعمیر کے لیے عوام سے چندہ نہیں لیں گے اور نہ گورنمنٹ سے مدد کے خواستگار ہوں گے چنانچہ اسی لیے مزار کمیٹی نے

ایک بڑے تاجر کی اس پیشکش کو رد کر دیا جس میں اُس نے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ تمام مصارف برداشت کرنے کو تیار ہے لیکن اس کے نام کی تختی بھی مزار کے ساتھ نصب کی جائے۔ کمیٹی ممبران اس عمل کو علاّمہ اقبال جیسے قلندر کی آرام گاہ کے لیے توہین سمجھتے تھے۔ نقشۂ مزار حکومتِ افغانستان نے اپنے اطالوی ماہر سے بنوا کر بھیجا، جو مرکزی مجلسِ اقبال نے اس لیے نامنظور کر دیا کہ نہ صرف اندازِ تعمیر غیر اسلامی نوعیت کا تھا بلکہ اطالوی کیتھولک روایت کے مطابق تربت پر اقبال کے مجسّمے کو ہاتھ باندھے ہوئے لٹایا گیا۔ بعد ازاں حیدر آباد دکن کے ماہرِ تعمیرات نواب زین یار جنگ نے خاکہ تیار کیا، مگر اس خاکے میں نسوانی حد تک نفاست تھی اور مزار کے اندر تربت یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی منقش سنہری پنجرے میں بلبل قید کر دی گئی ہو۔

چودھری محمد حسین نے نواب زین یار جنگ کو لاہور بلوایا اور انہیں ساتھ لے کر موقع پر گئے۔ پھر شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر فرمایا: دیکھیے! نواب صاحب ایک طرف مسجد ہے جو مسلمانوں کی دینی طاقت کی مظہر ہے اور دوسری طرف قلعہ ہے جو اُن کی دنیوی قوت کا مظہر ہے۔ ان تعمیرات کے درمیان مزارِ اقبال تبھی بھلا لگے گا جب سادگی اور مضبوطی کی خصوصیات کا حامل ہو۔ نیز اقبال کی شخصیت میں بھی تو یہی خصوصیات نمایاں تھیں۔ اِس پر نواب زین یار جنگ نے موجودہ مزار کا خاکہ تیار کیا۔ تعمیر کا ٹھیکہ چودھری فتح محمد نے لیا۔ محمد سلیمان چیف انجینئر اور میاں بشیر احمد اوور سیر نے بلا معاوضہ رہنمائی اور نگرانی کی خدمات انجام دیں۔ تعمیر میں استعمال ہونے والا سنگِ سرخ اور سنگِ مرمر ریاست دھولپور (انڈیا) سے حاصل کیا گیا اور اس پتھر کو دہلی، آگرہ اور مکرانہ کے کاریگروں نے تراشا۔ مزار کے اندر کندہ قرآنی آیات اور اشعارِ اقبال چودھری محمد حسین کا انتخاب ہیں۔ آیاتِ الٰہی کی خطاطی حافظ محمد یوسف سدیدی نے کی ہے اور اشعارِ اقبال کی محمد اقبال ابن پروین رقم نے۔ لوحِ مزار پر، چبوترے اور تعویذ کے لیے سنگِ لاجورد حکومتِ افغانستان کی طرف سے ہدیہ ہے۔ لوحِ مزار کی عبارتیں افغانستان ہی سے کندہ شدہ آئی تھیں۔

خیر یہ تو ذکر تھا اس نشان کا جہاں اقبال کا جسم دفن کیا گیا، لیکن اُس کی روح کی بیتابی، بے چینی اور بے قراری آج بھی اقبال کے رازداروں کے سینوں میں شعلہ کی طرح لپکتی ہے۔ علاّمہ جیسا درویش مردِ مومن جو ایک طولانی بیماری کے بعد اس دارِ فانی سے کوچ کرتا ہے۔ اپنے بڑے

بھائی کو یقین دلاتا ہے کہ وہ موت سے نہیں ڈرتا بلکہ موت کا استقبال تبسم کے ساتھ کرے گا بچوں کے بارے میں انتہائی جامع وصیّت کرتا ہے۔ وہ اپنے کفن و دفن کے بارے میں احباب سے کچھ نہ کہے۔ شاید شاہی مسجد کا انتخاب خود دبے الفاظ میں علاّمہ اقبال کا ہو، جسے چودھری محمد حسین اور راجہ حسن اختر نے حقیقت کا رُوپ دیا۔ علاّمہ اپنی حیات میں اس مسلہ کو پیچیدہ نہیں بنانا چاہتے تھے کہ مسجد آثارِ قدیمہ کے ماتحت ہونے کی وجہ سے زندگی میں اُن لوگوں سے اجازت ضروری تھی جن کا اقبال زیر بار نہیں ہونا چاہتے تھے شاید یہی سوچ کر اقبال نے مسلہ دوستوں پہ چھوڑ دیا تھا۔ تا کہ پس از مرگ یہ مسئلہ آساں ہوجائے۔ بہرحال واللہ العالم۔

اس خواہش کا اظہار انھوں نے ''رمُو زِ بے خودی'' کی نظم '' بحضور رحمۃ للعالمین ﷺ'' میں کیا اور یہ عرض سندِ قبولیت پاتی ہے۔

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش　　　مرقدی در سایۂ دیوار بخش
تا بیا ساید دلِ بیتاب من　　　بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغازم، انجامم نگر

ترجمہ: حضور ﷺ میرے ستارے کو بیدار آنکھیں عطا فرمائیں اپنی مبارک دیوار کے سائے میں مجھے ایک قبر نواز دیں۔ تا کہ میرے بے قرار دل کو چین مل جائے اور میرا پارہ قرار پیدا کرلے پھر مَیں فخر سے آسماں سے کہوں گا دیکھ تو نے میرا آغاز دیکھا تھا اب میرا انجام دیکھ۔

اللہ نے اُن کو مسلمانوں کی دنیاوی سطوت وشوکت (شاہی قلعہ) کے سامنے اور دینی عظمت وعزت (بادشاہی مسجد) کی دیوار کے سائے میں آخری آرامگاہ نصیب فرمائی جہاں پانچ وقت اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کی کبریائی بیان ہوتی ہے۔ جمعہ، عیدین پہ لاہور کے سب سے بڑے اجتماع ہوتے ہیں اور لوگ ساتھ میں مرقدِ اقبال پہ بھی فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

ملکی وغیر ملکی مشاہیر کا خراجِ عقیدت

اقبال کو بہت سے ملکی اور غیر ملکی مشاہیر نے خراج عقیدت پیش کیا۔ ان میں چند کا حوالہ دیا جارہا ہے۔

''شعرا اقوام میں جان پیدا کرتے ہیں، ملٹن ،شیکسپیئر ، بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمت کی

ہے۔ کارلائل نے شیکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا ہے۔ اسے جب شیکسپیئر اور دولت برطانیہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا'' میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا!'' گو میرے پاس سلطنت نہیں ہے، لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا''۔ (قائداعظم)

''اقبال کی ادبی شخصیت عالمگیر ہے۔ وہ بڑے ادیب، بلند پایہ شاعر اور مفکر اعظم تھے، لیکن اس حقیقت کو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بہت بڑے سیاستدان بھی تھے۔ مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کے بہترین شارح تھے کیونکہ اس زمانے میں اقبال سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس امر کا فخر حاصل ہے کہ ان کی قیادت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا مجھے موقع مل چکا ہے۔ مَیں نے ان سے زیادہ وفادار رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا''۔ (قائداعظم)

''وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی۔ ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں میں پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں بعد پیدا ہو۔ اس کے دہن کا ہر ترانہ ''بانگ درا'' اس کی جان حزیں کی ہر آواز ''زبورِ عجم'' اس کے دل کی ہر فریاد ''پیام مشرق'' اور اس کے شعر کا ہر پر پرواز ''بال جبریل'' تھا۔ وہ موحد خالص رسول کا شیدائی، دین کامل کا علمبردار، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور تجدید ملت کا طلبگار تھا''۔ (علاّمہ سید سلیمان ندوی)

''وہ باوجود اتنا بڑا مشہور شاعر ہونے کے شاعر نہیں ہے بلکہ اپنے پیام سے مقام نبوت کی جانشینی کا حق ادا کر رہا ہے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اقبال شناس ہو جائیں!'' (مولانا عبدالماجد دریا آبادی)

''در دیدۂ معنی نگہباں حضرت اقبال
پیغمبریٔ کرد و پیمبر نتواں گفت'' (مولانا غلام قادر گرامی)

ترجمہ: دیدہ وروں کی نگاہ میں حضرت اقبال نے پیغمبری کی ہے مگر ان کو پیغمبر کہہ نہیں سکتے۔

''اقبال کی شاعری کی خاص غایت تھی۔ مولانا حالؔی کی طرح اقبال نے بھی اپنی شاعری سے قوم اور ملک کو جگانے اور رہنمائی کا کام لیا۔ یہ اس کے خیال اور فکر کی قوت اور جدت تھی، جس نے اس کے کلام اور طرز بیان میں زور اور جوش پیدا کر دیا''۔ (بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

''اقبال کا سارا کلام پڑھنے کے بعد ایک سیدھی سادی بات جو ایک عامی کو سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو پہچانے اور ان سے کام لے۔ خدا اور اس کے رسول ﷺ

سے عشق رکھے۔ اسلامی تعلیمات کی حرکی روح کو سمجھے اور اس پر عمل کرے تو وہ حقیقت میں خدا کا جانشین بن سکتا ہے اور اپنی تقدیر کا آپ مالک بن سکتا ہے"۔ (مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

"اقبال ہمارے لیے مسیحا بن کر آیا ہے اور اس نے مردوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے"۔
(شمس العلما ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری)

"ڈاکٹر اقبال اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر گئے ہیں، جس کا گھاؤ مدت مدید میں بھی مندمل نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کا رتبہ آج دنیا میں اتنا کم پایہ ہے کہ کسی حالت میں ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے، جن کے کلام نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی ہو"۔ (رابندر ناتھ ٹیگور)

"ہندوستان کے اردو دانوں کی زبان پر آج کل اقبال کا ہی چرچا ہے"۔ (قاضی نذرالاسلام)

"محمد اقبال ہمارے عہد میں اسلامی فکر اور انسانی و بین الملی اسلامی بصیرت کے مظہر ہیں"۔

"میں جب بھی اقبال کے بارے میں سوچتا ہوں، میں ان کو "علیؑ گونہ" (علیؑ نما) پاتا ہوں یعنی ایک ایسا انسان جو علیؑ کی سنت کا پیرو ہے، لیکن وہ انسان بیسویں صدی کی انسانی استعداد کے کیف وکم کا بھی مکمل نمونہ ہے"۔ (ڈاکٹر علی شریعتی، ایران)

"صرف سرزمین پاکستان کے لیے نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ آزادی، وطن پرستی اور فضلیت کے لیے کوشاں تمام مسلمانوں اور انسانوں کی خدمت کرنے والے مفکر شاعر اقبال ہیں"۔
(ڈاکٹر عبدالقادر کراحان، ترکی)

"اقبال......ایک شاعر، جس نے زمانے پر اپنا سکہ بٹھا دیا"۔ (ڈاکٹر طہٰ حسین، مصر)

"اگر جلال الدین رومی اس زمانے میں جی اٹھیں تو وہ محمد اقبال ہی ہوں گے۔ ساتویں صدی کے جلال اور چودھویں صدی کے اقبال کو ایک ہی سمجھنا چاہیے"۔ (ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، مصر)

"لاہور میں ایک شخص فوت ہوگیا ہے جو اس روئے زمین پر اپنے آپ میں روحانیت کا ایک جہان تھا۔ جو انسانیت کی از سرِ نو تنظیم چاہتا تھا اور اس کے لیے ایک نیا آئین دینا چاہتا تھا۔ ایک ایسی فکر خاموش ہوگئی ہے جس نے مشرق ومغرب کے معارف کو جمع کیا پھر جرأت رندانہ کے ساتھ ان پر ناقدانہ نظر ڈالی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا وہ عظیم دل دھڑکنا بند ہوگیا ہے جو ملت اسلامیہ کو تاریخ اسلام کے ابطال وعظماء کے مطابق ڈھالنا چاہتا تھا اور وہ مردِ آزاد آج چپ ہو گیا ہے۔ جو زمان ومکان اور ماضی وحال کی قیود سے بالکل آزاد تھا"۔ (ڈاکٹر عبدالوہاب عزام۔ مصر)

"گزشتہ پانچ سو برس میں اسلامی دنیا میں اقبال کے پایہ کا کوئی واقف اسرار دین پیدا نہیں ہوا"
(امیر شکیب ارسلان۔ شام)

''علاّمہ اقبال کا شمار بیسویں صدی کے عظیم ترین شعرا اور مفکرین میں کیا جاتا ہے۔ ان کی حیات ہی میں انھیں 'شاعر مشرق' کہا جانے لگا''۔ (نکولائی گلیبوف، روس)

''شاعری میں مابعد الطبیعیاتی صداقتوں کے معیار پر اگر آج کے اپنے شعرا کی پرکھ کی جائے تو مجھے صرف ایک ہی زندہ شاعر نظر آتا ہے جو کم عیار ثابت نہ ہوگا اور یہ بھی طے ہے کہ وہ ہمارے عقیدے اور نسل کا شاعر بھی نہیں ہے، میری مراد محمد اقبال سے ہے''۔ (سر ہربرٹ ریڈ، ۱۹۲۱ء امریکا)

''یہ بھی ہمارے شہنشاہانہ طرز حکومت کا ایک کرشمہ ہے کہ اقبال جیسا شاعر، جس کا نام گزشتہ دس برس سے اس کے ہم وطن مسلمانان ہند میں بچے بچے کی زبان پر ہے، اس کے کلام کا ترجمہ اس قدر عرصے کے بعد جا کر ہماری زبان میں ہو سکے۔ ہندوؤں میں جو مرتبہ ٹیگور کو حاصل ہے، وہی مسلمانوں میں اقبال کو ہے اور زیادہ صحیح طور پر ہے، اس لیے کہ ٹیگور کو بنگال سے باہر اس وقت تک کسی نے نہ پوچھا جب تک وہ یورپ جا کر نوبل پرائز نہ حاصل کر لائے۔ برخلاف اس کے اقبال کی شہرت یورپ کی اعانت سے بالکل مستغنیٰ ہے''۔ (ای۔ایم فاسٹر، ۱۹۲۰ء)

''اقبال کی شاعری نے نوجوان مسلمانوں میں بیداری پیدا کر دی ہے اور بعض نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جس مسیحا کا انتظار تھا وہ آ گیا ہے''۔ (اے۔ آر نکلسن، برطانیہ)

''ہندوستان میں حرکت تجدید نے اپنا ممتاز ظہور سر محمد اقبال کی شاعری میں حاصل کیا ہے''۔
(سر طامس آرنلڈ، برطانیہ)

☆☆☆

کتابیات

نمبرشمار	کتاب	مصنف	پبلشر	سن اشاعت
۱	اقبال روحِ دین کا شناسا	سیّد علی گیلانی	منشورات	طبع اول ۲۰۰۹ء
۲	اقبال کی طویل نظمیں	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور	طبع ۲۰۰۴ء
۳	اقبال اور اُن کے ہم عصر مشاہیر	ڈاکٹر محمد سلیم	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور	طبع ۲۰۰۶ء
۴	اقبال کی سیاسی زندگی	ڈاکٹر محمد سلیم	سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور	اشاعت ۲۰۰۱ء
۵	افغانستان اور اقبال	خلیل اللہ خلیل	بزمِ اقبال لاہور	طبع اکتوبر ۲۰۱۱ء
۶	اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر دُرانی	فیروز سنز لاہور	اشاعت ۱۹۹۹ء
۷	اقبال از عطیہؔ فیضی	ضیاء الدین احمد برنی	اقبال اکادمی پاکستان	اشاعت ۱۹۸۱ء
۸	اقبال کے حضور	سیّد نذیر نیازی	اقبال اکادمی پاکستان	طبع چہارم ۲۰۰۷ء
۹	اقبال ستارہ بلند شرق	علی خامنائی، سابق صدر اسلامی جمہوریہ ایران	خانۂ فرہنگِ ایران لاہور	......
۱۰	اقبال شناسی۔ عالمی تناظر میں	ڈاکٹر شفیق عجمی	پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور	طبع ۲۰۱۱ء
۱۱	اقبال کامل	مولانا عبدالسلام ندوی	الفیصل ناشران غزنی سٹریٹ لاہور	فروری ۲۰۰۸ء
۱۲	اقبال درونِ خانہ (اوّل)	خالد نظیر صوفی	اقبال اکادمی پاکستان	طبع سوم ۲۰۰۸ء
۱۳	اقبال درونِ خانہ (دوم)	خالد نظیر صوفی	اقبال اکادمی پاکستان	طبع دوم ۲۰۱۲ء
۱۴	ارمغانِ اقبال	پروفیسر رحیم بخش شاہین	اسلامک پبلیکیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ	اشاعت اوّل نومبر ۱۹۹۱ء
۱۵	اقبال اور انسان دوستی	ڈاکٹر طالب حسین سیال	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس	دوسری طباعت ۲۰۰۶ء
۱۶	اقبال کا شُعلہ نوا	نعیم صدیقی	الفیصل ناشران لاہور	ستمبر ۱۹۹۹ء
۱۷	اقبال ممدوحِ عالم	ڈاکٹر سلیم اختر	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۳ء
۱۸	اقبال، جناح اور پاکستان	ڈاکٹر صفدر محمود	سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور	۲۰۱۴ء
۱۹	اقبال اور مشاہیر کشمیر	کلیم اختر	اقبال اکادمی پاکستان	طبع اوّل ۱۹۹۷ء
۲۰	اقبال بحیثیتِ مفکرِ تعلیم	پروفیسر بختیار حسین صدیقی	اقبال اکادمی پاکستان	طبع دوم ۲۰۱۲ء

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	پبلشر	سن اشاعت
۲۱	اقبالیات کے سو سال	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	اقبال اکادمی پاکستان	طبع سوم ۲۰۱۲ء
۲۲	اقبالیاتِ سیّد نذیر نیازی	عبداللہ شاہ ہاشمی	اقبال اکادمی پاکستان	طبع اول ۱۹۹۶ء
۲۳	اقبالیات کے پوشیدہ گوشے	پروفیسر امجد علی شاکر	جمعیت پبلی کیشنز وحدت روڈ لاہور	طبع ۲۰۰۹ء
۲۴	اقبالیاتِ نوائے وقت	پروفیسر احمد سعید	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	اشاعت ۲۰۱۵ء
۲۵	اوراقِ گم گشتہ	پروفیسر رحیم بخش شاہین	اسلامک پبلیکیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ	طبع دوم مارچ ۱۹۷۹ء
۲۶	پاکستان، نفاذِ اسلام اور اقبال	مظفر حسین	آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس ملتان روڈ لاہور	نومبر ۱۹۹۳ء
۲۷	پوشیدہ تیری خاک میں..... (سفر نامہ اندُلس)	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	ادبیات رحمٰن مارکیٹ لاہور	طبع دوم ۲۰۱۱ء
۲۸	چوں مرگ آئد	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	اقبال اکادمی پاکستان	طبع اوّل ۲۰۰۷ء
۲۹	حیاتِ اقبال.....عہد بہ عہد	ڈاکٹر سیّد سلطان محمود حسین	اقبال اکادمی پاکستان	طبع اوّل ۲۰۱۵ء
۳۰	حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے	محمد حمزہ فاروقی	ادارۂ تحقیقات پاکستان دانشگاہ لاہور	طبع اوّل ۱۹۸۸ء
۳۱	حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں	محمد عبداللہ قریشی	بزمِ اقبال لاہور	طبع دوم اپریل ۲۰۰۱ء
۳۲	حرفِ شوق	مختار مسعود	مکتبۂ تعمیر انسانیت لاہور	طبع دوم ستمبر ۲۰۱۷ء
۳۳	خطباتِ اقبال (ترجمہ وتلخیص)	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	بُک کارنر جہلم	اشاعت مارچ ۲۰۱۴ء
۳۴	دانشِ اقبال کے چند پہلو	ڈاکٹر طالب حسین سیّال	نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد	طبع اوّل ۲۰۰۶ء
۳۵	دائرہ معارفِ اقبال (اوّل تا سوم)	شعبۂ اقبالیات۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	سال اشاعت ۲۰۰۶ء، ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۴ء
۳۶	ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک	بُک کارنر جہلم	اشاعت فروری ۲۰۱۶ء
۳۷	روحانی جمہوریت	مظفر حسین	آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس ملتان روڈ لاہور	باراول سال ۲۰۰۲ء
۳۸	رہ نوردِ شوق	اقبال سنگھ	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس	دوسری اشاعت ۲۰۰۶ء
۳۹	رُوزگارِ فقیر (حصہ اوّل)	فقیر سیّد وحید الدین	مکتبۂ تعمیر انسانیت لاہور	طبع ششم ۲۰۰۶ء
۴۰	رُوزِگارِ فقیر (حصہ دوم)	فقیر سیّد وحید الدین	مکتبۂ تعمیر انسانیت لاہور	
۴۱	رُوحِ اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	القمر انٹر پرائزز اُردو بازار لاہور	مارچ ۲۰۱۰ء
۴۲	زندہ رود	ڈاکٹر جاوید اقبال	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور	بار سوم ۲۰۱۲ء

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	پبلشر	سن اشاعت
۴۳	زِندہ اقبال	قیوم نظامی	جہانگیر بکس اُردو بازار لاہور	
۴۴	زمانۂ تحصیل (عطیہ فیضی)	محمد یامین عثمان	ادارہ یادگارِ غالب کراچی	طبع اول ۲۰۱۰ء
۴۵	سفر نامۂ اقبال	محمد حمزہ فاروقی	بزمِ اقبال لاہور	طبع چہارم ۲۰۱۳ء
۴۶	شرحِ کلیاتِ اقبال (فارسی)	پروفیسر حمید اللہ ہاشمی	مکتبۂ دانیال لاہور	
۴۷	علامہ اقبال کی تابندہ یادیں	ڈاکٹر ندیم شفیق ملک	نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد	جنوری ۲۰۱۵ء
۴۸	علامہ اقبال اور میرِ حجاز	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	بزمِ اقبال لاہور	طبع دوم ۲۰۱۵ء
۴۹	علامہ اقبال کا تصورِ ریاست	ڈاکٹر وحید قریشی مرتب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	بزمِ اقبال لاہور	۲۰۱۴ء
۵۰	علامہ اقبال، یہودیت اور جمہوریت	آزاد بن حیدر	اقرا سنٹر سرسیّد اردو بازار ناظم آباد کراچی	اشاعت اوّل ۲۰۱۴ء
۵۱	علامہ اقبال کے چند احباب	ڈاکٹر ندیم شفیق ملک	سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور	۲۰۱۵ء
۵۲	علامہ اقبال اور تحریکِ آزادیٔ فلسطین	فریدہ الٰہی	جاودان پبلیکیشنز اسلام آباد	مارچ ۲۰۰۷ء
۵۳	علامہ اقبال اور اُن کے احباب	محمد صدیق	بزمِ اقبال۔ لاہور	طبع اوّل اگست ۱۹۸۸ء
۵۴	علم کا مسافر	ڈاکٹر طالب حسین سیّال	ایمل مطبوعات	اشاعت اوّل
۵۵	علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء	ڈاکٹر ندیم شفیق ملک	اقبال اکادمی پاکستان	طبع اوّل ۲۰۱۳ء
۵۶	کلیاتِ اقبال (اُردو)	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال	سروسز بک کلب	۱۹۹۹ء
۵۷	گفتارِ اقبال	محمد رفیق افضل	ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان دانشگاہ پنجاب لاہور	طبع اول جنوری ۱۹۶۹ء
۵۸	مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج	پروفیسر ارشد جاوید	علم وعرفان پبلیشرز اُردو بازار لاہور	اشاعت اوّل ۲۰۱۰ء
۵۹	معاصرین اقبال کی نظر میں	محمد عبداللہ قریشی	مجلس ترقی ادب، لاہور	طبع اول نومبر ۱۹۷۷ء
۶۰	نقوشِ اقبال	مولانا ابوالحسن علی ندوی	سروسز بک کلب	۱۹۸۸ء
۶۱	نوادرِ اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر دُرانی	اقبال اکادمی پاکستان	طبع سوم

☆☆☆